مولانا عبدالماجد دریابادی
حیات و خدمات
ڈاکٹر عتیق الرحمن خان

مولانا عبدالماجد دریابادی

حیات و خدمات

ڈاکٹر عتیق الرحمن خان

یہ کتاب

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی

حکومت اتر پردیش لکھنؤ کے مالی

تعاون سے شائع ہوئی

انتساب

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
دامت برکاتہم

کے نام بصد خلوص و احترام
جن کی ذات گرامی تمام عالم اسلامی
کے لئے موجبِ خیر و برکت اور
باعثِ فخر و امتنان ہے

بار اول
تعداد ______ ۲۰۰ سو
سن اشاعت .... مئی ۹۳ء۱۹
قیمت .... ۶۰/ روپئے
کاتب ____ حامد الانصاری ناگپور
مطبوعہ ___ پبلک پرنٹرس چھتہ بازار حیدرآباد

ناشر ________ ڈاکٹر عتیق الرحمن خاں

ملنے کے پتے

(۱) _ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامع مسجد اردو بازار دہلی
(۲) مکتبہ شاداب 147-5-11 ریڈہلز حیدرآباد
(۳) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۲
(۴) ڈاکٹر ندیم الرحمن خاں
۹ اسٹارکی ٹاؤن منگل بازار ناگپور ۱

فہرست مشمولات

حرفِ آغاز

میں اسے اپنی عین خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ بفضلِ خدا میری ساخت و پرداخت اور تعلیم و تربیت ایک علمی گھرانے اور ادبی ماحول میں ہوئی۔ اور مجھے اپنے گھر پر ہی ذوقِ علم و ادب اور شوقِ مطالعہ کو پروان چڑھانے کے خوب مواقع ملے۔ مختلف ادبی رسائل و جرائد میں " صدق جدید" لکھنؤ ہمارے یہاں برسوں سے آتا رہا ہے۔ اپنے ہائی اسکول کے طالب علمی ہی کے زمانے سے اس کا باقاعدہ مطالعہ کرتا آرہا ہوں جس کی وجہ سے صاحب صدق حضرت مولانا عبدالماجد صاحب کے علمی کارناموں اور تصنیفی خدمات سے متاثر ہوتا رہا ہوں۔ اردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد خیال پیدا ہوا کہ تحقیقی کام کا سلسلہ شروع کیا جائے اور موضوعِ مقالہ جناب عبدالماجد ہی کو بنایا جائے۔ اور ایسے ہی ہوا۔

مولانا عبدالماجد جیسی عظیم المرتبت اور پہلودار۔ جامع الکمالات شخصیت پر قلم اٹھانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ مولانا موصوف ایک صاحب طرز ادیب۔ ایک منفرد طرز کے انشاء پرداز۔ ایک بے باک صحافی۔ ایک بے مثال مفسرِ قرآن۔ اور ایک صاحب نظر تنقید نگار کی حیثیت سے لاتعداد قلمی نگارشات۔ دل نشیں مقالات اور رسائل و تصنیفات چھوڑ گئے ہیں۔ ان سب کی اہمیت و افادیت اجاگر کرنا مجھ جیسے طالب علم کے لیے جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ تاہم ذوق نے رہبری کی۔ حصول مقصد کی آرزو نے تلاش و جستجو کی راہ آسان کی اور اللہ تعالیٰ نے کارسازی فرمائی۔ تب ہی ایک تحقیقی مقالہ

بعنوان "مولانا عبد الماجد دریابادی" حیات وخدمات"
سپرد قلم ہو سکا ہے۔

مولانا عبد الماجد کی شخصیت اپنے گوناگوں خصائص کی بنا پر زندگی کے مختلف مجلسوں میں لوگوں کی نظر و توجہ کا مرکز رہی ہے۔ یہ جامع جہات و جامع حیثیات شخصیت اپنے وقت کے نامور ادیب۔ صاحب طرز انشا پرداز اور بے باک صحافی کے روپ میں نمودار ہوئی۔ اور اپنے جوہر زمانہ کو دکھاتی رہی۔ درحقیقت مولانا کی تصنیفی زندگی کا آغاز ایک فلسفی اور اردو شعر و ادب کے ایک نقاد کی حیثیت سے ہوا۔ مطالعہ کے دھنی اور رسیا۔ نظر پر وسعت اور ذہانت و متانت خدا داد۔ اس زمانہ کے باکمال ارباب قلم کی صحبت و معیت۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ انشاء و تحریر کا ایک منفرد اسلوب۔ ان سب چیزوں نے مل جل کر انھیں اردو زبان کا ایک ممتاز ادیب و مصنف بنادیا۔

انھوں نے فلسفہ و نفسیات اور مذہبیات کے موضوع پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اور متعدد بلند پایہ کتابوں کا ترجمہ بھی کیا۔ تفسیر قرآن سے لے کر ان کی ادبی تحریروں تک کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ ان تمام کا جائزہ لینے کے لئے میں نے اپنے مقالہ کو دس نمایاں ابواب پر تقسیم کیا۔ اور ہر باب میں ذیلی عنوان مقرر کرکے ان کی ادبی فتوحات اور جاذب نظر و دلکش شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان کی بلند پایہ ادبی تحریروں میں ان کی زبان اسلوب اور فکر و انشاء کی معجز نمائیاں حد کمال کو پہنچ گئی ہیں۔

مولانا کی ان انشا پردازانہ حیثیت کو میں نے اپنی بساط کے مطابق اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش ایک طالب علمانہ کوشش ہے۔ کوئی ایسی منضبط کتاب ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ جس میں مولانا عبد الماجد

جیسے جید عالم اور باکمال صاحب قلم کی خدمات ادب کو یک جا جمع کر دیا گیا ہو۔
پھر بھی اس مقالہ کی تیاری کے لئے مولانا موصوف کی ادبی تحریروں، کتابوں،
صدق کے پرانے فائلوں اور صدق جدید کے تازہ شماروں کے علاوہ فروغ اردو
لکھنؤ کے عبدالماجد دریابادی نمبر سے استفادہ کر کے ایک ایسا قلمی مرقع تیار
کیا گیا ہے جس میں مولانا کی دلکش شخصیت، علمیت، ہمہ دانی اور ادبی کمالات
کے نقوش بآسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس مقالہ کو قلمبند کرنے میں میرے نگران کار ڈاکٹر خواجہ محمد حامد صاحب
محترم ڈاکٹر منشا، الرحمن خاں منشا کی شفقت آمیز اعانت، ہدایت اور رہنمائی
حاصل رہی ہے۔ جس کے لئے ان حضرات کی خدمت میں خلوص دل کے ساتھ
ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔

نوٹ :۔ مقالے میں اکثر ماخذات کے حوالے تحریروں کے ساتھ ہی دے دیئے گئے ہیں۔

عتیق الرحمن خان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالَّذِیْ جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○

(اور وہ جو سچی بات لے کر آیا اور جس نے اس کو سچ مانا وہی لوگ پرہیزگار ہیں)

※
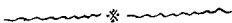
تاریخ اردو ادب میں جن معدودے چند بایۂ ناز ہستیوں کا نام نہایت عزت واحترام کے ساتھ لیا جاتا رہے گا ان ہی میں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کا بھی شمار ہوگا۔ مولانا ماجد اردو کے ان اہل قلم اور صاحب فکر دانشوروں میں سے ہیں جن کے رشحاتِ فکر اور تخلیقاتِ قلم نے ہم اہلِ اردو کے ذہنوں کو جلا بخشی ہے۔ اور جن کے علمی و ادبی شہ پاروں نے ہمارے قلب و دماغ کو روشن و تابناک کیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ آپ کی کوششوں کی بدولت اردو زبان کا علمی، ادبی، مذہبی سرمایہ بے حد وسیع ہوا ہے۔ آپ ہمارے ان بزرگ ادیبوں میں شمار کئے جاتے تھے جو تقریباً نصف صدی سے کشتِ علم و ادب کو سینچ رہے تھے۔ اور اپنے ہمہ جہتی ادبی کارناموں سے دامنِ اردو کو مختلف جواہر علم و ادب سے مالا مال فرما رہے تھے۔ مولانا موصوف کی بلند و بالا شخصیت، پہلو دار زندگی اور جامع الصفات علمی کردار کا احاطہ کرنا آسان نہیں۔ تاہم حسب ذیل طریقہ پر ایک سوانح حیات اور علمی و ادبی خدمات کا جائزہ مختلف ابواب کے تحت لینا مقصود ہے۔

وطن۔ خاندانی حالات۔ ولادت۔ تعلیم و تربیت اور علمی مشاغل

وطن لکھنؤ سے پورب جانب اودھ کے قدیم دارالحکومت فیض آباد
کے راستہ میں ایک اسٹیشن "دریا باد" آتا ہے۔ یہی دریاباد آپ
کا مولد و وطن ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جسے آج سے تقریباً ½۵ سو سال
قبل دریا خان نامی حاکم جون پور نے اپنے نام پر آباد کرایا تھا۔ اور اسی حاکم نے
مولانا ماجدؒ کے خاندان کے مورثِ اعلیٰ **شاہ مخدوم محمد** آبکش کو ایک متصل
قصبہ محمود آباد سے یہاں بلوایا تھا۔ اس قصبہ کے ایک قدوائی خاندان میں
۱۶ مارچ ۱۸۹۲ء کو مولانا ماجد کی پیدائش ہوئی۔ یہ قدوائی خاندان اپنے دور میں
بہت مشہور و معزز خاندان تھا۔ مولانا کے گھرانے کے ایک بزرگ قاضی معزالدین
تھے جنھیں لوگ ازراہ احترام **قُدْوَۃُ العِلمِ وَالدِّین** کہتے تھے۔ قاضی قدوہ
اس کا مخفف ہے۔ مشہور ہے کہ آپ سلطان محمود غزنوی کے ہم عصر تھے۔ ہندوستان
آئے اور اجودھیا ضلع فیض آباد میں مقیم ہو گئے۔ ان کی اولاد تمام اطراف و اکناف
میں پھیل گئی۔ ان کے خاندان کے لوگ آج بھی مختلف آبادیوں میں موجود ہیں۔

خاندانی نسب ناموں کے مطابق آپ حضرت ہارون کی نسل سے تھے۔ مولانا
موصوف کا تعلق اعلیٰ و افضل خاندان سے ہے۔ ان کے دادا چار بھائی تھے۔ بڑے
کا نام مولوی حکیم نور کریم۔ منجھلے کا نام مفتی مظہر کریم۔ حکیم نور کریم آپ کے حقیقی نانا بھی
تھے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گذرا۔ یہ صرف مشہور طبیب ہی تھے۔ بلکہ طبیب
گر بھی تھے بحیثیت طبیب حاذق آپ نے بڑی شہرت پائی۔ عمر عزیز کے آخری حصہ
میں علاج معالجہ اور مطب کے جملہ مشاغل ترک کر دیئے۔ اور صرف مدرسی کا
مشغلہ جاری رکھا۔ خطاط و خوشنویس بھی اعلیٰ درجہ کے تھے۔

تاریخ۔ حدیث۔ و تفسیر۔ لغت وغیرہ اور ہر علم و فن کی کتابیں اپنے ہاتھ سے
نقل کر ڈالیں۔ تالیف و ترجمہ سے بھی ذوق رکھتے تھے۔ ان کی دو کتابیں **شفاءُ
الأمراض**۔ اور ترجمہ **مخزنُ الأدویہ** بے حد مقبول ہوئیں۔
۱۸۷۰ء میں واصل بحق ہوئے۔ غرضیکہ مولانا محترم کے دادا اپنے وقت کے ایک

جیّد عالم تھے۔ تحصیل علم فرنگی محل (لکھنؤ) میں مولوی عبدُالحکیم صاحب سے کی۔ غدر کے ہنگامہ کے وقت شاہ جہاں پور میں کلکٹر کے سررشتہ دار کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے تھے۔ بغاوت ہند کے سلسلہ میں ان پر بھی الزام لگایا گیا کہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے والے حضرات ان کے گھر جمع ہوتے ہیں۔ اور بغاوت کے منصوبے بناتے ہیں۔ اور یہ باغیوں کو مذہب کا واسطہ دے کر اُکساتے ہیں۔ ہنگامۂ غدر کے خاتمہ کے بعد مقدمہ چلا۔ اور انھیں سزا کے طور پر نو سال کے لئے کالے پانی انڈمان بھیج دیا گیا۔ یہاں ہندوستان کے دیگر نامی گرامی علماء مثلاً مولوی فضل حق اور مولوی قاضی عنایت احمد وغیرہ ان کے ساتھ تھے۔ یہاں تحریری یا لکھنے پڑھنے کا کوئی عہدہ انھیں مل گیا تھا۔ وہیں رہ کر انھوں نے جغرافیہ کی مشہور کتاب مراصد الاطلاع کا اردو میں ترجمہ بھی کر لیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں موجود ہے۔ اچھے برتاؤ اور خوش اطواری کی بنا پر آپ کو سزا میں چھوٹ مل گئی۔ اور آپ پونے سات سال بعد ۱۸۶۴ء میں وطن واپس آگئے۔ بقیہ عمر فتویٰ نویسی وغیرہ میں مشغول رہے۔ ۱۸۸۳ء میں وفات پائی۔ ان کی پانچ لڑکیاں اور دو فرزند تھے۔ سب سے چھوٹے فرزند عبدالقادر تھے۔ یہی مولانا عبدالماجد کے والد محترم تھے۔ ان کا نکاح چچازاد بی بی نصیر النساء سے ہوا تھا۔ جس سے تین اولاد ہوئیں۔ مولانا سے ایک بڑے بھائی اور ایک بہن۔ بھائی کا نام عبدالمجید تھا۔ جو عمر میں مولانا سے آٹھ برس بڑے تھے۔ بچپن ہی سے مریض تھے۔ باضابطہ تعلیم صرف انٹرمیڈیٹ تک پائی۔ اور پھر کتب بینی کے ذریعہ اپنی معلومات اور استعداد علم بڑھائی۔ فارسی اور اردو کے کئی اشعار کے حافظ تھے۔ مولانا شبلی اور مولوی ظفر علی خاں کا کلام بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اور حفظ کر لیتے تھے۔ آپ نے نائب تحصیلداری سے ملازمت شروع کی اور ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر پنشن پائی۔

والد ماجد

آپ کا اسم گرامی عبدالقادر تھا۔ ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ زمانے کے رسم و رواج کے مطابق عربی و فارسی کی اچھی خاصی تعلیم حاصل کی۔ فرنگی محل ہی میں زیادہ تر حصول تعلیم جاری رکھا۔ یہاں مولوی محمد نعیم

فرنگی محلی جیسے قابل استاد سے استفادہ کا موقع ملا ۔ استاد محترم سے کسب فیض کیا۔ اوران سے شاگردانہ عقیدت آخر عمر تک قائم رکھی ۔ بڑی عمر کو پہنچے پر انگریزی میں بھی استعداد پیدا کرلی ۔ اسکول کی مدرسی سے ملازمت شروع کی ۔ کسی انگریز حاکم کو پڑھایا اس نے خوش ہو کر عدالت میں سررشتہ دار بنادیا ۔ اس سے ترقی کر کے تحصیلدار اور پھر ڈپٹی کلکٹر ہوگئے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ڈپٹی کلکٹر ہونا ملازمت کی معراج سمجھا جاتا تھا ۔

اپنی ملازمت کے فرائض ریٹائر ہونے تک بحسن وخوبی انجام دیئے ۔ سیتاپور میں مدّت ملازمت ختم کر کے پنشن پائی ۔ آپ بڑے با اخلاق ، پابند صوم وصلوٰۃ نیک دل اور نرم خو بزرگ تھے ۔ علمی صحبتوں کے بڑے شائق تھے کتابوں کے علاوہ اخبار بھی بڑے شوق سے پڑھتے تھے ۔ پنشن پانے کے بعد لکھنے لکھانے کا مشغلہ شروع کیا ۔ لکھنؤ کے مشہور اردو روزنامہ "اودھ اخبار" کے لئے مضامین لکھتے تھے ۔ ۱۹۱۲ء میں اپنی اہلیہ اور ایک لڑکی کو لے کر سفر حج بیتُ اللہ کو روانہ ہوگئے ۔ حج کے اہم فرض ادا کرنے کے بعد ۱۱ ریا ۱۲ ر ذی الحجہ کو ہیضہ میں مبتلا ہوئے ۔ اور ۱۳ ر ۱۴ ر کو عین فجر کی نماز کے وقت داعیِ اَجَل کو لبیک کہتے ہوئے اپنے معبود ومالک حقیقی سے جاملے ۔

حضرت اکبر الٰہ آبادی نے قطعۂ تاریخ وفات کہا جس کا آخری شعر ہے ۔

اس قدر مصروف ذکر و شغل تھے ۔ شغل ہی سے نکلی تاریخ وفات
۱۳۳۰ھ

والدہ ماجدہ نصیر النساء نام تھا ۔ مذہبی خیالات رکھنے والی خاتون تھیں ۔ قرآن مجید ناظرہ پڑھا تھا ۔ نماز کی پابند تھیں یہاں تک کہ تہجد گذار تھیں ۔ تلاوت کسی حال میں بھی ناغہ نہیں کرتی تھیں ۔ ۸۳ برس کی عمر پاکر ۱۹۴۱ء میں وفات پائی ۔

تعلیم و تربیت مولانا موصوف نے ایک برگزیدہ علمی و مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ اس گھرانے کی مذہبی فضا میں ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اور پھر دستور زمانہ کے مطابق مکتب سے مدرسہ تک کی منزلیں طے فرمائیں۔ گھر ہی پر قرآن مجید ناظرہ پڑھا۔ اور یہیں فارسی کی گلستاں و بوستاں والی وہ تعلیم حاصل کی جو ہر شریف مسلم گھرانے میں بچوں کو دی جاتی تھی۔ اور جس کے توسط سے ابتدائی عمر میں اخلاق و کردار کو سنوارنے اور شریفانہ طور پر زندگی بسر کرنے کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ پھر اردو تعلیم بھی مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی ریڈروں کے ذریعہ حاصل کی۔ یہ ریڈریں اپنے دور میں نہایت مفید و دلچسپ کتابیں سمجھی جاتی تھیں۔ کمسنی کے زمانے میں گلستاں بوستاں ختم کرنے کے بعد سکندر نامہ اور حضرت امام غزالی کی مشہور و معروف فارسی کتاب "کیمیائے سعادت" کو ختم کرلی۔ اس زمانے میں ملا جامی کی "یوسف زلیخا" سے بھی واسطہ پڑا۔

عربی زبان کی ابتدائی تعلیم حاصل کرکے اس میں شُد بُد پاتے ہی مدرسے میں داخل ہوگئے۔ اور وہاں عربی بطور مضمون لے لی۔ تقریباً ۱۲ سال کی عمر میں سیتاپور کے ہائی اسکول میں بغرض تعلیم داخلہ پایا۔ یہاں خوش قسمتی سے لکھنؤ کے قابل ذی استعداد ذی علم استادوں کی صحبت نصیب ہوئی ان میں حکیم محمد ذکی مرحوم اور مولوی عظمت اللہ خصوصی طور سے آپ پر مہربان رہے۔ عربی زبان میں مہارت انھیں کے فیضان علم کا نتیجہ ہے۔

ذہانت کے ساتھ ساتھ شوق علم و تربیت قدرتی طور پر ودیعت ہوئے تھے۔ اس لئے مدرسے کے تمام درجوں میں بڑی آسانی کے ساتھ نمایاں کامیابیاں حاصل کیں اور ۱۹۰۷ء میں دسویں جماعت میں داخل ہوگئے۔ حساب الجبرا اور جامیٹری میں کمزور تھے مگر اسکول کے ہیڈ ماسٹر بابو گھمنڈی لال کی دانشمندی اور استادانہ شفقت کی بنا پر ان مضامین میں بھی اطمینان بخش کامیابی حاصل کی۔ اور دسویں جماعت کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرکے اسکول کی تعلیم ختم کی۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے

کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے ۔ انٹرمیڈیٹ کی سطح پر انگریزی عربی ہسٹری، فلسفہ اور
سیکولوجی مضامین لئے ۔ سائکولوجی اور انگریزی مضمون نگاری میں نام پیدا کیا اور ۱۹۱۲ء
میں بی ۔ اے سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوئے ۔ کھیل کود سے گریز کرتے تھے ۔ کھیل کے
میدان میں وہ کبھی نہیں پائے گئے ۔ ابتدائی اسکول کی زندگی میں تھوڑا بہت کرکٹ اور
ٹینس کا شوق تھا مگر کالج میں آتے آتے پڑھنے کی ایسی لت پڑ گئی کہ شام کے کھیل کا وقت
بھی پڑھائی کی نذر ہو جاتا تھا ۔

فلسفہ میں ایم ۔ اے کرنا چاہا مگر اس کی تعلیم کا انتظام لکھنؤ میں نہ تھا ۔
لہٰذا علی گڑھ پہنچے ۔ وہاں زیادہ جی نہ لگا ۔ علی گڑھ اس وقت تک محض کالج تھا
وسیع پیمانے پر یونیورسٹی نہ بنا تھا ۔ ایم ۔ اے کا امتحان دینے ۱۹۱۳ء میں الہ آباد
جانا پڑا ۔ وہاں مولانا شبلی کے بھائی نامور ایڈوکیٹ جنید صاحب کے یہاں مقیم
رہے ۔ مگر کورس کی پوری کتابیں مہیا نہ ہونے کے باعث تیاری مکمل نہ ہو سکی تھی
اس لئے امتحان ایم ۔ اے میں ناکام رہے ۔ پھر ۱۹۱۴ء میں ایم ۔ اے کرنے کے لئے
دہلی گئے ۔ اس غرض سے سینٹ اسٹیفن کالج میں داخل ہو گئے ۔ مگر تعلیم مکمل
نہ کر سکے ۔ گھریلو حالات اور مالی پریشانیوں کے بعد ایم ۔ اے کی تعلیم ادھوری چھوڑ
کر لکھنؤ واپس آگئے ۔

تلاش روزگار

۱۹۱۲ء میں والد ماجد انتقال فرما چکے تھے ۔ تھوڑا
بہت روپیہ جس بنک میں جمع تھا وہ ٹوٹ چکا تھا ۔
تلاش معاش کی فکر دامن گیر ہوئی ۔ اس دوران انگریزی میں مضامین اور فلسفہ
پر مقالے لکھ کر ایم ۔ اے کی ڈگری کی تلافی کرنی چاہی ۔ تلاش روزگار
کے سلسلہ میں فلسفہ کے لکچرار کی حیثیت سے کیننگ کالج میں تقرر کے لئے کوشش
کی ۔ ڈاکٹر کیمرن سے امید لگائے بیٹھے تھے ۔ مگر تقرر کسی اور صاحب کا ہو گیا ۔
بعد ازاں ریلوے اور ڈاک خانہ میں ملازمتیں ڈھونڈیں ۔ راجہ صاحب
محمود آباد سے سفارش بھی کیں ۔ لیکن یہاں بھی قسمت نے یاوری نہ کی ۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد آمدنی کا اصل ذریعہ بند ہی ہو چکا تھا۔ بڑے بھائی صاحب کی نائب تحصیل داری کی تنخواہ گھر چلانے کے لئے ناکافی تھی لہٰذا مضامین لکھ کر اور ترجمہ کا کام کر کے روپئے حاصل کرتے رہے اور خرچ چلاتے رہے انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مولوی عبدالحق نے از راہ کرم فرمائی انگریزی کتابوں کے ترجمہ کا کام معقول اجرت پر دیا۔ اور علامہ شبلی نے بھی سیرۃ النبی کے انگریزی ماخذوں کی تلاش کا جو کام سونپا اور گھنٹہ دو گھنٹہ کام کرنے کے ۵۰ روپئے ماہوار دیتے رہے۔

شادی اور اولادیں ایک پیکر عفت دنیا بنام عفت النساء کے ساتھ جون ۱۹۱۶ء میں شادی ہوئی

اس شادی کی داستان اور اس کے نتیجہ میں پیدا شدہ اولادوں کا مولانا ہی کی زبانی پیش کیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ فرماتے ہیں

شادی ہمارے ماں باپ کی پسند اور مرضی سے ہوا کرتی ہے۔ اور اکثر خاندان ہی کی کوئی لڑکی اپنے عزیز سے منسوب ہو جاتی ہے۔ اپنی نسبت بھی اس طریقہ سے بچپن ہی میں طے شدہ سمجھ لی گئی تھی۔ کسی نے مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ جب میں کالج میں پڑھنے لگا تو خیالات میں انگریزیت کے ساتھ اس باب خاص میں بھی "صاحبیت" نے زور کیا۔ لڑکی میں اور کوئی برائی نہ تھی۔ صورت شکل میں اوروں سے بہتر تھی۔ لیکن رہتی دیہات میں تھی شہر کی آب و ہوا سے ناآشنا اور اپنے نزدیک سو عیبوں کا ایک عیب یہی تھا۔ جب بی۔ اے کر چکا۔ اور والد ماجد کچھ دن بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ تو والدہ ماجدہ کے کانوں تک یہ خبر اپنی نارضامندی کی پہنچا دی۔ وہ بے چاری حق دق رہ گئیں کہ لڑکی والوں کو اب کیا منہ دکھاؤں گی۔ لیکن قدرت کا انتظام دیکھئے کہ عین اس زمانے میں ایک دوسری عزیز لڑکی نظر کے سامنے آ گئی۔ میری حقیقی خالہ کی پوتی تھی۔ عمر میں مجھ سے دو چار ہی سال چھوٹی تھی۔

رنگ رُوپ میں اچھی نکھری اور بڑی بات یہ کہ قیام لکھنؤ میں زیادہ تر رہتا تھا۔
باضابطہ تعلیم تو کچھ ایسی ہی رہی ۔ البتہ معاشرت بالکل شہری لکھنوی ۔ قصباتی آداب سے خوب
واقفیت ۔ وضع لباس ۔ چال ڈھال سب شہریوں کی سی ۔ بس یہ لڑکی دل میں کھپ گئی۔
بہن بھاوج ۔ والدہ سب ڈر رہی تھیں کہ خدا معلوم کس کرسٹان عورت کو گھر میں لے آؤں
اس انتخاب کی خبر سن کر سب باغ باغ ہوگئیں ۔ باقاعدہ پیام کا خط ادھر سے گیا ۔ اور
حسب دستور پردہ ہوگیا ۔ اتفاقات عجب عجب پیش آتے رہے ۔ کبھی کسی عزیز قریب کا
انتقال ۔ کبھی کچھ اور ۔ دن ٹلتے رہے اور فراق کی مدت کاٹنا مشکل ہوگئی ۔ اشتیاق بڑھتا
گیا ۔ اور محبت بڑھ کر عاشقی کے دور تک پہنچ گئی ۔ بالآخر شروع جون ۱۹۱۶ء میں خاصی
دھوم دھام سے لکھنؤ میں ہوگیا ۔ مکان ان کا باندے میں تھا ۔ جائداد وہیں تھی ۔
والد شیخ یوسف الزماں آنریری مجسٹریٹ اور رئیس تھے ۔ بیوی جو آئیں تو خوب مقبول
ہوئیں ۔ خاصی خوشحال تھیں مگر میرے ہاں عین اس زمانے میں تنگی ۔ اور ان بے چاری
نے بڑے صبر و شکر کے ساتھ قناعت کی زندگی اختیار کرلی ۔ اپنے برتاؤ سے سب کو خوش رکھا
خود مجھ سے البتہ کبھی کبھی جنگ ہوجاتی ۔ زیادہ تر مالی معاملات میں بحیثیت مجموعی زندگی
بڑے سکھ کی تھی ۔ درمیان میں ایک حاجت مند بیوہ سے میں نے عقد ثانی بھی کرلیا تھا ۔
اکتوبر ؁ء میں ۔ لیکن نباہ ان سے عرصہ تک نہ ہوسکا ۔ ہر فریق کو کوفت ہی کوفت
رہی ۔ مجبوراً جون ۳۱ء نرم الفاظ میں طلاق نامہ بھیج کر باقاعدہ علٰحدگی اختیار
کرلینی پڑی ۔ گو تھوڑی بہت خدمت کی توفیق اس کے بعد بھی ان کی زندگی بھر ہوتی رہی
اگر اس باب میں کوئی زیادتی یا ستم رانی میری طرف سے ہوئی ہو تو اللہ معاف فرمائے ۔

اولادیں اولادیں ہوئیں تو متعدد ۔ زندہ چار ہیں ۔ چاروں لڑکیاں
گھر ہی پر ان کو کچھ تعلیم دے دلاکر چاروں مناسب سن والے
بھتیجوں سے شادیاں نہایت خاموشی سے کردیں ۔ جون ۱۶ء سے دسمبر ۶۸ء تک
کا زمانہ بڑی ازدواجی مسرت اور کامیابی کا گزرا ۔ (جس حد تک مسرت اس عالم ناسوت
میں ممکن ہے) صحت بے چاری کی خاصی خراب رہا کی ۔ بلڈ پریشر ۔ وجع مفاصل ۔ متعدد

امراض کی شکار پھر بھی میرے لطف و مسرّت میں کوئی فرق نہیں۔ اور طویل مدّت مفارقت کو تو میں نے جانا ہی نہیں۔ اور حق رفاقت جس طرح انھوں نے ادا کی کم ہی کسی کو اس کا موقع ملتا ہے دسمبر ۶۸ء میں بھتیجے انوار الزماں ایڈوکیٹ باندرے کی لڑکیوں کی شادی باندرے میں تھی۔ بڑے شوق سے بلائی گئیں۔ اور بڑے شوق سے گئیں۔ عین وقت پر میں بھی شرکت کے لئے گیا۔ تین دن کے بعد واپس آگیا۔ خیال یہ تھا کہ ہفتہ عشرہ کے بعد یہ بھی واپس آجائیں گی۔ یکم جنوری کو دریاباد پہنچ گیا۔ میں بیٹھا قرآن مجید ہی کا کام کر رہا تھا کہ بے سان و گمان ایک موٹر دروازہ پر آکر رکی اور میرا دل دھک سے ہوگیا۔ معاً آواز علیم سلمہٗ کی آئی اور دل میں بجلی سی کوند گئی کہ کوئی شدید واقعہ پیش آگیا۔ اور یہ مجھے بلانے کو آئے ہیں۔ کرے میں داخل ہوئے اور روتے ہوئے بولے کہ جو کچھ میں کہنے آیا ہوں وہ کس زبان سے کہوں۔ میں نے دو سیکنڈ کے تامل کے بعد جواب دیا اَلْحَمْدُ لِلّٰہ اللہ نے اپنی امانت واپس لے لی۔ اور بہترین وقت واپس لے لی۔ پھر انھوں نے رو رو کر تفصیل بیان کی کہ رات کو ۱۲ بجے مرحومہ کو قلب کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹر اشرف (سگے بھتیجے) موجود ہی تھے انھوں نے گولیاں دیں کچھ اثر نہ ہوا۔ دوڑ کر انجکشن لائے، اتنی دیر میں دو مرتبہ کلمۂ شہادت پڑھ کر یہ رخصت ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ دوا کا وقت گذر چکا تھا۔

باندرے سے یہ اطلاع ٹرنک کال پر ۸ بجے صبح لکھنؤ ہوئی۔ موٹر آپ کے لئے لایا ہوں۔ گرتا پڑتا لکھنؤ میں پہنچا۔ مولانا علی میاں ندوی، مولانا محمد ادریس ندوی اور مولوی ہاشم علی فرنگی محلی گھر پر تعزیت کو موجود تھے۔ سہ پہر لاری میں خاندان بھر کو ساتھ لے کر ۸ بجے شب کو باندرے پہنچا اور گھر میں قدم رکھ کر وہ منظر دیکھا کہ اب کیا بیان ہو۔ گذری جو کچھ گذرنا تھی۔ آہ ..... وہ کفن پوشی کی جامہ زیبی جنازہ قبرستان لے جایا گیا نماز بھی آخری پڑھائی۔ قبر میں اتار کر قبر بند کی۔ اور مٹی ڈال دی۔ کون جان سکتا ہے کہ جس کو عمر بھر یہاں تک کہ ضعیفی میں بھی محبوبہ بنا کر رکھا اس کے لئے یہ سب کچھ کرنا بھی اپنی قسمت میں تھا۔ نام کی عفت النساء ایک پیکر عفت تھی۔ مرحومہ کی وفات کے وقت سے قلب میں ایک خلاء پیدا

ہوگیا ہے۔ اور ہنسی جسے کہتے ہیں وہ ، مہینے ہوچکے ہیں کہ آج تک نہیں آئی۔

شخصیت۔ اخلاق و کردار

مولانا ماجد طالب علمی کے زمانے ہی سے ایک دل پذیر شخصیت کے حامل تھے وہ شروع سے بہت اچھے اور محنتی طالب علم تھے۔ انھیں قدرتی طور پر علم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ اور اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی سخت لگن تھی۔ وہ ہمیشہ بے چین اس امر کے لئے رہتے تھے کہ بہتر سے بہترین تعلیم حاصل کرسکیں۔ ان کی طبیعت و فطرت کا یہ بے مثل خاصہ تھا کہ وہ جس علم کی طرف توجہ کرتے تھے اس کو از ابتدا تا انتہا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انھیں کتب بینی کا بے حد شوق تھا۔ اور تفتیش، کھوج اور جستجو کا فطری ذوق رکھتے تھے۔ تصنیف، تالیف اور مضمون نگاری کی خداداد صلاحیتیں انھیں ودیعت ہوئی تھیں۔ وہ کالج کی تعلیم کے زمانے میں کالج کے ممتاز طلباء میں شمار کئے جاتے تھے۔ نہایت خوشنما باوقار اور سنجیدہ شخصیت کے حامل تھے۔ جسم بہت سڈول، صحت مند اور دلفریب تھا۔ خوش پوشاک بھی تھے۔ اچھے قسم کا ہندوستانی اور انگریزی لباس پہنتے تھے۔

ع یہ قصہ ہے تب کا جب آتش جواں تھا

اپنی بسم اللہ خوانی کا جو واقعہ انھوں نے خود تحریر کیا ہے۔ اس میں بچپن ہی سے ان کی مستقل مزاجی اور اصول کشی کا پتہ بآسانی چل جاتا ہے۔

یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب مسٹر ماجد انگریزی خیالات اور جذبات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لیکن جب کایا پلٹ ہوئی۔ اور مسٹر ماجد سے مولانا ماجد بنے۔ تو لباس کے ساتھ رہن سہن کے طور طریقوں میں بھی نمایاں تبدیلی ہوگئی۔ اب موٹے کھدر کے ڈھیلے ڈھالے لباس زیب تن فرماتے ہیں۔ لباس کے متعلق نمایاں بے رخی یا تبدیلی ان کی علمی اور دینی مصروفیات کی وجہ سے پیدا ہوئی۔

تعلیمی سلسلہ میں ان کا ابتدائی رجحان بالخصوص مغربی فلسفہ کی طرف تھا۔ اس گورکھ دھندے میں اس بری طرح پھنسے ہوئے تھے۔ کہ لوگوں کو ان پر بے دینی کا شبہ ہونے لگا تھا۔ اللہ نے بڑا فضل کیا کہ رفتہ رفتہ ان کی دلچسپی اسلامی اور دینی تعلیمات کی طرف ہوگئی یعنی وہ صحیح معنوں میں رجوع باسلام ہوگئے۔ وہ اپنی زندگی کے ہر دور میں اپنے خیالات و جذبات کا نہایت جرأتمندانہ اظہار کرتے رہے ہیں۔ آپ دینوی و دُنیوی دونوں علوم کے ماہر تھے۔ اور ان سے غیر معمولی خدمت اسلام میں منہمک اور مصروف بھی رہے۔ آپ ہی وہ تنہا شخص تھے جنھیں اکابرین اسلام عزت و عظمت دیتے تھے۔ ان کا اللہ تعالیٰ پر بھروسہ۔ توکل، اور نڈرپن اپنی مثال آپ ہے۔ آپ صحابۂ کرام کے جیتے جاگتے نمونے تھے۔

۱۹۱۶ء میں شادی کے بعد قدرتاً خرچ کا بار زیادہ بڑھ گیا تھا۔ ان سے زیادہ ان کے عقیدتمند دوستوں کو فکر لاحق ہوئی۔ کہ کسی طرح آمدنی کی صورت پیدا کی جائے چنانچہ علی گڑھ کے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے ازراہ قدر افزائی کانفرنس میں بطور لٹریری اسسٹنٹ کے بلالیا۔ تنخواہ پورے دوسو روپیہ ماہوار، رہائش کے لئے مکان بلا کرایہ۔ تنخواہ اس زمانہ کے معیار سے بہت مناسب تھی۔ یہ خود حاجتمند بھی تھے۔ رجوع ہوگئے۔ صاحبزادہ صاحب بڑی شفقت وعنایت سے پیش آئے۔ اور ان کے لئے ہر طرح آرام وآسائش کا خیال رکھا۔ مگر محض آزادانہ طبیعت کی بنا پر یہ ملازمت زیادہ عرصہ تک گوارہ نہ کی۔ دو ہی مہینہ بعد خرابیٔ صحت کا بہانہ کرکے وہاں سے استعفیٰ دیدیا۔ طبیعت ہر قسم کی قید وبند کو بار سمجھ رہی تھی۔ اس لئے مستقل پایہ دار قسم کی ملازمت کے لئے کبھی بھی تیار نہ ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی داغ بیل پڑی۔ اس کے لئے اردو میں کتابوں کے بندوبست کے لئے محکمۂ تالیف وترجمہ قائم ہوا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اس کے ناظم تھے۔ مولانا کی علم دانی اور فارسی میں مہارت کے دل سے قائل تھے۔ اس لئے بحیثیت مترجم فلسفہ ان کا تقرر کردیا۔ تنخواہ کا آغاز تین سو سے ہوا جو اس زمانے کے اعتبار سے بہت کافی تھی۔ مگر وہاں بھی صرف گیارہ مہینے ملازمت کی۔

طبیعت کی بے قیدی یہاں بھی رنگ لائی ۔ ملحدانہ خیالات کی بنا پر اہلِ دکن شدید بدظن و برہم ہوئے ۔
آپ کے مذہب بیزاری والے رویہ پر سخت نکتہ چینیاں ہونے لگیں ۔ آخر قیام حیدرآباد سے بھی
جی اکتا گیا ۔ یکم ستمبر ۱۹۱۷ء کو یہاں پہنچے تھے ۔ ۱۸ جولائی ۱۹۱۸ء تک بڑی مشکل سے نباہ کی ۔ پھر
طویل چھٹی لے کر لکھنؤ چلے آئے ۔ اور یہاں سے استعفاء روانہ کر دیا ۔ روزگار کی کوئی صورت
نہ تھی ۔ آٹھ دس مہینے بیکاری میں گزارے ۔ آخر ایک عرضداشت سرامین جنگ چیف سکریٹری پیشگاہ
مبارک کی خدمت میں روانہ کی کئی ہفتہ بعد ان کا تار آیا کہ نظام دکن کی خدمت میں پیش ہونے کے
لئے پوری تیاری کے ساتھ حاضر ہو جائیں ۔ لہٰذا پھر حیدرآباد پہنچے ۔ اب کی دفعہ سرکاری مہمان
کی حیثیت سے نواب صدر یار جنگ صدر الصدور امور مذہبی کے یہاں ٹھہرائے گئے ۔ پیشی ہوئی ۔
اور تقریباً ۲۵ منٹ تک باریابی رہی ۔ حضور نظام والیٔ دکن نے ۱۲۵ روپیہ ماہوار
کی پنشن تاحیات منظور کی ۔ اور اس کے عوض کام صرف یہ تھا کہ مولانا شبلی کی طرح جتنی کتابیں
تصنیف کی جائیں ان کو سلسلۂ آصفیہ سے منسوب کر دیا جائے ۔

اعلیٰ حضرت حضور نظام سے باریابی کی تفصیلات اور پنشن پانے کے حالات
مولانا موصوف نے اپنے مسودۂ کتاب "معاصرین" میں خود اس طرح بیان فرمایا ہے ۔

" جب سے انگلیوں نے قلم پکڑنا سیکھا ۔ کہنا چاہیئے کہ تبھی سے شبلی و حالی کی عظمت
دل میں جاگزیں ہو گئی ۔ اور ان پر رشک سا آنے لگا کہ کیسے خوش نصیب ہیں یہ لوگ کہ
حیدرآباد سے ماہانہ وظیفہ پا کر تصنیف و تالیف کے کام میں لگے رہتے ہیں ۔ اور بھی جا
بجا نہ حکمرانوں سے پنشن ملتی رہی اس کتاب کی طبع و اشاعت کا انتظام نظام حیدرآباد نے
کرا دیا ۔ حیدرآباد کوئی چھوٹی سی ریاست نہ تھی ۔ ایک پورا اور مستقل ملک تھا ۔ ڈاک خانہ
اور تار گھر اپنا ریل اپنی ۔ نوٹ اور سکے اپنے اور فرمانروا بھی دیکھتے دیکھتے مہربان جس سے
ترقی کر کے ہو گئے ۔ اردو ترجمہ اعلیٰ حضرت بھی بدستور رہا اور ہم لوگوں کی زبان
پر بھی یہی چڑھا ہوا ۔ ملی زندگی میں بھی حیدرآباد کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی ۔ سر سالار جنگ ـــ
اقبال الدولہ ۔ سر آسمان جاہ ۔ مہاراجہ چندو لال ۔ مہاراجہ کشن پرشاد ۔ رائے مرلی دھر کی
مرعوب کن سیاسی شخصیتوں سے قطع نظر محسن الملک ۔ وقار الملک ۔ مہدی نواز جنگ

عزیز مرزا. ظفر علی خاں. نذیر احمد کتنے حیدر آباد سے نکالے ہوئے حیدر آباد پنشن پاتے ۔ قوم و ملت کے مخدوم بنے ہوئے اور جب ۔ سر اقبال ۔ اس پایہ کے تھے تو خوش اقبالوں کا کیا حال ہوگا ۔ دل میں ہوائی قلعے تعمیر ہو رہے تھے ۔ اور اپنی کتابوں میں فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع اور سائکولوجی آف لیڈر شپ (انگریزی) نکل چکی تھی کہ اردو یونیورسٹی (جامعہ عثمانیہ) کے قیام کا غلغلہ بلند ہوا ۔ اور ساتھ ہی ۱۹۱۷ء میں اردو یونیورسٹی کا پیش خیمہ سررشتۂ تالیف و ترجمہ قائم ہو چکا ۔ اور فلسفہ، تاریخ ۔ معاشیات ریاضیات ۔ وغیرہ کے مترجمین و مؤلفین مقرر ہو گئے ہیں ۔ بابائے اردو (افسر مترجمین) اور سید راس مسعود ڈائرکٹر تعلیمات کی طرف سے تار پہنچا کہ تمہارا تقرر مترجم فلسفہ کی حیثیت سے ہو گیا ہے ۔ آجاؤ ۔ تنخواہ تین سو روپیہ ماہوار سے شروع ہوگی ۔ ۱۹۱۷ء کے اس وقت کے تین سو آج کے تین ہزار بلکہ ۲ ½ ہزار کے برابر تھے ۔ خیر اخیر اگست میں روانہ ہوا ۔ اور یکم ستمبر ۱۹۱۷ء سے کام شروع کر دیا ۔ حیدر آباد دلچسپیوں اور رنگینیوں کے لئے مشہور رہا ہے ۔ مگر اپنا دل کچھ زیادہ نہ لگا ۔ ریاست کی وہی کیفیت تھی جو اخیر زمانے میں مغلیہ سلطنت کی ہو گئی تھی ۔ ہر وقت جوڑ توڑ ۔ چوبیس گھنٹے سازشیں ہر پارٹی اس کی فکر میں اور ہر ٹولی اس کی دشمنی میں ۔ دو مہینے کاٹنے مشکل ہو گئے ۔ مخلص بہت سے تھے اور سب کے رئیس و سردار سید امین الحسن بسمل موہانی اور عزیز و ہم وطن بھی تھے ۔ نئی بیاہی ہوئی دلہن کو بھی بلا لیا تھا ۔ اس کے باوجود بھی دل نہ لگا ۔ خیر ۔ اخیر جولائی ۱۹۲۰ء میں رخصت پر چلا آیا ۔ اور یہاں سے استعفا لکھ کر بھیج دیا ۔ ۸-۹ مہینے بیکاری کے گذرے ہوں گے ۔ کہ شروع مئی ۱۹۱۹ء میں سر امین جنگ بہادر (سکریٹری پائیگاہ مبارک) کا تار پہنچا کہ ' اعلیٰ حضرت نے تم کو یاد کیا ہے فوراً آجاؤ ' خیر گیا مگر ڈرتے ڈرتے کہ کہیں کسی بدخواہ دشمن کی یہ حرکت نہ ہو ۔ حیدر آباد اسٹیشن ہی پر حکم ملا کہ اب کی آزاد و خود مختار نہیں ہو کہ جس کے یہاں چاہوں قیام کروں ۔ صدر الصدور امور مذہبی نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کے ہاں سرکاری طور پر قیام کرو ۔ بارگاہ خسروی میں حاضری آج ہی پانچ ساڑھے پانچ

بجے شام کو ہوگی۔ بخیر وقت مقررہ پر پہنچا مگر ڈھرکتے ہوئے دل کے ساتھ کہ دیکھئے خدا معلوم کیا پیش آئے۔ کنگ کوٹھی کے بیرونی پھاٹک پر سواری رکی۔ فرلانگ دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرکے برآمدہ تک پہنچا۔ پہنچ کر یہ اطمینان ہوا کہ مصاحبین موجود نہیں۔ بلکہ اعلیٰ حضرت بالکل تنہائی میں کھڑے ہوئے تھے کہ حسب دستور نذر کے پانچ روپئے پیش کئے۔ (سنے گئی کے یہ سکے مولانا شیروانی سے مانگ کرلے گیا تھا) نذر قبول ہوئی۔ خود بالکل معمولی کرسی پر بیٹھے اور مجھ سے بھی ایک ایسی ہی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ چیز بڑی ہی عزت افزائی کی تھی۔ ورنہ بڑے بڑے "جنگ" اور بڑے بڑے "ملک" اور "دولہ" کھڑے ہی رہتے تھے۔ گفتگو کوئی ۳۰۔۳۵ منٹ تک جاری رکھی۔ سرسید کی نیچریت سے لے کر خدا معلوم کتنے متفرق موضوع چھیڑے اور میں ہر لحہ ڈرتا ہی رہا کہ دیکھئے میرا کون سا جواب مردود ٹھیرتا ہے۔ اور اس کے بعد ہی یہ فرمان صادر ہوگیا کہ میرے لئے "گھر بیٹھے ۱۲۵ سکہ انگریزی کی علمی پنشن تاحیات مقرر کی جاتی ہے"۔ سالہا سال اس رقم پر گزر کرتا رہا۔ ۱۹۴۸ء میں، جب روپیہ کی قیمت ایک چوتی کے برابر رہ گئی تھی۔ یہ رقم سر مرزا اسمٰعیل کی حسن توجہ سے بڑھ کر ۲۰۰ ہوگئی۔ بلکہ ان بیچارے نے سفارش تو ڈھائی سو ماہوار کی کی تھی۔ دربار عام میں شرکت تو صرف ایک بار ہوئی۔ دیکھا کہ اونچے عہدہ داروں کے لئے تو فاصلہ پر کرسیاں بچھی تھیں۔ باقی اور عہدہ دار دست بستہ کھڑے ہیں۔

عادت و اطوار حلیہ و بشرہ

مولانا ماجد ایک صاحب طرز انشا پرداز ہی نہیں تھے۔ بلکہ ناقد فن۔ فلسفۂ حاضر کے نکتہ رس۔ نفسیات بشری کے رمز شناس۔ شریعت کے دانا۔ طریقت کے بینا۔ اور قرآن کریم کے مترجم و مفسر بھی تھے۔ یہ ایک ایسے مجمع کمالات انسان تھے کہ ان کی سیرت اور زندگی کے پہلوؤں پر روشنی ڈالنا محال ہے۔ آپ کے اطوار گرانقدر اور پاکیزہ تھے۔ زندگی بھر وقت کے پابند رہے۔ ان کی زندگی میں ترتیب و تنظیم، اصولوں کا پاس و لحاظ کی نادر مثالیں ملتی ہیں۔ اصول و ضابطہ کی پابندی کی مثال یا تو حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں پائی جاتی ہے۔ یا پھر مولانا موصوف

کے یہاں ۔ ہر بات کا اصول متعین ۔ ہر ہر کام کے اوقات بندھے ٹکے ۔ آپ کے تعلقات بے حد وسیع اور گوناگوں تھے ۔ بڑوں سے بھی اور چھوٹوں سے بھی ۔ عقیدت کی بھی اور شفقت کے بھی دوستی کے بھی اور رشتہ داری کے بھی ۔ علمی بھی اور سیاسی بھی ۔ خالص ادبی اور ٹھیٹ دینی اور مذہبی بھی آپ ان سب کے نباہ کی پوری رعایت اور خیال و اہتمام سے کام لیتے تھے ۔ کیا مجال جو کہیں ضابطہ اور اصول میں فرق آجائے ۔ مشاغل درہم برہم ہو جائیں ۔

مولانا کے رفیق معظم علامہ سید سلیمان ندوی جب اپنے اصول پسند دوست کو ستا کر لطف اندوز ہونا چاہتے تھے ۔ تو بس یہی کرتے تھے ۔ اگر مولانا دو دن کا پروگرام بنا کر اعظم گڈھ تشریف لاتے ۔ تو عین چلتے وقت پر ایک دن رک جانے پر اصرار فرماتے اور اس وقت تک اصرار فرماتے رہتے جب تک اصرار میں جھنجھلاہٹ پیدا نہ ہو جاتی ۔ اور پُرلطف قہر آمیز ۔ جواب نہ سن لیتے کہ" حیرت ہے کہ آپ جیسے لوگ بھی اوقات کا لحاظ و پاس نہیں کرتے " عام طور پر قاعدہ ضابطہ برتنے والوں کا مزاج روکھا پھیکا اور فطری لچک ، لوچ اور ذوق ، انس و محبت سے عاری ہوتا ہے ۔ مگر مولانا ایسے نہیں تھے ۔ وہ اس قدر پابند نظم و ضبط ہو کر بھی بہت ہی رقیق القلب بڑے شفیق اور محبت نواز تھے ۔ ان کا دل خوف خدا سے لرزاں رہتا تھا ۔ ان کا دل باتوں باتوں میں بھر آتا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے ۔ اپنے محبوب معاصرین کی رحلت پر انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ان کے تعلقات خاطر اور رابطہ الفت کا پتہ دیتا ہے ۔ دوست داری اور دوستوں کی خبر گیری ان کا خاص دستور تھا ۔ دیرینہ تعلقات اور پاس وضعداری میں ذرا بھی فرق نہ آنے دیتے تھے ۔ چھوٹوں پر بے انتہا شفقت فرماتے ۔ ان کی خیریت طلبی کے لئے خطوط لکھتے جو محبت اور خلوص کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے ۔ اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ حلقۂ احباب میں بے حد خلیق اور مقبول ہوتے ہیں وہ اپنے گھر اور افراد خاندان کے حق میں قاطع رحم اور غیر مقبول ہو جاتے ہیں ۔ مگر مولانا گھر اور باہر دونوں جگہ ایک سے ہوتے تھے ۔ اپنے بھائی ڈپٹی عبدالحمید مرحوم کی رحلت پر " ناز بردار بھائی " ، کے زیر عنوان جو کچھ لکھا ہے ۔ یا اپنی اہلیہ کی وفات پر " بوڑھی محبوبہ " ، کے عنوان سے صدق میں جو کچھ لکھا ہے ۔

اور جو اشعار انگیز واقعات تحریر فرمائے ہیں ان کا لفظ بلفظ خونِ دل کی تراوش ہے ۔ اور جو گہری محبت اور یاس حزنِ فراق کا پتہ دے رہا ہے ۔ جو ایک محبت بھری خاندانی زندگی میں پایا جاتا ہے ۔

مولانا کی زندگی کا ایک بہت نمایاں وصف یہ تھا کہ ان کی زندگی ایک متعین مقصد کے لئے وقف تھی ۔ دین و ملت کی علمی و فکری خدمت کو انھوں نے روزِ اوّل سے انھوں نے اپنا مقصدِ اولین بنا لیا تھا ۔ اور تا دمِ آخر اس سے سرِ مو انحراف نہ فرمایا ۔ ان کے دورانِ حیات کتنے ہی انقلابات آئے زمانہ کس کس طرح پلٹا کھایا لوگ کیا سے کیا ہو گئے ۔ کوئی مسندِ علم چھوڑ کر خار زارِ سیاست میں جا پڑا ۔ کوئی خدمتِ ملک و ملت چھوڑ کر حکومت کی کرسی پر چڑھ بیٹھا ۔ کسی نے مدرسے سے اکتا کر خانقاہ کی راہ لی ۔ کتنے دل کے غنی اور بوریا نشین زاہد حرصِ دنیا اور حبِّ مال کے دلدل میں جا پھنسے ۔ مگر مولانا محترم اس سارے طوفانِ حوادث میں بھی اپنی جگہ قائم اور ثابت قدم رہے ۔ آپ نے ڈھائی ہفتہ کے لئے جب پاکستان میں قیام فرمایا تو دورانِ قیام میں ایک صاحب فرمانے لگے کہ اب تو پاکستان تشریف لے آئیے ہیں ہندوستان میں کیا رکھا ہے ؟ مولانا کو ان کی یہ بات پسند نہ آئی اور سخت ناگواری کے لہجے میں فرمایا ۔ آپ کے نزدیک میں ہندوستان میں بیٹھا تضیعِ اوقات کر رہا ہوں " اپنے دائرۂ علم و صحافت میں مولانا نے جو خدمات تقسیمِ ہند کے بعد بھی جاری رکھیں ان میں بظاہر بجلی کی سی چمک اور کڑک نہیں لیکن بلاشبہ ماہتاب کی سی خاموش فیض رسانی کا اثر موجود ہے ۔

مولانا مجلسی آدمی بالکل نہیں تھے ۔ تحریریں وہ جس قدر شگفتہ بلکہ شوخ و شنگ نظر آتے تھے عام محفلوں میں وہ اس کے بالکل برعکس سراپا سکوت اور مرقع وقار بنے رہتے تھے ہاں کبھی کبھی محدود مجلس اور خاص بے تکلف دوستوں کی محفل ہوتی تو خوب کھلتے بھی تھے ۔ ایسی مجلس میں مولانا کی ظرافت اور ادب نوازی اپنے پورے جوہر دکھاتی تھی ۔ مگر ایسے وقت میں اگر ایک بھی غیر یا نا مانوس شخص آ جاتا تو وہ دفعتاً ایسے بند ہو جاتے تھے جیسے چھوئی موئی کا پتہ

ذرا سا چھو جانے سے بند ہو جاتا ہے۔

مولانا کا ایک نمایاں قسم کا بزرگانہ وصف یہ بھی تھا کہ وہ بڑے ادب نواز قدر دان اور قدر افزا واقع ہوئے تھے۔ اس جوہری کو جس پتھر میں کہیں ذرا سی صلاحیت کی جوت نظر آتی تو وہ اسے فوراً مختصر خطوط کے چھوٹے چھوٹے جملوں سے اس کی نفسیاتی تراش خراش میں منہمک ہو جاتے تھے۔ انھوں نے اپنی شفقت بھری نظریں ڈال کر کتنے نومشقوں کو اہل قلم بنا دیا۔ اور کتنوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ میدان علم و ادب میں فیض رساں بن گئے

مولانا کی پاکیزہ طبیعت کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ ہر ملنے والے کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے۔ مخاطب کو " عبدِ ذلیل " اور خود کو " ربِّ جلیل " سمجھ کر کبھی گفتگو نہیں کرتے تھے۔ اور نہ گفتگو میں واعظانہ اور ناصحانہ رنگ غالب ہوتا تھا۔ وہ باتوں باتوں میں نہایت سادگی کے ساتھ اپنا خیال مخاطب کے دل میں پیوست کر دیتے تھے۔ اس لئے ان کے فیض صحبت سے مستفید ہونے کا موقع خوب حاصل ہو جاتا تھا۔ وہ بڑی دلسوزی اور اپنائیت کے ساتھ گفتگو فرماتے اور نہایت خلوص اور سچائی کے ساتھ اپنے بیش فرماتے تھے۔ کسی مسئلہ پر گفتگو ہوتی تو تحقیق اور تفصیل کے ساتھ اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے تھے۔ وہ اپنے خیالات کسی پر ٹھونستے نہیں تھے۔ بلکہ اپنے خیالات کا اس خوبی سے جال پھیلاتے تھے کہ اس سے باہر نکلنا مشکل ہو جاتا تھا۔

وہ اہل ادب، اہل قلم علما و فضلا کا بڑا احترام کرتے تھے۔ بزرگوں کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ عام لوگوں کی تقلید سے ہمیشہ گریز فرماتے تھے۔ صاف گوئی اور حقیقت پسندی ان کے مزاج کا جزو بن گئی تھی۔ وہ اپنی رائے بڑی بے باکی، صفائی، استقلال اور استقامت کے ساتھ ظاہر کر دیتے تھے مذہبی تھے اور نہ تائل فرماتے تھے۔ مولانا حسین احمد کے مرید تھے۔ لیکن سیاسیات میں ان

کے مسلک سے سخت اختلاف رکھتے تھے۔ اور اس کے اظہار میں بھی تامل نہیں کرتے تھے۔ مولانا اشرف علی ؒ ان کی نظر میں حکیم الامت تھے۔ تھانہ بھون ہر سال کسبِ فیض کے لئے جایا کرتے تھے۔ اور وہاں ہفتوں رہتے تھے۔ لیکن اس عقیدت کے باوجود متعدد مسائل اور امور ایسے تھے جن میں حکیم الامت کا مسلک کچھ اور تھا اور مولانا کا کچھ اور۔ مولانا محمد علی جوہر سے بڑی محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ اس عقیدت کا یہ عالم تھا کہ.....

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے

جس دن سے ان کا انتقال ہوا مولانا بھی عملی سیاست سے یک قلم دست کش ہو گئے تھے۔ ان کی دیانت، خلوص، جرأت، مردانگی اور اصابت رائے کا لوہا مانتے تھے۔ لیکن کئی باتیں ایسی بھی تھیں جن میں دونوں کے درمیان کبھی ان بن بھی ہو جاتی تھی۔ آپ بڑے متوازن مزاج تھے توازن مزاج بڑی چیز ہے۔ لیکن بہت کم لوگ اس نعمت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ مولانا کو خدائے تعالیٰ نے توازن کے ساتھ ساتھ سلامتی فکر بھی عطا کی تھی۔ وہ افراط و تفریط سے بہت دور رہتے تھے۔ مذہبی مسلک کے اعتبار سے بڑے کٹر حنفی تھے۔ لیکن دوسرے مقلدوں کے دشمن نہ تھے۔ وہ سیاسیات میں مسلم لیگ اور پاکستان کے قائل تھے۔ مگر نیشنلسٹ لوگوں سے دوستانہ روابط بھی رکھتے تھے۔ وہ اپنے سنّی ہونے پر ناز کرتے تھے۔ لیکن شیعوں کو بھی اپنا مسلمان بھائی سمجھتے تھے۔ وہ ظاہر کو بھی دیکھتے تھے اور باطن کو بھی۔ وہ ہنساتے بھی تھے اور رلاتے بھی۔ ان کے پاس نشاطِ حیات کا لیان بھی تھا اور فکرِ آخرت بھی۔ وہ فکرِ آخرت پر نشاطِ حیات کو کبھی قربان نہ کرتے تھے۔ اور نشاطِ حیات کے مقابلے میں فکرِ آخرت کو فراموش نہیں کرتے تھے۔ گویا آخرت کی فکر بھی کرتے اور زندگی سے لطف بھی لیتے تھے۔ وہ ورزش بھی کرتے اور واکنگ (چہل قدمی) بھی نماز بھی پڑھتے اور ناول بھی پڑھتے اور گھوڑا بیچ کر سوتے بھی یعنی آرام کے وقت آرام اور کام کے وقت کام ان کا معمول تھا۔ غرض ان کی ہر بات میں ہر چیز میں ایک خاص قسم کا اعتدال اور توازن پایا جاتا تھا۔ وہ ہر اعتبار سے کامل العیار اور با اصول انسان تھے۔ ان کی با اصول زندگی ایک خاص نظم و ضبط کی حامل رہی ہے۔

شخصیت اور طرز زندگی

مولانا ماجد کی زندگی از اول تا آخر ایک خطِ مستقیم کے ذریعہ ناپی نہیں جاسکتی اس میں کتنے ہی موڑ اور کتنے ہی پیچ وخم آتے ہیں۔ انھوں نے علم واخلاق کا ایک مجسمہ تراش کر زندگی کے ہر ایک کنارے اور ہر ایک گوشے پر کھڑا کردیا ہے۔ وہ فطرتاً ماضی پرست تھے۔ لیکن حال کے ساتھ ان کے تعلقات اتنے گہرے رہے ہیں کہ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ ان کے ذہنی محسوسات میں بالکل قدامت پرستی، کہنگی یا فرسودگی آگئی ہو۔ ان کی زندگی ایک متشکک فلسفی ایک صاحب طرز ادیب ایک عظیم صحافی ایک بلند پایہ مفسّر ایک خوش عقیدہ اور باصفا مرد مسلمان اور شفیق وبزرگ مرشد اور ایک فہم وفراست مبلغ کی زندگی تھی۔ یہی ایک ایسی زندگی تھی اور یہی ایک ایسی شخصیت تھی جس میں موتی کی طرح بے شمار پرتیں پائی جاتی تھیں مولانا موصوف ایک مصنف، ایک صحافی اور ایک مفسّر کی مکمل زندگیوں کے حامل تھے۔ ان کی علمی، سیاسی اور صحافتی زندگی کا آغاز بڑے تلاطم خیز زمانے میں ہوا تھا۔

فکر وعمل کا پس منظر

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اِحیا ملت رہنوں کی ایک آخری کوشش تھی۔ اس کوشش کو نہایت بے رحمی کے ساتھ انگریزوں اور کچھ برادران وطن گولیوں اور سنگینوں سے کچلا گیا۔ کہ پھر چالیس برس تک مکمل حیرانی وششدر کی حالت مسلمانوں پر طاری رہی۔ بوڑھے سرسید کی ایک آواز اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی پراسرار سرگرمیوں کے علاوہ دور تک سناٹا تھا کچھ لوگ رامش ورنگ میں مشغول ہوگئے۔ کچھ نے مایوس ودل برداشتہ ہوکر گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ باقی لوگ توآہ سرد اکثر بھرا کرتے تھے۔ مگر فرنگیوں کے اقتدار کے سامنے کسی میں دم مارنے کی ہمت نہ تھی۔ پھر وہ دور آیا کہ مولانا آزاد پیدا ہوئے۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی عالم وجود میں آئے۔ بعد ازاں مظہر الحق ظاہر ہوئے۔

کسی طرف سے مولانا حسرت موہانی نکل آئے۔ مولانا ظفر علیخاں اور ڈاکٹر سر محمد اقبال نے جنم لیا۔ حکیم محمد اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری گوشۂ عافیت باہر آگئے۔ پرانے شبستانوں کے محرم اسرار۔ انہدام و انقلاب کے چشم دید گواہوں۔ اور عظمت رفتہ کے نوحہ خوانوں کی حیثیت سے پرانی نسل کے جہاندیدہ بزرگ حالیؔ، شبلیؔ، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد ایک پوری قوم کو مرتعش اور ضعیف ہاتھوں سے کچھ نہ کچھ گرمی پہنچانے کی کوشش مدت دراز سے کر رہے تھے۔ نئی نسل کے باحوصلہ جوانمردوں کو فراش انگیز انگریز نغمہ سرائی اور مردوں میں روح تازہ پھونک دینے کے عزم صادق میں مصروف دیکھ کر خوش خوش آگے پیچھے رخصت ہو گئے۔ ہاں مرتے وقت انھیں اتنا اطمینان ضرور رہا ہوگا کہ ہم سے جو کچھ بن پڑا کر گزرے۔ باقی یہ لوگ دیکھ لیں گے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی اس قافلہ کے ہم سفر اور اس راہ آزادی و عمل کے راہی تھے۔ انھوں نے جس وقت قلم ہاتھ میں لیا اس وقت قلم کی عظمت حرمت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ قلم اگر تلوار سے تیز نہ ہو اور نیزے سے زیادہ آبدار اور تیر سے زیادہ جونچکاں نہ ہو تو اس کو ہاتھ میں لینے کی کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ خوف سے لرزہ براندام ہو جانے اور دولت کدوں کے بالاخانوں میں بیٹھے بیٹھے حقوں کے نیچے تھام لینے کا کام لوگوں کو زیادہ اچھا معلوم ہوتا تھا۔ صرف وہ لوگ اس قلم کے میدان میں اترتے تھے۔ جو خدمت اور بندگی کے اظہار کے لئے صرف عبادت کو ناکافی سمجھتے تھے۔ قلم کی عظمت اور ناقابل تسخیر قوت کا اعتراف ہر زمانے میں کیا جاتا رہا ہے۔ مگر اس کا حقیقی اظہار اس وقت ہوا جب مولانا محمد علی۔ مولانا ابو الکلام آزاد۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا عبد الماجد دریابادی کے ہاتھوں نے اس کے ذریعہ ہندوستان کی فضا کو گرما دیا۔

مولانا موصوف کے فکر و عمل کی جہتوں اپنی انھیں عوامل نے متعین کیا۔ جمال الدین افغانی۔ مولانا اشرف علی تھانوی۔ مولانا محمد علی۔ مولانا سید سلیمان ندوی اکبر الہ آبادی۔ یہی وہ ہستیاں ہیں جو مولانا کے فکر و ذہن کی تشکیل و تزئین میں معمار ثابت ہوئیں۔ انھیں کے اثرات کی بدولت وہ اسلام کی گزشتہ عظمتوں کی

بازیافت کے علمبردار اور اسلامی تعلیمات کے فروغ کے مبلغ ۔ سیاست ،صحافت ،علم و عمل اور ذہن و شعور کو انسانیت کے تابع رکھنے کے مؤید اور تہذیب گذشتہ کے سب سے بڑے ترجمان بن سکے ۔ درحقیقت وہ ایک بہت بڑے انقلاب کے بعد پیدا ہوئے تھے ۔ اور پھر ایک بڑے انقلاب کے بعد زندہ رہنے والے بہت بڑے مسلم اہل قلم اور دانشوروں میں سے ایک تھے ۔ خلافت کی پرجوش روحانی ورومانی ہمہ گیر تحریک کی یادگاروں میں سے ایک عظیم یادگار آپ کی ذات عالی تھی ۔ تحریک آزادی اور حصول آزادی کے بعد تقسیم ہند کی جدوجہد کا تیس سال کا ہنگامی زمانہ بڑے تلاطم ۔ بڑے پیچ وخم اور بڑی سخت قسم کی فکری الجھنوں کا زمانہ تھا ۔ مولانا ماجد اس تمام عرصہ میں قلم کا تیشہ اور فکر و ذہن کا ترکش لئے ہوئے پہلی صف میں موجود رہے ۔

مزاج وکردار کی خصوصیات

شروع شروع میں مغربی فلسفہ کے زیر اثر مولانا پر بھی تشکیک کا دور گذرا لیکن ان کی فطرت سلیم اصابت رائے ۔ اور طلب صادق نے انھیں زیادہ عرصہ تک بھٹکنے نہ دیا ۔ وہ جلد راہ مستقیم پر آگئے ۔ قدرت نے مولانا کو فطرت سلیم عطا فرمائی تھی ۔ جودت ذہن اور اور فطرت سلیم یکجا بہت کم ہوتی ہیں ۔ مگر مولانا کی شخصیت میں دونوں ایک ساتھ موجود تھیں ۔ ابتداء میں جو راہ الحاد آپ نے اختیار کی تو وہ اسی جودت طبعی اور ذکاوت طبع کا نتیجہ تھی ۔ یہ محض سلیم الفطرتی تھی کہ آپ بہت جلد جدید علم و تمدن کی جھوٹی چمک دمک سے واقف ہو گئے تھے ۔ اور نہ صرف واقف ہوئے تھے ، بلکہ اس سے قطعاً نفرت کرنے لگے تھے ۔ اور اپنی اصلاح کی فکر میں ہر لحظہ محو ہو گئے تھے ۔ آپ نے اس اصلاح نفس کے لئے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے شرف بیعت حاصل کیا ۔ اور مجدد وقت حضرت مولانا اشرف علیؒ تھانوی سے تزکیۂ باطن اور اصلاح نفس کا تعلق رکھا ۔ اس انقلاب حال نے مولانا کو وہ مقام عطا کیا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے ۔

مولانا بزم دوشیں کی یادگار۔ کاروانِ اردو کے قافلہ سالار۔ دین و ملت کے خدمت گذار۔ طریقۂ سلف کے پیروکار۔ ملت بیضا کے موید و مددگار۔ علوم جدید و قدیم کے طلبگار۔ اور سب سے بڑھ کر قرآن کے رموز و اسرار کے ماہر و واقف کار تھے۔

علوم مشرق و مغرب عجب یکجا بہم آمد قدامت از یمیں آمد تجدد از یسار آمد

مولانا کی بے مثال شخصیت مغتنمات زمانہ میں سے تھی۔ ان کی فکر و نظر میں قدیم و جدید کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ہر اہل قلم کی طبیعت کا خاص میلان ہوتا ہے۔ اور یہ میلان اکثر اسے راہ اعتدال سے ہٹا دیتا ہے۔ مولانا میں یہ بات بالکل نہیں تھی۔ ان کے مزاج میں میانہ روی اور اعتدال پسندی بدرجہ اتم موجود تھی۔ ان کا قلم بڑا محتاط تھا۔ کبھی کسی کی بے جا طرفداری نہیں فرماتے تھے۔ اور نہ ہی کسی پر بے جا زیادتی کرتے تھے۔ حریف مخالف کی کتاب پر تبصرہ ہو رہا ہے۔ اور مصنف کی غلطیاں اور اس کے قلم کی لغزشیں دکھاتے دکھاتے جب کوئی لفظی یا معنوی خوبی پر نظر پڑتی تو بے اختیار داد بھی دینے لگتے تھے۔ صدق جدید میں مختلف قسم کی کتابوں پر تبصرہ فرمایا آپ کا تبصرہ بڑا بے لاگ اور جچا تُلا ہوتا تھا۔ آپ مخالف کی خوبیوں کی بھی قدر کرتے تھے۔ نقد و تبصرہ کے باعث آپ کے کئی مخالفین بھی پیدا ہو گئے۔ لیکن ان سے قلمی بحث و جدال میں آپ کبھی ذاتیات پر نہ اترے۔ عقلی و علمی دلائل سے حریف کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور بالآخر اسے شکست دی۔ ان کے مزاج میں غضب کا توازن پایا جاتا تھا۔

یکم جنوری ۱۹۷۰ء کے صدق جدید میں سرکاری و فدج کی شرکت سے معذرت کی تھی اس معذرت خواہی کے جو اسباب بیان کئے ہیں وہ آپ کے مزاج و کردار کی نمایاں خصوصیات اور آپ کی بلند شخصیت کی انفرادیت کے آئینہ دار ہیں۔ دل شرکت پر ہے۔ اعتبار مائل۔ احباب و اعزہ کی فرمائش اور مخلصوں کی کوشش شرکت کی مقتضی مگر دعوتوں اور نیم سرکاری گفتگوؤں میں وقت کے ضائع ہونے کا اندیشہ، دیگر اراکین وفد سے ناواقفیت کا خدشہ

طرق گوشہ گیری اور خلوت گزینی میں خلل کا قوی امکان ۔ اور سب سے بڑھ کر ضمیر کی آواز شرکت کے خلاف تھی ۔ غرض معذرت کرنے میں عجیب کشمکش کا سامنا ۔

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

مولانا ایمان کے روکنے سے رک گئے ۔ کفر کی کشش کسی حالت میں بھی انھیں کھینچ نہ سکی گویا کعبہ کو آگے رکھا اور کلیسا کو پیچھے ۔ عدم شرکت کا فیصلہ کرنے میں مولانا کی عقلیت بلند کرداری اور قوت ایمانی شریک غالب رہی ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ہجوم جذبات میں بھی دماغی توازن برقرار رکھتے تھے ۔ اور یہی آپ کی عظمت کردار اور غیر معمولی حسن شخصیت کی دلیل تھی ۔

شخصیت کے خدوخال

مولانا پابندئ وقت کا جس طرح خیال رکھتے تھے ۔ اس کی مثالیں باید یا شاید ہی ملتی ہیں ۔ آپ اپنے معمولات میں کسی حال میں بھی فرق نہیں آنے دیتے تھے ۔ یہ عادت ابتدائے عمر سے تھی ۔ ان کی ذاتی شخصیت اور علم و فضل میں وسعت اور ترقی کے معاملہ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تربیت مزاج اور تعلیمی ذوق کی بنیادیں اول ہی سے مستحکم تھیں ۔ اور ابتداء ہی سے اس مرتبۂ عظیم کی نشاندہی کرتی تھیں جہاں وہ فائز اور سربلند ہوئے ۔ وہ شروع ہی سے اچھے اور محنتی طالب علم تھے ۔ علم و معلومات حاصل کرنے کی لگن میں لگے رہتے تھے ۔ ان کی طبیعت و فطرت کا یہ اصول خاصہ تھا کہ وہ جس علم کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے ۔ اس کو از ابتدا تا انتہا حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ علمی اور عملی طور پر اس میں مصروف و منہمک ہو جاتے تھے ۔ ان کو کتب بینی کا ازحد شوق تھا ۔ تفتیش و جستجو کا خلقی مادہ رکھتے تھے ۔ ان کو شروع ہی سے تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری کی صلاحیت حاصل تھی ۔ وہ زمانہ طالب علمی میں نہایت خوشنما اور باوقار شخصیت کے حامل تھے ۔ ان کا جسم بہت سڈول اور دلفریب تھا ۔ خوش پوشاک بھی تھے ۔ اور خوش اطوار بھی ۔ اچھے قسم کا ہندوستانی لباس پہنتے تھے ۔ اور وہ انھیں خوب زیب دیتا تھا ۔

درمیانی حصۂ عمر میں صاف ستھرے کپڑے تو پہننے لگے ۔ مگر سیدھے سادے کھدر یا لٹھے کے ڈھیلے ڈھالے لباس کو پسند فرمایا کرتے تھے ۔ لباس کے متعلق بے پرواہی یا بے رخی غالباً ان کی علمی دینی مصروفیات اور معلومات کی جستجو کے باعث واقع ہوئی تھی ۔ مگر لباس کے رکھ رکھاؤ کا خیال نہ رکھنے کے باوجود وہ آخری عمر میں باوقار نظر آنے لگے تھے۔

تعلیمی سلسلے میں ان کا ابتدائی رجحان فلسفہ کی طرف تھا ۔ اور وہ فلسفۂ مغرب کے گورکھ دھندے میں کچھ اس طرح پھنس گئے تھے ۔ کہ اس کا پرچار بھی بڑے شد و مد سے کرنے لگے تھے ۔ جس سے لوگوں کو ان کی بے دینی کا شبہ ہونے لگا تھا ۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بڑی خیر کی ۔ اس منزل کو پہنچنے کے بعد ہی وہ اسلامی اور دینی تعلیمات سے دلچسپی لینے لگے ۔ اور بالآخر راہ راست پر آگئے ۔ انھوں نے اپنی زندگی کے ہر دور میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار نہایت دلیرانہ اور جرأت مندانہ طور پر فرماتے رہے۔

تصوّف اور دینی فکر کی طرف مُراجعتُ

مولانا موصوف کے خیالات اور اعتقادات میں جب تبدیلی واقع ہوئی تو وہ تصوّف سے دلچسپی لینے لگے ۔ اس رنگا رنگ زندگی اور صوفیانہ کیفیت کے عالم میں آپ حضرت محبوب الٰہی نظامُ الدّین اَولیاءؒ کی درگاہ مقدس پر کئی مرتبہ معتکف ہوئے ۔ اور اس دور میں صوفیانہ محفلوں سے اور سماع و قوالی سے آپ مستفید ہونے لگے ۔ اور حال و قال کی مجلسوں میں دلچسپی لینے لگے ۔ قوالی سے صرف اثر پذیر ہی نہیں ہوتے تھے ۔ بلکہ بسا اوقات اچھے قوالوں کو اپنے ساتھ رکھتے تھے ۔ اور اکثر اچھے کلام اور اچھی قوالی سنتے ہوئے ان پر سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی ۔ خاص کر نعتیہ کلام سے بہت متاثر ہوتے تھے ۔ نعت پاک سے متاثر ہونا تو زندگی بھر رہا ۔ لیکن آخری عمر میں موسیقی سننے سے پرہیز فرمانے لگے ۔ نعتیہ اشعار خود بھی کہا کرتے تھے ۔ اچھا کلام جب بھی ریڈیو سے سنتے تو ان پر رقت کا عالم طاری ہو جاتا تھا ۔ یہ نبی اکرمؐ سے بے پناہ عشق و عقیدت کی دلیل ہے۔

کردار کی تشکیل میں علمی شخصیتوں کے اثرات

جب آپ علمی وادبی دنیا میں اچھی طرح متعارف ہوگئے تو ہندوستان گیر شہرت رکھنے والی عظیم شخصیوں سے آپ کے مراسم مضبوط ہوتے گئے۔ جن لوگوں کی شخصیتوں اور علمی کردار نے آپ کو متاثر کیا ان میں مولانا شبلی۔ مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی۔ حکیم اجمل خان۔ ڈاکٹر انصاری۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ حسرت موہانی کے فیض صحبت سے آپ نے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ موصوف کا براہ راست واسطہ حیدرآباد دکن۔ اعظم گڑھ اور علی گڑھ کے علمی وادبی اداروں سے بھی رہا ہے۔ بیشتر اساتذہ، شعراء اور علماء سے ان کا میل جول تاحیات قائم رہا۔ یہ ہمیشہ صاحبان علم وفضل اور ارباب فکر ودانش سے علمی وادبی، دینی ودنیوی موضوعات پر تبادلۂ خیالات اور بحث ومباحثے کیا کرتے تھے۔ انھیں اردو۔ فارسی۔ عربی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ جملہ قسم کے علوم اور ادبیات پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا۔ جو کچھ پڑھتے یا سنتے حرف بحرف یاد رہ جاتا تھا۔ بالخصوص اچھے اور موزوں قسم کے اشعار تو انھیں ازبر ہوگئے تھے۔ جب کبھی ان کے سامنے کوئی بات آتی تو وہ حیرت انگیز نکتہ رس کا پہلو نکال لیتے تھے۔ اور پھر اس موضوع سے متعلق کوئی نہ کوئی اردو یا فارسی کا شعر برجستہ اس کی سند یا تصدیق کے طور پر پیش کر دیتے تھے۔

ان کی علمی جدوجہد اور ادبی کاوشوں نے اور ان کی بیش قیمت صلاحیتوں نے ایک طرف اور دوسری طرف ان کی خلق شائستگی۔ سنجیدگی۔ منکسر مزاجی۔ خوش اخلاقی اور خلوص نے انھیں لافانی شہرت ومقبولیت عطا کر دی تھی۔

تحریر کی صلاحیتیں

تصنیف و تالیف کی یہ صورت کہ ان کی تحریر اور نثر نگاری میں رنگ رنگ کے پھول نظر آتے ہیں۔ اور اپنی طرزِ نگارش میں انھوں نے ایک مخصوص شاہراہ اور روش کی بنیاد ڈالی ہے۔ جو کہ صرف ان کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ ان کا اسلوب نگارش بہت خوش آئند اور دلفریب ہے۔ اس میں سچائی، خلوص، صدق و صفا اور صاف گوئی کے عناصر نے دلکشی پیدا کردی ہے۔ وہ مستحکم خیالات کے مالک تھے۔ اور مستحکم طور پر خیالات کا اظہار کرنے کی قوت رکھتے تھے۔ ہیر پھیر کی باتیں کرنا انھیں سخت ناپسند تھا۔ خالی خول شاندار الفاظ اور تراکیب سے قطعی طور پر پرہیز فرماتے تھے۔ چنانچہ ان کی تحریر گورکھ دھندا نہیں معلوم ہوتی۔ ہمیشہ سلجھے ہوئے خیالات اور نظریات کو آسان ترین طرز میں پیش فرمایا ہے۔ اس لئے ہر تحریر جادو اثر اور دل نشیں ہے۔ آپ بڑی سے بڑی بات کو تعجب انگیز نکتہ رسی اور اختصار کے ساتھ بیان فرما دیتے تھے۔ اور چونکہ بے حد ذہین اور صاحب فکر و نظر واقع ہوئے تھے اس لئے الجھاؤ کی باتوں میں الجھتے نہیں تھے۔ اور ہر بات کو نہایت روشن اور ظریفانہ نظافت کے ساتھ اس طرح بیان فرما دیتے تھے۔ کہ اکبر الہ آبادی کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ جو بات بھی کہتے سوچی سمجھی اور غور کی ہوئی ہوتی تھی۔

دینی فکر اور خدماتِ دین

علمی اور ادبی مشاغل کے لئے آپ نے دینی معلومات اور خدمات دین کی طرف بھی تمام عمر توجہ فرمائی۔ جب علم دین کی طرف رُخ فرمایا تو درس و تدریس کے بہت سے مراکز منتول ڈالے۔ مگر ان کو خصوصی امداد، ہدایت و رہبری مولانا اشرف علی تھانوی سے حاصل ہوئی۔ علمی اور دینی میدان میں تلاش و جستجو کا یہ نتیجہ ہوا کہ اب آپ بذاتِ خود دینی پیشواؤں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ علم تفسیر قرآن۔ علم حدیث و فقہ میں انھوں نے اپنے آپ کو اس طرح سربلند کر لیا ہے کہ اس کا جواب نہیں۔ نہ جانے کتنی ایسی کتابیں لکھ ڈالیں کہ ان کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ نے قرآن پاک کی جو تفسیریں اردو اور

انگریزی میں لکھی ہیں ان کے درجہ اور مرتبہ سے ایک دنیا آشنا ہے۔ اور اس سے فیضیاب ہو رہی ہے۔

ایک دلچسپ اور پُرلطف بات یہ ہے کہ عملیات اور دعا۔ تعویز وغیرہ کے متعلق بھی انھیں بے انتہا معلومات حاصل تھیں۔ عملیات میں وہ خود کبھی مبتلا نہیں ہوئے۔ مگر تعویزوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ عام طور پر تعویز نہیں دیتے تھے۔ لیکن اگر کسی کو بحالت مجبوری واصرار تعویز لکھ بھی دیتے تو وہ ان کی خوش نیتی اور اخلاص وبے غرضی کیوجہ سے کارگر ثابت ہو جاتا تھا۔ ایک زمانے میں مولانا موصوف کی توجہ مسمریزم کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ حسب عادت اس کے بارے میں بھی پوری پوری علمی وعملی معلومات بھی حاصل کر کے چھوڑی۔ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی رفیقۂ حیات ایک زمانے میں ہاتھوں اور پیروں کے درد کے باعث سخت تکلیف میں مبتلا تھیں۔ ہزار علاج ومعالجے کئے گئے مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اتفاقاً گھر والوں کو خیال آیا کہ اس معاملہ کو خود مولانا ماجدؒ ہی سے حل کیا جائے پہلے تو انھوں نے خوب پہلو تہی کی۔ ٹال مٹول کی۔ آخر گھر والوں کے متواتر اصرار پر وہ رضامند ہو گئے۔ اور اس درد کو مسمریزم کے ذریعہ دور کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ اور بفضل خدا کامیاب ہوئے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ علم دین کے ساتھ ساتھ دنیوی علوم میں بھی کافی دسترس رکھتے تھے۔ آپ کی پہلودار شخصیت مختلف النوع کمالات کا مجموعہ تھی۔ صاف گوئی اور بےلوث اظہار خیال ان کی سرشت میں داخل تھا۔ اکثر لوگ ان کی صاف گوئی سے گھبراتے تھے۔ اور ان کو سخت مزاج اور سخت گیر سمجھتے تھے۔ مگر جو ہوشمند اور ذی فہم تھے اور ان کو قریب سے جانتے تھے۔ انھیں یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کے مزاج میں سختی ہو تو ہو مگر ریاکاری۔ تعصب اور بغض وعناد کا اس میں شائبہ نہ تھا۔ اور نہ ہی وہ مجرمانہ قسم کی تفریق وامتیاز سے کام لیتے تھے۔ علم وخیال پر وہ تنقید تنبیہہ میں کبھی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ جب کبھی وہ کسی بات پر اعتراض

کرتے تو ان کی نیت مدعا اور منشاء ہمدردانہ ہوتا تھا۔ مخالفانہ نہیں۔ ان
کی دلی خواہش رشد وہدایت اور رہبری کی ہوتی تھی۔ ہمدردانہ دستگیری اور
فلاح وبہبودی کی ہوتی تھی۔ مثلاً صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم
سے ان کے تعلقات حد درجہ دوستانہ اور محبتانہ تھے مگر ان کی کوئی بات ناگوار
ہوتی تھی تو اس پر بے باکی سے معترض ہوتے تھے۔ جیسے کہ غیر متعلق آدمی پر۔
اور ان کا یہ رویہ کبھی دونوں کے تعلقات پر اثر انداز نہیں ہوا۔ ان کی دینی
فکر اور ذہنی خیالات میں جو پختگی آئی تھی وہ محض قرآن کریم کا
فیض کرم تھا۔

ذوقِ مطالعہ

اندازِ فکر و نظر

علمی و ادبی خدمات کا سرسری جائزہ

مکمل فہرست تصانیف

دو اہم ادبی شاہکار

ذوقِ مطالعہ و تحریر

مولانا موصوف کو پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ جہاں کوئی اچھی سی کتاب یا رسالہ واخبار دیکھ لیتے تھے پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔ رطب و یابس کی کوئی تمیز نہ تھی جب ساتویں درجہ یعنی عمر کے بارہویں سال میں تھے تو "اودھ اخبار" لکھنؤ میں مراسلے اور مضمون شائع کرانے کے لئے بھیجنے لگے۔ اپنے نام سے نہیں کسی فرضی نام سے۔ اور یہ زیادہ تر اپنے والد ماجد کے ڈر سے تھا۔ اور کچھ ان کے فطری شرمیلے پن سے بھی۔ آٹھویں درجہ میں پہنچے تو ایک کتاب ہی مرتب کر دی جو عیسائیوں کے جواب میں تھی۔ اسی زمانے میں گورکھپور کے ایک وکیل صاحب مولوی احسان اللہ عباسی چریا کوٹی کی کتابیں بھی خوب پڑھ لیں جن میں "الاسلام" خاصے کی چیز تھی۔ اس کو سامنے رکھ کر مضامین لکھنے لگے۔ وقت کے چلتے ہوئے عنوانات اور موضوعات پر ان کے آرٹیکل اور مضامین اودھ اخبار کے علاوہ "ریاض الاخبار" گورکھپور اور اخبار "الاسلام" (امرتسر) میں چھپنے لگے۔

آپ نے ہم عمر لڑکوں کو ساتھ لے کر ایک چھوٹا سا کلب قائم کر لیا تھا، جس کا نام فرینڈز کلب تھا۔ اس کے ہفتہ وار جلسے ہوتے تھے۔ اس کلب میں اپنے مقالے پڑھکر سناتے تھے۔ اپنی اسکول کی لائبریری سے کتابیں لا لا کر پڑھنے کا شوق تو انھیں بے حد تھا۔ نیز گاؤں کی لائبریری سے بھی استفادہ کرتے تھے۔

۱۹۰۸ء میں مستقل طور پر لکھنؤ آگئے اور کالج میں پڑھنے لگے۔ یہاں کتب بینی و رسائل بینی وسیع پیانے پر شروع کر دی۔ لکھنؤ کی بڑی بڑی لائبریریوں کے چکر متواتر اور کثرت سے ہونے لگے۔ لائبریریوں میں اگر کبھی چھٹی ہوتی تو وہ دن آپ کو بہت کھلتا اور طبیعت دن بھر بہت بے چین سی رہتی۔ امرتسر سے "وکیل" نامی سہ روزہ نکلتا تھا۔ ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں اس میں دو لمبے مضامین لکھے ایک کا عنوان تھا "محمود غزنوی" اور دوسرے کا "غذائے انسانی"۔ بعد میں وکیل بکڈپو

کی طرف سے یہی مضامین کتابی شکل میں شائع ہوئے اور بہت مقبول ہوئے۔
۱۹۱۰ء میں لکھنؤ کے ماہنامہ الناظر میں مولانا شبلی کی۔ الکلام پر تنقیدی نظر کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جس کے بڑے چرچے اس زمانے میں رہے۔ پھر الناظر سے مستقل تعلق ہوگیا۔ برسوں تک اس میں مضامین شائع کراتے رہے۔ کچھ نام سے اور کچھ فرضی ناموں سے۔ الہ آباد سے ایک ماہنامہ ادیب کے نام سے نکلتا تھا۔ اس میں بھی ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء میں مضمون لکھتے رہے۔ الندوۃ لکھنؤ میں ایک مضمون انگریزی سے ترجمہ کرکے شائع کیا۔

تصانیف

کالج چھوڑنے کے بعد جب مستقل قیام لکھنؤ میں رہا اور لکھنؤ کو اپنا وطن بنالیا تو یہاں مضمون نگاری کا سلسلہ بڑی پابندی سے شروع کردیا۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مضمون لکھتے گئے۔ معارف میں مضامین تو شروع ہی سے نکلتے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں اس سے باقاعدہ ادارتی تعلق پیدا ہوگیا۔ جو ۱۹۲۳ء تک قائم رہا۔

مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد کی نگرانی ۱۹۲۸ء سے ان ہی کے ذمہ رہی۔ اس سے گہرا ادبی تعلق زمانۂ دراز تک قائم رہا۔ ۱۹۲۵ء سے اپنا ہفتہ وار "سچ" کے نام سے لکھنؤ سے نکالنا شروع کیا۔ پہلے ظفر الملک علوی صاحب شریک رہے۔ پھر ادارت مولانا نے اپنے ذمہ لے لی۔

اسی زمانہ میں ایک دوست کی فرمائش پر جدید تعلیم سے متعلق ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا۔ ایک رات میں متواتر چند گھنٹے بیٹھ کر اس کا مسودہ تیار کرلیا۔ رسالہ کا عنوان تھا "فرائض والدین" اور دوسرے رسالہ کا عنوان تھا۔۔۔ خادم تعلیم" ان دونوں کا نقدی معاوضہ بھی فوراً مل گیا۔ ادیب اور معارف کے معاوضے بھی حاصل ہوتے رہتے تھے۔ "فلسفۂ جذبات" اور "فلسفۂ اجتماع" اس دور کی تصنیفات ہیں۔ فلسفۂ اجتماع کو ناپسند کرکے بعد میں اپنی فہرست تصانیف سے خارج بھی کردیا۔ برکلے فلسفی کے مقالات کے ترجمے اور دارالمصنفین

اس عہد کی یادگار ہیں۔ لیکی کی "ہسٹری آف یوروپین مارلس" کا ترجمہ اخلاق یورپ کے نام سے دو جلدوں میں۔ اور بکل کا ہسٹری آف سولزیشن ان انگلینڈ "تاریخ تمدن انگلستان" کی تین جلدیں اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ یہی ترجمہ کر کے کتابیں شائع کرنا آپ کی آمدنی کا ذریعہ بنا رہا۔ ۱۹۱۵ء میں ایک ڈرامہ "زود پشیماں" کے نام سے "الناظر" کی طرف سے شائع کیا۔ اس کا ابتدائی مسودہ کانپور سے بمبئی تک ریل کے سفر میں تیار کر لیا تھا۔

حیدرآباد میں جب یکم ستمبر ۱۹۱۷ء سے اخیر جولائی ۱۹۱۸ء تک رہے تو یہاں ایک خاصی ضخیم کتاب منطق پر تیار کر لی "نام تھا" ایک پرانی کتاب پر نظر ثانی کا "لیکن نظر ثانی ہی میں گویا وہ ایک نئی کتاب ہی بن گئی۔ اسی قیام حیدرآباد میں ایک تاریخ یورپ کا ترجمہ بھی مکمل کر لیا۔ یہ دونوں کتابیں سررشتہ تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئیں۔

اگست ۱۹۱۸ء میں مولانا محترم جب لکھنؤ واپس آئے تو مستقل تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے ایک چھوٹی سی کتاب "تحفۂ خسروی" کے نام سے چھپی۔ یہ قرآن۔ حدیث اور سعدی وغیرہ کے اقتباسات کا مجموعہ تھی شعر و ادب کے علاوہ تمام تر مغربی فلسفہ کے ماہرین کے افکار کا بغور مطالعہ کیا برطانوی فلسفی اسپنسر اور مل وغیرہ گویا نوک زبان تھے۔ ۱۹۱۸ء کے نصف آخر میں غیر مسلم فلسفہ و تصوف کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ ان ہندو فلسفہ، بدھشٹ فلسفہ۔ جین فلسفہ کی کتابیں انگریزی میں لکھی ہوئی خوب پڑھ ڈالیں۔ ہندو فلسفہ علاوہ گیتا کے انگریزی ترجمہ مسز بسنت تلک بھگوان داس۔ آربندو گھوس وغیرہ کے زیر مطالعہ رہے۔ ماہنامہ "صبح امید" لکھنؤ میں مضمون نگاری اسی رنگ کی شروع کی۔ اور پھر مثنوی روم کے مطالعہ نے ذوق تصوف پر مہر لگا دی۔ اور مولانا شبلی کی "سیرت النبی" جلد اول بھی اس میں بڑی معین ثابت ہوئی۔ یہاں سے طبیعت، رجحانات اور تحریر کے موضوعات میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی۔

نفسیات مغربی کا غیر مُضر اور صالح حصہ اب بھی قلم کا موضوع رہا۔ "مبادئ فلسفہ" یا فلسفہ کی پہلی کتاب اور مبادی فلسفہ کی دوسری کتاب اور "ہم آپ" سب اسی رنگ میں لکھیں۔ چھوٹے چھوٹے مقالے رامپور۔ پشاور اور علیگڈھ میں پڑھے تھے۔ وہ بھی رسالوں کی شکل میں شائع ہوئے۔ قصص رسائل۔ تمدن اسلام کا پیام۔ تمدن اسلام کی کہانی۔ جدید قصص الانبیاء وغیرہ بھی لکھیں۔
قرآن کریم کا انگریزی اور اردو میں ترجمہ کرنے کا نیک ولولہ دل میں پیدا ہوا۔ چھ سات سال کی مدت میں اس کارِ عظیم کی تکمیل فرمائی۔ تاج کمپنی لاہور نے اس کا کاپی رائٹ خریدا۔ اردو تفسیر کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن شائع ہوئے۔ مطالعۂ قرآنی کے نتیجہ میں چھوٹے بڑے کئی رسالے تحریر فرمائے۔
۱۹۵۸ء میں افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرنولی مرحوم نے مدراس میں مدعو کیا۔ وہاں قرآنی موضوع پر چھ لکچر دیئے۔ جن کا موضوع نہایت اچھوتا ہے۔ یعنی "سیرت نبوی قرآن سے"۔ اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔
"بشریت انبیاء" کے نام سے ایک کتاب اسی زمانے میں تیار ہوگئی۔ اس کا موضوع بھی بڑا اچھوتا اور جدید دلچسپ ہے۔ پھر دوسری مرتبہ مدراس ہی کے لئے "مشکلات قرآنی" کے موضوع پر لکچر تیار کئے۔ اس کا دوسرا عنوان ہے "قرآنی مطالعہ بیسوی صدی میں"... علاوہ ازیں "تفسیر ماجدی" آپ کا زبردست کارنامہ ہے۔ جو ہزاروں بندگانِ حق کی قرآنی ذوق مطالعہ کی تسکین میں مدد کرتا رہتا ہے۔

ادبی و علمی تصنیفات

مذہبی تحریروں کے دور میں ادبی و شعری ذوق بھی قائم رکھا۔ حضرت مولانا موصوف کو اکبر الٰہ آبادی سے خاص عقیدت تھی۔ ان پر کئی مضمون اور مضمونچے لکھے۔ جو اکبر نامہ کے نام سے شائع ہوئے۔ اسی طرح "انشائے ماجد" جلد اول اور جلد دوم الله

"نشریات ماجد" جلد اول کے نام سے بلند پایہ ادبی تصانیف پیش فرمائیں۔
شخصیات میں آپ کو حضرت تھانوی اور مولانا محمد علی سے خاص عقیدت
رہی ہے۔ لہٰذا ان دونوں بزرگوں کے کردار اور کارناموں سے متعلق
حکیم الامت" اور مولانا محمد علی ذاتی ڈائری" کے نام سے دو کتابیں تحریر
فرمائیں۔

مولانا موصوف کی ایمان و عقیدہ کی دنیا میں بار بار تبدیلیاں ہوئیں
بچپن اور شروع جوانی میں سخت مذہبی رہے۔ عمر کے تیرھویں سال سے اسلامیت
میں ضعف پیدا ہونے لگا۔ انگریزی کتابوں کے مطالعہ نے برگشتہ کردیا۔
یہ کتابیں ایسی تھیں جن سے براہ راست اسلام پر حملے کئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ
انگریزی کی ایسی کتابیں جو نفسیات کے متعلق تھیں زیر مطالعہ رہیں۔ تو ان کی وجہ سے
وحی اور مذہب کے پرانے تصورات کی مخالفت کا خیال پیدا ہوگیا۔ اسراف حظ نفس
شہوت رانی وغیرہ کی حمایت کرکے ان کی تبلیغ اور ان کی حوصلہ افزائی کا حق ادا کردیا۔
ان تمام کا ماحصل یہ نتیجہ ہوا کہ طبیعت اسلام کی طرف سے برگشتہ ہوگئی۔ اور نفس پر
الحاد اور ارتداد کا جادو چل گیا۔ لندن کی ریشنلسٹ ایسوسی ایشن کے ممبر بھی بن گئے
اور اپنے آپ کو کھلم کھلا ریشنلسٹ (عقلیت پسند) یا اگناسٹک (لا ادری) کہنے لگے
مگر اتنا غنیمت رہا کہ سوشل حیثیت سے مسلمان رہے۔ اور مسلمانوں سے میل جول
قائم رکھا۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء تک یعنی سترھویں سال سے لیکر ستائیسویں
سال تک یہی انداز فکر اور یہی دور الحاد قائم رکھا۔ پھر ۔ ۔ ۔

ع کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے۔

مغرب کی ٹھیٹ مادیت پرستی کے خلاف رجحان پیدا ہوا۔ اور روحانیت کے
نام سے چڑھ اور بیزاری نہ رہی۔ دو سال کے اندر اندر ایمان اور اسلام کی
طرف دوبارہ مراجعت شروع کردی۔ اور ۱۹۲۰ء میں تو گویا مرتد سے مسلمان ہوگئے۔
اس دور ظلمت سے دور ہدایت تک پہنچنے میں جن حضرات سے مدد ملی

ان میں امتیازی درجہ اردو کے مشہور اصلاحی و مزاحیہ شاعر حضرت اکبر الہ آبادی کا ہے ۔ اکبر بڑے حکیم و عارف تھے ۔ حیلے بہانوں سے مولانا کو رشد و ہدایت کی طرف لاتے رہے ۔ دوسرا رہبر مولانا محمد علی تھے ۔ ان سے آپ کو والہانہ عشق تھا مولانا محمد علی نے ہر طرح ڈانٹ ڈپٹ کر کے آخر مولانا ماجد کی اصلاح کر ہی دی۔ ان کے علاوہ مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کی خدمت میں آپ کی رسائی ہوئی ۔ اور آپ کی محبت بابرکت نے تو گویا انھیں از سر نو مشرف باسلام کرا دیا ۔

الحاد سے ایمان تک کا یہ سفر مولانا کی زندگی میں خاص اہمیت کا حامل ہے ۔ آپ زندگی بھر اپنے ملحدانہ خیالات پر نادم رہے ۔ اور توبہ فرماتے رہے ۔ اسی لئے اپنے کتبۂ تربت کے بارے میں آپ کی مخلصانہ وصیت ہے کہ کتبۂ قبر پر یہی لکھا جائے ...

"ایک گنہگار کا مدفن جو تائب ہو کر مرا"

سیاسی کردار

مولانا موصوف ملکی سیاست کے بکھیڑوں میں کبھی نہیں پڑے ۔ البتہ جب مولانا محمد علی کا مشہور اخبار "کامریڈ" نکلا تو اس کا حرف حرف پڑھ لیا کرتے تھے ۔ اس لئے مسلمانان عالم کی سیاست اور ترکی ۔ بلقان اور عام اسلامی سیاست سے دلچسپی لینے لگے ۔ اور جب ۱۹۱۶ء میں مسز اینی بسنٹ یک بیک نظر بند ہوئیں ۔ تو ان کی ذات کی عقیدت کی بنا پر انھیں بڑا صدمہ ہوا ۔ ان کے دل کو دھچکا سا لگا ۔ ہوم رول اور کانگریس کے قیام اور تحریک آزادی کو اچھا سمجھنے لگے ۔ پھر گاندھی جی کی تحریک ترک موالات (نان کاپریشن) اٹھی تو آپ عملی طور پر اس کے عنصر دار بن گئے ۔ اسی زمانہ میں ماڈرن ریویو کلکتہ میں مضمون "ستیہ گرہ اور اسلام" کے عنوان سے لکھا ۔ اور جب علی برادران گرفتار ہو کر کراچی کے مقدمہ میں سزایاب ہوئے ۔ تب سے تو تحریک خلافت کے بے داموں کے غلام سے بن گئے ۔ مرکزی خلافت کمیٹی اور پھر اس کی ورکنگ کمیٹی کے برسوں ممبر رہے ۔ ادھر خلافت کمیٹی کے صدر کئی سال تک رہے ۔ ۲۶ء میں لکھنؤ میں خلافت کانفرنس کا جو اجلاس ہوا ۔ اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر

اوراس میں خوب ولولہ انگیز ایڈریس پڑھا۔ لوگوں نے اس کی بہت تعریف کی۔
اولین دور میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے ہمدردی رہی لیکن بس
دور دور کی۔ عملی طور پر نمایاں حصہ نہ لیا۔ لیکن جب مولانا محمد علی کا انتقال
ہوگیا۔ تو سیاست سے بالکل قطع تعلق کرلیا۔ گاندھی جی کی تحریکوں اور ان کے
جذبات ابھارنے والے پروگراموں سے ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے۔ ان کی
دوراندیشی، تدبر۔ اور اخلاص کے بے حد مداح رہے زندگی بھر رہے مہاتما جی
کی بے وقت اور بے دردانہ وسفاکانہ موت کو براعظم ہند اور مسلمانان ہند کے لئے
المناک سانحہ تصور کرتے تھے۔ سوفی صدی عقیدت جانباز ملت مولانا محمد علی
جوہر سے رکھتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد خلافت کمیٹی سے الگ ہوگئے۔ ان
کے بعد مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی عزت واقعتہً دل میں قائم ہوئی۔
البتہ پھر ہندوستان کی خیر خواہی اور آزادی کے استحکام کے لئے اپنے زور قلم کو
صرف کرتے رہے۔

چونکہ ذریعۂ معاش یا روزگار کا کوئی مستقل وسیلہ نہ تھا

ذرائع آمدنی اس لئے مالی اعتبار سے خوشحال کبھی نہ رہے۔ بعض دور
تو بڑی تنگدستی و تنگ حالی کے بھی گذرے۔ لیکن گھر کا کاروبار چلانے اور خاندان
کے دیگر اخراجات کی کفالت کے لئے ان کے بڑے بھائی مستقل مدد کرتے رہے
عقیدت مند اور مخلصین کی طرف سے بھی ہدیے اور نذرانے ملتے رہے۔
حیدرآباد حکومت کی طرف سے علمی پنشن ۲۰۰ روپیہ ماہوار مقرر ہوئی تھی۔
پولس ایکشن کے حالات کے نتیجے میں یہ پنشن بند ہوگئی۔ تو مولانا ابوالکلام
آزاد اور پنڈت جواہرلال نہرو کی کوششوں سے اور علمی دلچسپی و تحریک سے
دوبارہ پنشن جاری ہوئی مگر ۱۲۵ روپیہ ماہوار پر آگئی۔ ۱۹۶۲ء میں سرکار
ہند نے ان کی خدمات علم و ادب کا اعتراف کرتے ہوئے ایک عربی اسکالر
کی حیثیت سے ماہانہ پنشن مقرر کردی آخر میں یہ رقم ۴ ہزار روپیہ سالانہ تک پہنچ گئی۔

حکومت اترپردیش کی طرف سے بھی تین سو روپیہ ماہوار پنشن ملتی رہی کچھ آمدنی کتابوں اور ہفتہ وار "صدق جدید" کی وجہ سے ہو جاتی تھی ایک مرتبہ ایک مخلص قدرداں اور عقیدتمند نے بغیر نام معلوم کئے ہزاروں کی مدد کی۔ سورت اور ملایا کے تاجروں نے بھی کئی ہزار کی مدد کی۔ اس کے علاوہ خطبات مدراس اور دیگر علمی کارناموں کی بنا پر اچھی خاصی مالی اعانت کی صورت پیدا ہو گئی۔

کردار پر اثر انداز ہونے والی شخصیتیں

مولانا محترم کو ابتدائے عمر میں پڑھنے کا شوق مولانا شبلی کی شخصیت اور علمی کارناموں کے مطالعہ سے پیدا ہوا تھا۔ آپ نے شبلی سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اور انھیں اولین استاد تصور کرنے لگے تھے۔ بعد میں زبان کی حد تک بڑی مدد مرزا محمد ھادی رسوا لکھنوی سے اور کسی حد تک شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی سے ملی۔ علمی استعداد میں اضافہ اور قلم کی روانی کے لئے کئی اہل قلم اور اہل علم سے خوشہ چینی کی۔ مولانا محمد علی سے آپ نے بیباک انداز صحافت نگاری حاصل کیا۔ اور صدق جدید میں حقیقت کی گل پاشیاں کرتے رہے۔

اُسلوبِ نگارش اور علمی و ادبی خدمات

۱۹۲۵ء میں آپ نے "سچ" کی شان ادارت سنبھالی اور ۱۹۷۱ء تک یعنی پینتالیس برسوں میں اسی ہفتہ وار "سچ" میں باقاعدگی کے ساتھ لکھتے رہے۔ میں ان کے قلم سے جو مواد شائع ہوا ہے وہ علمی و ادبی افادیت کے اعتبار

سے بے حد اہم ہے۔ اس تمام مواد کو اگر یک جا طور پر منضبط کر کے شائع کیا جائے تو اردو زبان و ادب کے لئے بیش قیمت سرمایہ اکٹھا ہو جائے۔ ان پینتالیس برسوں میں مولانا کے قلم کا زور اور تحریر کی دھار نیز انداز تنقید کی کاٹ میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ ان کا لہجہ زندگی بھر حیرت ناک طور پر یکساں رہا۔ اور ہموار رہا۔ اس میں کبھی پستی اور بلندی کا فرق پیدا نہیں ہوا۔ وہ اردو میں ایک خاص طرز کے موجد اور لہجہ کے ایک خاص اسلوب کے مخترع ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے فقرے غضب کی بلاغت۔ اور مضمون آفرینی۔ ضبط و توازن۔ ایجاز و اعجاز سے بھرپور رہتے تھے ان فقروں میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو کامیاب اشعار کے لئے لازمی قرار دی گئی ہیں۔ لیکن خوبی تو یہی ہے کہ ان تمام خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی یہ فقرے اشعار نہیں بن پائے۔ نثر کا ہی حسین و پرتاثیر اسلوب بنے رہے۔

مولانا ماجد کی تحریر کا کمال تو یہی ہے کہ ان کے اسلوب میں اردو کا کوئی بھی صاحب اسلوب انشاء پرداز ان کا شریک، ہمسر، نظیر اور مماثل نہیں۔ فلسفۂ اخلاق کی پیچیدہ تہوں سے لیکر قرآن کریم کے جاں بخش اسرار و رموز کی گہرائیوں تک انھوں نے اپنے ذہن اور اشہب قلم کو دوڑایا ہے۔ وہ تمام عمر تحریر و تصنیف میں مصروف رہے۔

ڈرامہ نگاری۔ افسانہ نگاری۔ شعر و شاعری۔ انشاء پردازی اور ادب و صحافت کے ہر ایک موضوع کو ان کے بیباک قلم نے چھیڑا اور چھوا ہے۔ انھوں نے تحریر کے ہر کوچے کی خاک چھانی ہے۔ اور خوب تجربہ حاصل کیا ہے وہ دین سے لے کر بے دینی تک سے آشنا رہے۔ ساری کوچہ گردیوں اور بادیہ پیمائیوں کے بعد وہ اپنے ذہن و دماغ۔ قلب و خیالات کی پوری صحت اور صلاحیت کے ساتھ اسلامیات کے ساحل پر اتر پڑے۔ اور حضرت مولانا شبلی کی طرح انھوں نے آخر عمر تک اپنی طبیعت اور زور قلم کی جولان گاہ اسلامی تعلیمات کی تبلیغ اور دینی خدمات کو قرار دیا۔ اور انھی میں تادم آخر مصروف

ومنہمک رہے۔ مولانا شبلی نے سیرۃ النبی کی تصنیف وتالیف کے مشغلہ کا منتہا قرار دے لیا تھا۔ مگر مولانا ماجد تفسیر ماجدی جیسی عہد آفریں تالیف کے بعد بھی بدستور خدمت علم وادب میں غرق رہے۔

ایک بڑے اہل قلم اور عظیم شخصیت کے ناطے مولانا عبدالماجد دریابادی کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ذوق جستجو، علمی انکسار، حقیقت کی تلاش اور اسے تسلیم کرنے پر ہمہ وقت آمادگی۔ فکری نتائج کا تجزیہ، حسن وقبح کی چھان پھٹک اور اصلاح وترمیم کے لئے ہمیشہ تیار رہنا۔ یہ ایسی خصوصیات ہیں جو انھیں بہت سے اہل قلم اور مفکرین سے ممتاز کرتی ہیں۔ وہ ادب اور صحافت پر اخلاق وضمیر کی روشنی ہر حال میں قائم رکھنے کے نہ صرف خواہشمند تھے۔ بلکہ انھوں نے اس کے تحفظ اور بقا کے لئے بہت بڑے خطرات اور نقصانات کا مقابلہ بھی کیا ہے اور آزمائشوں کی دعوت بھی دی ہے۔ فکر وعمل، ادب اور صحافت، نیز دین اور تصوف کی الگ الگ دنیاؤں میں انھوں نے اخلاق کردار۔ ایمان اور صداقت کی مشعل کو کبھی بجھنے نہیں دیا ہے۔ وہ اپنے مشعل برداری کے فرض سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں رہے ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے بھی انھوں نے اس خدمت سے محروم ہونا گوارہ نہیں کیا ہے۔

وہ جب تک اس دنیائے فانی میں رہے اپنے تجربات اور رہنمائی سے اس نسل اور عہد کو مستفید فرماتے رہے۔ وہ بھلے کو آج ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن پھر بھی انہوں نے آنے والی نسلوں کے لئے اتنا کچھ چھوڑ دیا ہے کہ وہ کسی عہد یا کسی زمانے میں بھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ ان کی تصانیف اور تالیفات سے وہ درحقیقت لافانی بن گئے ہیں۔

مولانا کی مکمل فہرست تصانیف مولانا موصوف کی تصانیف کا سلسلہ بے حد طویل ہے۔ آپ نے گوناگوں موضوعات پر اپنی تصانیف وتالیفات پیش کر کے اردو

ادب کے دامن کو جوہر علم و ادب سے معمور کردیا ہے۔ ان کی تمام تر تصانیف و تراجم کا مکمل طور پر جائزہ لینے کے بعد ہی ان کی غیر معمولی عظمت کا احساس ہو سکتا ہے۔ ان کی تصانیف میں بعض ایسے مضامین کے مجموعے بھی شامل ہیں جو دوسرے ناشرین نے یا اداروں نے اپنے اپنے طور پر شائع کیا ہے۔ یہاں ایسی ہی تصانیف کا سرسری طور پر ذکر کیا جارہا ہے۔ جن کی تدوین و ترتیب میں اور جن کی اشاعت میں مولانا نے ذاتی طور پر حصّہ لیا ہے۔ آپ کی سب سے پہلی تصانیف وہ دو مضامین ہیں۔ جو آپ کے زمانۂ طالب علمی میں یا ایف۔ اے کی تعلیم کے دوران میں اس وقت کے کثیر الاشاعت اردو روزنامہ "وکیل" امرتسر میں چھپوائے تھے۔ اور بعد میں اسی اخبار کے ادارے کی جانب سے انھیں چھوٹے سائز کی کتابی شکل میں شائع کیا گیا تھا۔ اور پہلے پہل اسی ادارہ نے ان کتابوں کے سرورق پران کے نام کے ساتھ "مولانا" کے لفظ کا اضافہ کیا تھا۔

(۱) "غذائے انسانی" اس رسالہ میں آریہ سماجی فرقہ کے اعتراضات جو گوشت خوری پر کئے گئے تھے۔ اس گوشت خوری کو مطابق فطرت انسانی ثابت کرنے کے لئے مدلل جواب دیئے گئے ہیں۔

(۲) محمود غزنوی۔ سلطان محمود غزنوی پر کئے جانے والے متعصّبانہ تاریخی اعتراضات کے مدلل جواب۔ جو سلمانوں کی تاریخ سے ابتدائی دلچسپی کا ثبوت ہیں۔

مولانا محترم نے اولاً ایک ایسے فلسفی منصف کی حیثیت سے شہرت حاصل کی جس نے فلسفہ جدید خصوصاً اس کی شاخ نفسیات کے مضامین کو اردو میں انتہائی انشا پردازانہ رنگ میں منتقل کیا۔ اس سلسلہ کی کتاب (۳) فلسفہ جذبات سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اسے انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا تھا۔ اس کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

(۴) فلسفۂ اجتماع۔ اس کتاب اس کے بعض الحادی اجزاء کے باعث مولانا نے جب ان کا دور الحاد ختم ہوا۔ اور وہ اسلام کے زبردست مبلغ بن گئے۔

تو اپنی تصانیف کے زمرہ سے خارج کر دیا۔ یہ کتاب بھی انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام چھپی ہے

(۵) سائیکولوجی آف لیڈر شپ "، یہ کتاب کم وبیش انھیں مضامین پر مشتمل تھی۔ جو اردو والی فلسفۂ اجتماع کے تھے۔ اسے انگلستان کے مشہور ناشر کتب فنزاں (لندن) نے اس زمانے میں شائع کیا جبکہ مولانا بہت نوعمر تھے۔

(۶) مکالمات برکلے " مشہور یورپین فلسفی برکلے کے ڈائیلاگس کا ترجمہ شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

(۷) فلسفیانہ مضامین " مولانا کے ان فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ جو رسالہ " الناظر" لکھنؤ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے۔ شائع کردہ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ کتابی شکل میں۔ ان کی تدوین رسالہ کے ایڈیٹر مولوی ظفر الملک مرحوم نے کی ہے۔

(۸) مبادیٔ فلسفہ اوّل فلسفہ کی پہلی کتاب۔ خود مولانا نے اپنے فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ پرانے شائع شدہ مضامین پر نظر ثانی کر کے شائع فرمایا ہے۔

(۹) مبادی فلسفہ دوم۔ فلسفہ کی دوسری کتاب کے عنوان سے اوّل الذکر مجموعہ کی اشاعت کے چند سال بعد شائع کرایا۔ اس میں الناظر والے مضامین کے علاوہ وہ فلسفیانہ مضامین بھی شامل ہیں۔ جو رسالہ ادیب " الہ آباد اور رسالہ معارف اعظم گڈھ وغیرہ میں نکلتے تھے۔ اردو میں یہ مضامین بالکل انوکھے اور نایاب قسم کے ہیں۔

(۱۰) فلسفہ اور اس کی تعلیم" مولانا کا ایک مضمون جو پہلے رسالہ الناظر (لکھنؤ) میں نکلا تھا۔ اسے الناظر بک ایجنسی نے کتابی شکل میں

(۱۱) ہم آپ " پاپولر سائیکولوجی پر مولانا نے بیش قیمت آخری تصنیف

جو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے زیراہتمام شائع ہوئی۔
(۱۲) "منطق"، یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل نصاب رہی تھی۔ اور سررشتۂ تالیف وترجمہ جامعہ عثمانیہ کے زیراہتمام شائع ہوئی تھی۔

تراجم مولانا نے اپنے زورِقلم اور قدرتی صلاحیتوں سے کام لےکر بعض دیگر زبانوں کی کتابوں کے ترجمے بھی اردو زبان میں کئے تھے۔ جو اپنی مثال آپ ہیں۔

(۱۳) "تاریخ اخلاق یورپ"، مشہور مؤرخ لیکی مشہور ومعروف کتاب ہسٹری آف دی یورپین مارلس کا ترجمہ انجمن ترقی اردو ھند کے زیراہتمام شائع ہوئی تھی۔
(۱۴) "تاریخ اخلاق یورپ دوم"، اس کتاب کے حصہ دوم کا ترجمہ ہے۔
(۱۵) "تاریخ تمدّن حصہ دوم"، بکل کی انگریزی کتاب کا ترجمہ منشی احمد علی کاکوروی انجمن ترقی اردو کے زیراہتمام کررہے تھے۔ حصہ اول مکمل کرچکے تھے۔ حصہ دوم کا ترجمہ نامکمل تھا کہ پیامِ اجل آگیا۔ دوسرے حصہ کے ایک بقیہ بڑے حصہ کا ترجمہ حضرت مولانا ماجد نے مکمل فرمایا۔
(۱۶) "تاریخ یورپ"، سررشتۂ تالیف وترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی شائع کردہ اس ضخیم کتاب کے بعض اجزاء کا ترجمہ مولانا نے کیا تھا۔
(۱۷) "پیامِ امن"۔ ایک فلسفی مصنف اور امن پسند ادیب میسویاں رچرڈ کی کتاب کا ترجمہ جو پہلی عالمگیر جنگ کے بعد جنگ کے خلاف اور اس کی تباہ کاریوں سے دنیا کو خبردار کرنے کے لئے لکھی گئی تھی۔ اردو ترجمہ میں مولانا نے اسلام اور امن وغیرہ کے تعلق سے چند نئے ابواب کا اضافہ بھی فرمایا ہے۔

تصوف مولانا موصوف نے تصوف کے موضوع پر بھی اظہارِ خیال فرمایا ہے

(۱۸) "تصوّفِ اسلام" مولانا مقبول ترین اس کتاب کے پانچ ایڈیشن شائع

ہو چکے ہیں۔ اسلامی تصوّف کی مختصر لیکن جامع تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۱۹) فیہ ما فیہ (فارسی) ملفوظات مولانا روم یہ کتاب بڑی نایاب تھی۔ متعدد قلمی نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کے بعد مع ایک پر معلومات مقدمہ کے مولانا نے اسے شائع کیا ہے۔ شائع کردہ "دارالمصنفین" اعظم گڑھ۔

سفرنامے

زندگی میں جتنے یادگار سفر کئے۔ مولانا نے ان کے حالات اپنے منفرد انداز میں قلمبند فرمائے ہیں۔

(۲۰) سفر حجاز ۱۹۲۹ء میں مولانا نے سفر حج کیا تھا۔ اس کی دلکش روداد اولاً ان کے ہفتہ وار "سچ" (لکھنؤ) میں بالاقساط چھپی۔ پھر وہ کتابی شکل میں شائع ہو کر بیحد مقبول ہوئی۔ اس کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

(۲۱) ڈھائی ہفتہ پاکستان میں "گورنر جنرل پاکستان ملک غلام محمد مرحوم کی دعوت پر مولانا نے ۱۹۵۵ء میں لاہور و کراچی کا سفر کیا تھا۔ یہ روداد سفر پہلے تو ہفتہ وار "صدق جدید" میں نکلی اور بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔

ادبی تصانیف

اپنے غیر معمولی ذوق ادب کی بنا پر مولانا موصوف نے بڑی دلکش ادبی تصانیف بھی پیش کی ہیں ان میں ....

(۲۲) زود پشیماں ایک ادبی ڈرامہ ہے جو مولانا نے ناظر کے فرضی نام سے تحریر فرمایا تھا۔ اب انہی کے مشورے سے اسے ان کی فہرست تصانیف سے خارج کر دیا گیا ہے۔

(۲۳) مثنوی بحرالمحبت۔ اردو کے مشہور غزل گو غلام ہمدانی مصحفی کی ایک نایاب کتاب مثنوی کو مولانا نے ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ

(۲۴) مقالات ماجد مولانا کے ادبی مضامین کا مجموعہ جو تاج آفس بمبئی سے شائع کیا۔ اس میں بے مثال ادبی رنگ اور اہمیت کے مضامین شامل ہیں۔

(۲۵) انشائے ماجد حصہ اوّل۔ ادبی مقالات جو نظر ثانی کے بعد شائع ہوئے۔

(۲۶) انشائے ماجد حصہ دوم۔ ادبی مقالات جنھیں نسیم بکڈپو نے شائع کیا۔

(۲۷) نشریات ماجد ۔ مولانا کی نشری تقریروں کا دل پذیر مجموعہ ۔

(۲۸) مضامین عبدالماجد ۔ اس میں ادبی و مذہبی دونوں قسم کے وہ مضامین شامل ہیں ۔ جو مولانا کے اخبارات سچ اور صدق میں نکلے تھے ۔ اسے حیدر آباد کے ادارۂ اشاعتِ اردو نے شائع کیا تھا ۔ اور اس کی ترتیب مولوی ڈاکٹر غلام دستگیر رشید حیدر آبادی نے کی تھی ۔

(۲۹) اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں ۔ لسان العصر حضرت اکبرالہ آبادی سے مولانا کو ہمیشہ خصوصی تعلق رہا ہے ۔ انھوں نے ان پر چھوٹے بڑے مضامین "پیامِ اکبر" "نیا آئین اکبری" وغیرہ کے عنوانات سے لکھے تھے ۔ ان اکبری مضامین کا یہ مکمل مجموعہ انور بکڈپو لکھنؤ ادارۂ فروغ اردو نے شائع کیا ۔

(۳۰) مکاتیب اکبر ۔ اکبرالہ آبادی کے وفات کے بعد ان کے خطوط بنام مولانا عبدالماجد دریابادی کا مجموعہ خواجہ حسن نظامی دہلوی نے شائع کرلیا تھا ۔ اس پر مولانا نے توضیحی حواشی لکھے تھے ۔

(۳۱) خطوطِ مشاہیر حصۂ اول ۔ اس میں مولانا کے علامہ شبلی کے خطوط (شبلی نامہ) اکبرالہ آبادی کے خطوط (اکبرنامہ) اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کے خطوط (جوہر نامہ) مع مولانا کے حواشی اور الگ الگ دیباچوں کے درج ہیں ۔ اس کا پہلا ایڈیشن تاج کمپنی لاہور و کراچی نے شائع کیا تھا ۔ اور دوسرا ایڈیشن نظرثانی اور جدید حواشی اور دیباچوں کے ساتھ نسیم بکڈپو لکھنؤ نے شائع کیا ہے ۔

(۳۲) مکتوبات سلیمانی حصۂ اول ۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے مکتوبات ۔

(۳۳) مکتوبات سلیمانی حصۂ دوم ۔ مولانا دریابادی کے نام ۔ جن میں مولانا نے بکثرت حواشی دے کر ان کی ادبی اہمیت و افادیت میں اضافہ فرما دیا ہے ۔ دونوں کے شروع میں ایک مفصل دیباچہ بھی شامل ہے ۔ انھیں صدق جدید بک ایجنسی نے شائع کیا ۔

تفسیر قرآن و متعلقات تفسیر

مولانا کا شاہکار درحقیقت قرآن کریم کی تفسیر ہے۔ جو تفسیر ماجدی کے نام سے شائع کی گئی ہے۔

(۳۴) تفسیر ماجدی (انگریزی) مولانا کا یہ معرکۃ الآرا انگریزی ترجمہ و تفسیر جو ان کی سالہا سال کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے تاج کمپنی کراچی و لاہور کے زیر اہتمام سات منزلوں میں الگ الگ چھپا ہے۔ اور دو حصوں میں بھی پندرہ پندرہ پاروں کے۔ ترجمہ کی زبان بائبل والی قدیم انگریزی ہے۔ لیکن حواشی ماڈرن انگریزی میں ہیں۔

(۳۵) ترجمۂ قرآن (انگریزی) بلاحواشی۔ تاج کمپنی کی فرمائش پر مولانا نے یہ ترجمہ بجائے بائبل کی انگریزی زبان کے جدید و مروّج انگریزی زبان میں کیا ہے

(۳۶) تفسیر ماجدی۔ ضخیم اردو تفسیر تاج کمپنی نے سات منزلوں میں شائع کی اور علیحدہ علیحدہ دو حصوں میں بھی۔ نیز ایک مکمل جلد میں بھی۔

(۳۷) تفسیر ماجدی دوسرا ایڈیشن۔ مولانا کی مکمل نظرثانی اور بہت کچھ ترمیم و اضافہ کے بعد شائع ہوا ہے۔ اس کے نتیجہ میں پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں بہت نمایاں فرق ہو گیا ہے۔ یہ صدق جدید بک ایجنسی کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے لیکن پہلی جلد سورہ فاتحہ سے ختم سورہ آل عمران تک ہے۔ اس کی ضخامت آٹھ سَو صفحات سے زائد ہے۔

(۳۸) جغرافیۂ قرآنی یا ارض القرآن۔ قرآن میں جن مقامات کے نام اور اشارے ہیں۔ ان کے متعلق ضروری معلومات بر ترتیب حروف تہجی شائع کردہ صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ۔

(۳۹) حیوانات قرآنی یا الحیوانات فی القرآن۔ قرآن میں جن حیوانات کا ذکر آیا ہے۔

ان کے ادوار ان کے متعلقات ۔ مثلاً دودھ ۔ جلد ۔ ناخن وغیرہ کے بارے میں ذخیرۂ معلومات بر ترتیب حروف تہجیؔ ۔ جو ہر لحاظ سے بڑی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

(۴۰) قرآن یا اعلام ۔ قرآن پاک میں جو آئے ہیں۔ یا جن کا اشارہ ملتا ہے ۔ ان سے متعلق معلومات بر ترتیب لغات ۔

(۴۱) جدید قصص الانبیاء کے دو باب ۔ مولانا کا وہ لیکچر جو اسلامیہ کالج پشاور میں ہوا تھا ۔ اور لبعد میں وہیں سے ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا تھا ۔

(۴۲) قصص و مسائل ۔ قصص الانبیاء والا مضمون کے قدیم علم کلام کے مسائل جدید روشنی میں واضح کئے گئے ہیں ۔ یہ مضمون رضا اکیڈمی رام پور میں پڑھا گیا تھا اور اسے پہلے نفیس اکاڈمی حیدر آباد نے پھر صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ نے شائع کیا۔

(۴۳) بشریت انبیاء ۔ یہ کتاب بھی تمام تر آیات قرآنی ہی سے مستفادہ ماخوذ ہے اور اپنے موضوع پر بالکل منفرد ۔ شائع کردہ صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ۔

(۴۴) خطبات ماجدی یا سیرت نبوی قرآنی ۔ مولانا کے ان لکچروں کا مجموعہ ہے جو مدراس میں دیئے گئے تھے ۔ یہ کتاب خطبات ماجدی کے نام سے صدق جدید بک ایجنسی نے شائع کی اور پھر یہی کتاب لمبی چوڑی تقطیع پر سیرت نبوی قرآنی کے نام سے مدراس کی ایک انجمن نے شائع کی ہے ۔ اول الذکر میں ایک **مفصل** دیباچہ اور افتتاحیہ کا اضافہ ہے

حدیث و ادعیہ احادیث نبوی کے تعلق سے مولانا نے اپنے مخصوص طرز نگارش میں کافی تفصیلی مضامین لکھے ہیں ۔

(۴۵) ترجمہ و شرح مناجات **مقبول** تھانوی ؒ ۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی مرتب کردہ مناجات مقبول کی شرح اس کے تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

(۴۶) شرح چہل حدیث ولی اللہی ۔ تعلیم مبین ۔ شائع کردہ بک ایجنسی لکھنؤ ۔

سوانح وخاکہ نگاری مولانا نے چند عظیم وبرگزیدہ شخصیتوں کے سوانح حیات اوران کے اخلاق۔ کردار، مزاج ومشاغل کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔

(۴۷) حکیم الامت۔ نقوش وتاثرات۔ مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کی ضخیم سوانح حیات اوران کی زندگی کے آخری اٹھارہ سال کے احوال پرمشتمل اولاً اس کے اجزاء اخبار "صدق" میں قسط وار نکلے۔ بعد میں کتابی شکل میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئے۔ دوسرا ایڈیشن لاہور سے شائع ہوا۔

(۴۸) محمد علی۔ مولانا محمد علی جوہر پر سلسلۂ مضامین اخبار سچ لکھنؤ میں نکلنا شروع ہوا تھا لیکن مکمل نہ ہو پایا تھا۔ اس نامکمل سلسلۂ مضامین کو ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد نے کتابی شکل میں محمد علی کے نام سے شائع کیا۔

(۴۹) محمد علی کی ذاتی ڈائری حصۂ اوّل۔ مولانا نے محمد علی کے تعلق سے ضروری

(۵۰) محمد علی کی ذاتی ڈائری حصہ دوم۔ معلومات ڈائری کے انداز میں شائع فرمائے۔ شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

مجموعۂ مضامین مولانا کے علمی وادبی متفرق مضامین کی تعداد بے شمار ہے۔ ان میں سے منتخب قسم کے مضامین الگ الگ عنوانات کے تحت کتابی شکل میں شائع کئے گئے ہیں۔

(۵۱) مُردوں کی مسیحائی۔ مولانا کے وہ مضامین جو سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر سچ لکھنؤ میں نکلے تھے۔ ان کا مجموعہ ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد نے شائع کیا۔

(۵۲) سچی باتیں۔ اخبار سچ اور صدق میں نکلنے والی سچی باتیں کا مرتبہ حکیم محی الدین بلال ملگنڈہ دکن

(۵۳) صابر رسولؐ ۔ مولانا کا ایک سیرتی مضمون جو حیدرآباد سے شائع ہوا
(۵۴) یتیم کی جنت ۔ ایک مضمون جو تحریک سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور کے ناظم قاضی عبدالمجید قریشی مرحوم نے شائع فرمایا ۔
(۵۵) یتیم کا راج ۔ یہ بھی سیرت کا ایک مضمون ہے جو سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور سے کتابی شکل میں شائع ہوا ہے ۔
(۵۶) تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام ۔ مولانا کا ایک لکچر جس کا انجمن اسلامی تمدن مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی جانب سے انتظام کیا گیا تھا ۔
(۵۷) تمدن اسلام کی کہانی ۔ مولانا کا دوسرا لکچر جو علیگڈھ کی انجمن اسلامی تمدن میں دیا گیا تھا ۔

متفرق ۔ ان تمام کے علاوہ مولانا کی نگارشات کچھ ایسی بھی ہیں جو مختلف موقعوں پر مختلف ضرورتوں کے پیش نظر وجود میں آئی ہیں انھیں الگ الگ رسالوں یا کتابی شکلوں میں شائع کیا گیا ہے ۔
(۵۸) تحفۂ خسروی ۔ راعی اور رعایا کے تعلقات سے متعلق فارسی کتب اخلاق سے ماخوذ ۔ شائع کردہ اودھ بک ایجنسی لکھنؤ ۔
(۵۹) فرائض والدین ۔ خادم تعلیم کے فرضی نام سے بڑی نصیحت آموز و مفید ۔ شائع کردہ نولکشور بکڈپو لکھنؤ ۔
(۶۰) مشاہیر سائنس ۔ میکمیلن کمپنی کلکتہ کی شائع کردہ انگریزی کتاب کا ترجمہ
(۶۱) مشکلات قرآن ۔ مولانا کے تازہ قرآنی لکچر جو مدراس میں دئے گئے تھے ۔
(۶۲) خطبۂ صدارت استقبالیہ ۔ آل انڈیا خلافت کانفرنس لکھنؤ ۱۹۲۶ء کے اجلاس کے موقعہ پر دیا گیا ایک خطبہ ۔
(۶۳) نورانی جیبی ۔ مرتبہ مولوی محی الدین منیری اس میں مولانا کا تحریر کردہ خطبۂ نکاح شامل ہے ۔
(۶۴) معاصرین ۔ مسوّدہ ہے ان خاکوں کا جو مولانا نے مختلف ناموروں اور

متعلقہ ہستیوں کے بارے میں تحریر فرمائے ہیں۔ یہ خاکے صدق جدید میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

تصانیف اور اسلوب تحریر کے نمونے

مولانا عبدالماجد نے زمانۂ طالب علمی ہی سے اخبارات اور رسائل میں مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس مضمون نگاری کے بعد تصنیف و تالیف اور ترجموں کا سلسلہ بھی جلد شروع کر دیا۔ اور پھر تاحیات مشغلۂ تحریر جاری رکھا۔ ان کی تصانیف اور مضامین کا ذخیرہ ہزاروں صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ مضامین مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔ اس لئے "انشائے ماجد" مختلف ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ یہاں ہر دور کے منتخب نمونے پیش کر کے ان کی انشاء پردازی اور اسلوب تحریر پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

فلسفیانہ تحریریں

مولانا ماجد جس زمانے میں مسٹر عبدالماجد کہلاتے تھے۔ وہ اپنی فلسفیانہ تحریروں کے لئے مشہور رہے۔ اس دور میں سب سے مشہور و مقبول کتاب "فلسفۂ جذبات" انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی۔ اس کے دو اقتباسات درج ذیل ہیں۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۳ء میں نکلا تھا۔ یہ اقتباسات طبع ثانی ۱۹۲۰ء سے ماخوذ ہیں

" نپولین اعظم جب پہلی مرتبہ گرفتار ہو کر جزیرۂ 'البا' میں نظربند کیا گیا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد موقع پا کر وہاں سے مفرور ہوا تو اس کے ہمراہ اس کے قدیم سپاہیوں کی ایک مختصر جماعت تھی۔ جو نہ بلحاظ کثرت تعداد، نہ بلحاظ آلات جنگ، نہ بلحاظ

سلطان رسیدہ فیوز اس قابل تھی کہ کسی قوی حریف کا مقابلہ کرسکے
مگر اس باہمت معزول تاجدار نے اس کی مدد سے ملک فرانس بلکہ
تمام یورپ کے علی الرغم اپنے سابق تخت پر دوبارہ قابض ہوتا
جارہا ہے پہلے ہی معرکہ میں بیس ہزار تازہ دم جوانوں کا سامنا
کرنا پڑا۔موقع ایسا نازک تھا کہ ذاتی شجاعت و تہور کا اظہار
قطعاً بے سود تھا۔کوئی دوسرا جنرل ہوتا تو بدحواس ہو جاتا لیکن
نپولین کی عملی نفسیات ذاتی کی داد دینی چاہیئے۔کہ جس وقت
دونوں فریق صف آرا ہو گئے تو وہ تن تنہا اور بالکل غیر مسلح
اپنی جماعت سے نکلا اور اس حالت سے بکمال اطمینان
فریق مخالف کی صفوں کے سامنے کھڑا ہوا۔کوٹ کے بوتام
کھول کر اپنے سینے کو برہنہ کر دیا۔اور ایک پر اثر لہجہ میں
اپنے مخالف سپاہیوں سے جن میں سے اکثر ایک زمانے میں
اس کے ماتحت رہ چکے تھے۔خطاب کرکے للکارا کہ .... تم
سے کون وہ سپاہی ہے۔جو اپنے باپ کے عریاں سینے پر "فیر"
کرنے کو تیار ہے۔اس آواز کا اثر معجزانہ تھا۔کوئی نہیں
کوئی نہیں۔کی صدا بلند ہوئی۔اور اقرار لسانی کی شہادت
زبان عمل نے دی کہ معاً تمام سپاہی اپنی جماعت کو چھوڑ کر
نپولین کے زیر علم آ گئے۔نپولین جماعات کے اس خاصۂ
نفسی سے واقف تھا۔کہ ان کو مسحور و مسخر کرنے کا راز تین
چیزوں میں شامل ہے۔(۱) سطوت ذاتی (جس کا نپولین
بہت بڑا حصہ دار تھا) (۲) بلند آواز۔اور (۳) بلند لہجہ۔

(مقدمہ کتاب صفحہ ۱۶-۱۷)

دوسرا اقتباس اس فلسفۂ جذبات، اصل کتاب کا:۔

"ایک اور وجہ متمدن افراد کے زیادہ متاثر ہونے کی یہ ہے کہ چونکہ ان میں عقل دور اندیشی اور پیش بینی زیادہ ہوتی ہے اس لئے بہ نسبت وحشیوں کے وہ نتائج افعال کا اندازہ ان کے وقوع سے بہت پیشتر کر لیتے ہیں اور اس بناء پر بالکل قدرتی ہے کہ وقوع واقعات سے بہت پیشتر وہ ان کے نتائج کا اندازہ کر کے انبساط و انقباض سے متاثر ہونے لگیں۔ ایک بکری ذبح کرنے کے لئے خرید کی جاتی ہے۔ مگر چونکہ وہ اپنی نسبت سے ناواقف ہوتی ہے۔ لیکن ذبح کے وقت تک اسے کوئی غم نہیں ہوتا۔ بخلاف انسان کے اس کی یہ حالت ہے کہ جس وقت سے اسے پھانسی کا حکم سنا دیا جاتا ہے۔ وہ اسی وقت سے گھلنے لگتا ہے۔ اور اس طرح انسان جوں جوں علم اور عقل میں ترقی کرتا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اپنے آرام ولذات دونوں کے اسباب بڑھاتا جاتا ہے۔ اور اکثر حالات میں اصل واقعات غم و مسرّت سے زیادہ ان دونوں چیزوں کا تصور روح فرسا یا خوش آئند ہوتا ہے۔ پھر انسان کی محض عقل یا پیش بینی ہی نہیں بلکہ اس کی تمدن زائیدہ صناعیاں و دستکاریاں۔ ریل۔ تار۔ جہاز۔ ہوائی جہاز اور آلات حرب جہاں ایک طرف اس کے اسباب راحت و مسرّت میں اضافہ کرتے ہیں وہاں دوسری طرف اس کی تکلیف و بربادی کے سامان بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔" فلسفۂ جذبات ۴۲۔ ۴۳

نمونہ تراجم

مولانا نے بعض اہم انگریزی کتابوں کا ترجمہ بڑی سلیس اردو میں کیا ہے۔ جن میں "تاریخ اخلاق یورپ" (دو جلد) کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی اس کے علاوہ "مکالمات برکلے" "پیام امن" اور "تاریخ تمدن" (حصہ دو) اور منطق بھی اسی فہرست تراجم میں شامل ہیں۔

"تاریخ تمدن" سرہنری بکل کی مشہور عام تصنیف ہسٹری آف سولیزیشن کا ترجمہ ہے۔ جو دو جلدوں میں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہے۔ کتاب کا بڑا حصہ منشی احمد علی مرحوم بی۔ اے کاکوروی کا ترجمہ کردہ ہے ان کی وفات کے بعد حصہ دوم کے صفحہ ۱۵ سے ۲۰۲ تک ترجمہ مولوی عبدالماجد کا کیا ہوا ہے۔ یہ حصہ ۱۹۱۹ء میں علیگڈھ میں چھپا۔ اس کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

" حقیقت یہ ہے کہ بغیر برک کے تذکرے کے جارج سوم کے عہد کی تاریخ سرسری طور پر بھی مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ یہ عجیب و غریب شخص نہ صرف سیاست کے اصول و فروع پر حاوی تھا بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ جملہ علوم و فنون کا ایک زندہ دائرۃ المعارف تھا۔ اس کے بڑے بڑے نامور معاصرین اس کے کمالات کی جامعیت کے قائل تھے۔ اور ہمیں تو رابرٹ ہال کا یہ قول حرف بحرف سچ معلوم ہوتا ہے۔

" برک کے کمالات لاتعداد تھے اس کا دماغ عامۃ الورود تھا۔ اور وہ ہر علم و فن سے بہرہ رکھتا تھا۔ "قانون اور فنون لطیف بظاہر باہم متناقض نظر آتے ہیں۔ لیکن برک کی ذات ان دونوں کی جامع تھی۔ چنانچہ جہاں ایک طرف وکلاء و مقننین کی جماعت اسے اپنا پیرومرشد مانتی ہے۔ وہاں دوسری طرف اہل قناعت بھی اسے اپنا ہادی اور رہبر تسلیم کرتے ہیں۔ تاریخ و علم الالسنہ کو ہم بالکل جدید [illegible] ہیں لیکن برک ان علوم میں امام کا درجہ رکھتا ہے۔

[illegible] اقتصادیات کا آدم ہم اپنے خیال میں آدم اسمتھ کو سمجھے ہوئے ہیں حالانکہ [illegible] اسمتھ کو اعتراف ہے کہ وہ جب لندن آیا تو یہ دیکھ کر نقش حیرت ہو گیا کہ جن نتائج

پر وہ سالہا سال کی مشقت و ریاضت کے بعد پہنچا تھا اور جن نظریات کو وہ تمام تر اپنے اجتہاد فکری کے ثمرات سمجھ رہا تھا برکؔ وہ سب منازل طے کر چکا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سائنس کے متعدد اصناف کا بھی پورا عالم تھا۔ اور یہ تمام علوم اس کے خزانۂ دماغ میں صرف محفوظ ہی نہ تھے۔ بلکہ ایک خاص خوش سلیقگی کے ساتھ مرتب تھے۔ نظم کی ترتیب اس کے ذہن کا خاص جوہر تھی۔ گویا اس کے دماغ میں متعدد خانے تھے۔ اور ہر خانے میں ایک ایک علم موجود تھا۔ جس سے وہ جب چاہتا کام کے لئے نکال سکتا تھا۔ پھر لطف یہ کہ تدبّر۔ عاقبت اندیشی وعملیت سے گویا اس کا خمیر تھا۔ باوجود سخت اصولی فلسفی ہونے کے وہ سیاسیات میں کبھی یہ نہیں کرتا تھا۔ کہ لفظی اصول کے پیچھے عملی ضروریات کا خون کردے۔ وہ اس حقیقت کو خوب سمجھے ہوئے تھا۔ کہ سیاسیات کا مقصد حقیقت شناسی نہیں۔ بلکہ مصلحت بینی ہے

(صفحہ ۲۰۴ - ۲۰۵)

سیرتی اور سوانحی تحریریں

سیرت اور سوانح پر مولانا کی دو کتابیں حکیم الامت نقوش و تاثرات اور محمد علی ذاتی ڈائری (دو حصّے) خاص طور پر قابل ذکر اور ان کی انشائی خوبیوں کی آئینہ دار ہیں۔ محمد علی حصّہ اوّل شائع شدہ ۱۹۵۴ء کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ تحریک خلافت اور ترک موالات کے سلسلہ میں ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی پر مقدمہ چلا تھا۔ جس کی شہرت سارے ملک میں ہوئی تھی۔ اور بالآخر دو سال کی قید سخت کا حکم سنایا گیا تھا۔ اس کا ذکر یوں تحریر فرمایا ہے۔

"نومبر میں حکم سنایا گیا۔ دو دو برس کی سزا سب ملزموں کے ساتھ محمد علی کو بھی۔ محمد علی بہت گھوم پھر چکے تھے۔ مارے مارے پھرتے بہت دن ہو چکے تھے۔ اب مشیّت تکوینی کے حاکم کا حکم ہوا کہ مدّت دراز کے لئے ایک جگہ کر بیٹھیں۔ ان ہی کی زبان میں۔۔

دیکھئے اب یہ گردش تقدیر کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے

اللہ اللہ کیا سماں تھا۔ آکسفورڈ کا گریجویٹ۔ آنرس پایا ہوا گریجویٹ۔ کامریڈ کا ایڈیٹر۔ ملک کا ایک معروف ترین لیڈر۔ چوروں۔ نقب زنوں۔ ڈاکوؤں اور خونیوں کے ساتھ قفس میں بند۔ اور جس کے ملنے والوں میں ابھی کل تک گورنر اور لفٹننٹ گورنر۔ راجے اور مہاراجے۔ ایگزیکیٹو کونسلر اور خود وائسرائے بہادر تھے۔ آج اس کی عزت جیل کے اذل پہرہ داروں اور برقندازوں کے رحم وکرم پر تھی۔ کوچ۔ صوفے۔ گدّے اور قالین کی جگہ زمین کا کھردرا فرش اور غذا وہ مل رہی ہے جو کبھی اس کے چاکروں اور خدمتگاروں نے بھی کیوں کھائی ہوگی۔ اور یہ سب کچھ دعوئ اسلام کے جرم میں۔ محبت اسلام کی پاداش میں۔ فرد جرم جو لگی تھی اس میں آزادئ ہند اور سوراج کا کہیں نام نہ تھا۔ الزام یہ تھا کہ جو احکام قرآنی اور احادیث رسول ؐ قتل مسلم کی وعید میں ان کو ان کے مسلمان سپاہیوں تک پہنچانے کی کوشش کیوں کی۔ تاریخ ہلکے پیمانے پر سواتیرہ سو برس کے بعد اپنا اعادہ کر رہی تھی۔ اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ (الحج ۴۰) اور وَمَا نَقَمُوْا مِنْھُمْ اِلَّآ اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ

(البروج)

اور اس قسم کی دوسری آیتوں کی تفسیر کا مشاہدہ لفظ و عبارت کی وساطت کے بغیر ہو رہا تھا۔ ادھر محمد علی جیل گئے اور ادھر بچّہ بچّہ کی زبان پر... ؎

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

کا ترانہ آگیا جس پر اپنے بیوی بچوں۔ عزیزوں دوستوں سے دو چار دن کی بھی جدائی شاق تھی۔ اسے حکم ۲۲ مہینوں تک سب سے الگ قید فرنگ میں بند رہنے کا ملا۔ اللہ...

اللہ اللہ کیا شان بے نیازی ہے۔ اپنے عاشقوں کے کیسے کیسے امتحان کرائے جاتے ہیں۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝

(صفحہ ۱۰۲ سے ۱۰۳)

مولانا موصوف کا

سچ اور صدق کے اقتباسات

ہفتہ وار اوّلاً سچ "
کے نام سے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء تک نکلتا رہا۔ پھر یہ اخبار صدق کے نام
سے نکلا۔ دسمبر ۵۰ء سے یہی اخبار صدق جدید کے نام سے تااس دم نکل
رہا ہے۔ ان تینوں اخباروں کے پہلے صفحہ کی سچی باتیں، شذرات اور مقالوں
نیز کتابوں پر تبصرے تمام تر مولانا ہی کے قلم کے رہین منت ہیں۔ اور علاوہ
معنوی مقصد اصلاح کے وہ ان کی فنکارانہ انشاپردازی کے بھی آئینہ
دار ہیں۔ ان کے ایک مقالہ الفاظ کا جادو (جون ۱۹۳۱ء) کے ابتدائی دو
پیراگراف ملاحظہ ہوں۔۔۔ "اگر آپ کا تعلق اونچے طبقہ سے ہے تو "سرا"
میں ٹھہرنا آپ کے لئے باعث توہین۔ لیکن کسی ہوٹل میں قیام کرنا ذرا بھی
باعث شرم نہیں۔ حالانکہ دونوں میں کیا فرق بجز اس کے ہے کہ "سرا" مشرقی
ہے دیسی ہے اور ہوٹل مغربی ہے۔ انگریزی ولایتی ہے کوئی اگر کہدے کہ "سرا"
کے فلاں بھٹیارے سے آپ کا یارانہ ہے تو آپ اس کا منہ نوچ لینے کو تیار ہو جائیں
لیکن فلاں ہوٹل کے منیجر سے آپ کا بڑا ارتباط ضبط ہے۔ اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے
ہیں۔ حالانکہ سرا کے بھٹیارے اور ہوٹل کے منیجر کے بجز و میان بجز ایک دیسی اور
دوسرے کے ولایتی ہونے کے اور کوئی فرق ہے؟ کسی مدرسے میں اگر آپ مدرس
ہیں۔ تو آپ حقیر ہیں ذلیل ہیں۔ لیکن کسی کالج میں اگر آپ لکچرار ہیں یا پروفیسر
ہیں تو معزز صاحب وجاہت ہیں۔ حالانکہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے مدرس
اور پروفیسر بالکل ایک چیز ہیں۔ ندوہ کے دارالاقامہ میں اگر آپ قیام کریں
تو آپ کا دل خوش نہیں ہوتا۔ لیکن اسی دارالاقامہ کا نام جب آپ
شبلی ہوسٹل سنتے ہیں تو آپ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا ہے۔ مدرسہ
میں اگر آپ پڑھتے ہیں۔ یا پڑھاتے ہیں۔ تو خود اپنی نظر میں آپ ذلیل ہیں
خوار ہیں۔ لیکن اگر آپ کا تعلق کسی کالج سے ہے تو پھر آپ سے زیادہ معزز کون ہے

وہ دن گئے جب زبان پر مدرسہ چشمۂ رحمت کا تذکرہ تھا۔ اب وہ چشمۂ رحمت کالج ہے۔ اور وہاں کے صدر مدرس پرنسپل صاحب ہیں۔ فرنگی محل کے مدرسۂ نظامیہ کے سب سے بڑے استاذ کو صدر مدرس کہہ کر تو دیکھئے فوراً آپ کی غلطی کی تصحیح کی جارہی ہے کہ ان کا عہدہ اب صدر مدرس کا نہیں۔ پرنسپل کا ہے۔

مولانا سچ ہفتہ وار میں "سچی باتیں" کے عنوان سے حالات وافکار و نظریات پر بڑی تیکھی قسم کی تنقید فرماتے تھے۔ جو لطف سے بھرپور ہوتی تھی۔ سچ لکھنؤ ۱۹۲۸ء سے سچی باتوں کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ کے نزدیک شہروں کا پسندیدہ ترین حصّہ وہاں کی مسجدیں ہیں اور ناگوار ترین حصّہ وہاں کے بازار ہوتے ہیں۔

آپ نے سنا یہ کس کا ارشاد ہے؟ اس کا جسے ہم اور آپ اپنی زبان سے سب سے بڑا رہبر اور سب سے بڑا معلم تسلیم کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اشارہ کنایہ میں نہیں صاف اور کھلے لفظوں میں ارشاد ہوتا ہے کہ شہروں کے پیدا کرنے والے کی نظر میں وہاں کا محبوب ترین اور بہترین حصّہ کیا ہوتا ہے؟ مسجدیں۔ اور ناگوار ترین حصّہ کونسا ہوتا ہے؟ وہاں کے بازار۔

یہ رسول کا قول تھا۔ امت کا عمل کیا ہے؟ آج ہم کو آبادی کے ہر حصّہ شہر کی عمارت مسجد سے زیادہ عزیز ہے۔ چوک کے کوٹھوں کی آبادی ہمارے دم سے قائم ہے۔ تھیٹروں کی سرپرستی ہمارے ذمہ۔ سینما اور سرکس دیکھنے والوں میں ہم سب سے پیش پیش۔ میلے ٹھیلوں کی چہل پہل ہماری ذات سے وابستہ۔ پارک کی سیر ہم کو عزیز۔ کلب کی حاضری میں ہم ناغہ نہیں کرتے۔ مشاعروں کی شرکت ہمارے لئے فرض عین۔ گھوڑ دوڑ کے میدان ہمارے دم سے آباد۔ فٹ بال میچ اور ہاکی میچ شاید ہی ہم سے کبھی چھوٹا ہو۔ ہوٹل ہم کو عزیز۔ حسین ساگر ہم کو عزیز۔ اپالو بندر ہم کو عزیز۔ چوپاٹی ہم کو عزیز۔ اڈنسن گارڈن ہم کو عزیز۔

نخاس ہم کو عزیز۔ حضرت گنج ہم کو عزیز۔ چارمینار ہم کو عزیز۔ سودے والوں کی صدائیں ہم کو عزیز۔ کھانوں کی دکانوں کی خوشبوئیں ہم کو عزیز۔ شربت والوں کے گلاس ہم کو عزیز۔ آئس کریم کی پلیٹیں ہم کو عزیز۔ اور خیر یہ تو عوام کا ذکر تھا۔ کتب خانے ہمارے خواص کو عزیز۔ کونسل چیمبر ہمارے ممبروں کو عزیز۔ لکچرار ہال اور جلسہ گاہیں ہمارے لیڈروں کو عزیز۔ مدرسے اور بورڈنگ کی عمارتیں ہمارے قومی کارکنوں کو عزیز۔ غرض سب کو اللہ کے گھر کے سوا اور سب کچھ عزیز۔۔ اللہ کی توحید کا کلمہ پڑھنے والو! محمدؐ کی شفاعت پر ایمان رکھنے والو! اپنے دلوں کو ٹٹولو فی صدی نہیں فی ہزار بلکہ فی لاکھ۔ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جنھیں مسجد دل سے عزیز ہے۔ جن کے دل مسجد میں راحت پاتے ہیں۔

اسی طرح صدق جدید کے شذرات بھی مولانا کے طرز نگارش کا خاص نمونہ قرار پاتے ہیں۔ "بے پناہ جنسی ہیجان"، کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے۔

واشنگٹن ۲۴ جنوری "آج ایوان صدر میں ایک پریس کانفرنس کے دوران ایک لیڈی رپورٹر نے صدر سے مارشل لا کا مطالبہ کر کے صدر جانسن کو کچھ دیر کے لئے حیرت میں ڈال دیا۔ لیڈی رپورٹر نے کہا کہ ملک میں جنسی جرائم کی کثرت ناقابل برداشت ہوگئی ہے۔ زنا بالجبر کی وہ شدت علانیہ ہوگئی ہے۔ کہ اب ضرورت ہے کہ اس کی روک تھام کے لئے مارشل لا سے کام لیا جائے۔"

گویا پولیس تھک ہار کر مایوس ہوگئی ہے۔ عدالتیں ناکام ہو چکیں۔ جیل خانے ناکافی ثابت ہو چکے۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ مجرموں کو گولی سے اڑا دیا جائے۔ یہ مطالبہ وہاں شروع ہوگیا جہاں حرام کاروں کے لئے تازیانہ اور سنگساری کی سزا پسماندہ ذہنیت کی نشانی اور وحشت و بربریت کی دلیل ہے۔ بہتر ہے مغرب کے دانشورو! اسلام کے تصور عفت و عصمت کی خوب ہنسی اڑاؤ۔ اسلامی احکام حیا و حجاب کے ساتھ جی بھر کر تمسخر کرلو۔ شرابیں پی پی کر اپنے [illegible] کو زنا پسندی کے سیلاب میں غرق کردو۔ اپنے افسانوں۔ ناولوں۔ اخبارو[illegible]

رسالوں۔ اخباروں۔ ناٹکوں۔ کھیل تماشوں۔ تصویروں مجسموں۔ ہر راستے سے ہیجان۔ شہوت اور تلاطم۔ نفس پرستی برپا کردو۔ اور جب اپنے ہاتھوں کے لائے ہوئے ہولناک طوفان کی پوری زد اپنی ہی بہنوں بیٹیوں ماؤں اور بیویوں پر پڑنے لگے۔ اور چوپایوں اور انسانوں کے درمیان کوئی فرق حیا اور غیرت کے لحاظ سے نہ رہ جائے۔ تو بے تحاشہ گولیاں چلانے اور مارشل لا کے لئے غل مچانے لگو۔

ادبی مضامین ۔ مولانا کے ادبی مضامین

مرزا رسوا کے قصے ،، کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے۔ اردو کا واعظ شاعر۔ اردو کا ایک بدنام شاعر۔

ہر ایک چند ویزہ پہلے اخباروں اور رسالوں میں پھر مجموعۂ مقالات کی شکل میں شائع ہوئے۔ اور بہت مقبول ہوئے۔ ایک نیا ادبی مضمون یا "آئین اکبری،، جو ۱۹۳۶ء میں پہلی بار ایک ادبی جلسہ میں پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ اس کا تمہیدی حصہ حسب ذیل ہے۔

"آئین اکبری تو وہی ایک ہے۔ سب کا جانا ہوا۔ شہنشاہ اکبر کے انتظامی خط و خال کا آئینہ۔ اب اس میں کوئی جدّت کیا پیدا کرے گا۔ پرانے کو نیا کوئی کیونکر بنائے گا۔ اور اطلس میں گاڑھے کا پیوند کوئی کہاں سے لگائے گا۔ لیکن اکبر اکیلے ایک شہنشاہ ہندی کا نام تو نہیں ہوا ہے۔ اقلیم سخن کا بھی ایک تاجدار اس نام کا گذرا ہے۔ صدیوں قبل نہیں حال میں اور کہیں بہت دور نہیں۔ آپ کے شہر سے بہت نزدیک شہر الہ آباد میں۔ وہ قدیم آئین اکبری تھا اقلیم ہند کے ایک فرمانروا کا کوکبۂ جلال۔ یہ آج کا جدید آئین اکبری ہے اقلیم معانی کے ایک تاجدار کا پر تو جمال البتہ وہاں داستان گو تھا۔ ایک نام ابوالفضل اور یہاں عرض پرداز ہے ایک سراپا جہل۔ خیر نمائش کے عجائبات نگار میں ایک عجوبہ کا اضافہ اور سہی۔ ادبی کانفرنس ادیبوں اور

شاعروں کے مجمع میں ۔ سخن گویوں اور سخن فہموں کے جلسہ میں ایک کم سواد قصباتی کی جسارت ۔ اللہ اکبر ۔ بس سمجھئے کہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں جہاں بازیاں بڑے بڑے شہسواروں کی لگ رہی ہیں وہیں ایک گوشے میں ایک لعل بند بھی کھیل کانٹے سے لیس اپنا ٹھیلا لئے موجود ہے ۔

ظرافت کلام اقبال کی سب سے بڑی نقیب رہی ہے اور کلام اکبر کے حق میں سب سے گہری نقاب بھی ۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا ۔ ان کی شہرت کو تالیوں نے تھپتھپایا ۔ لیکن یہ بھی اسی قدر صحیح ہے کہ دنیا انھیں ایک دل لگی باز سمجھ کر ان کے لطیفوں پہ مٹی رہی ان کی شوخیوں پر ہنس مسکرالیا ۔ ان کے چٹکلوں پر لوٹتی کھلکھلاتی رہ گئی ادھر نظر کسی کی نہ گئی اور کسی ایک آدھ کی گئی تو وہ شمار میں نہیں کہ جس ساز سے یہ نغمے نکل رہے ہیں ۔ وہ خود کتنے سوز میں ڈوبا ہوا ہے "

مذہبی اور قرآنی مضامین

ادب کے ساتھ مولانا کا دوسرا اہم اور خاص موضوع مذہب خصوصاً قرآنیات ہے ۔ ان کی تفسیر ماجدی کا پہلا اور ضخیم ایڈیشن تاج کمپنی کراچی کے زیر اہتمام عرصہ ہوا شائع ہوا تھا ۔ دوسرا ضخیم تر ایڈیشن مکمل نظر ثانی اور بہت کچھ ترمیم و اضافہ کے بعد ہندوستان سے شائع ہوا ہے ۔ دوسری جلد میں دسویں پارے تک کی تفسیر آگئی ہے ۔ اس کے علاوہ ان کے قرآنی موضوعات پر کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں ۔ ان میں طرز انشاء پردازی ۔ ان کے ادبی مضامین اور صحافتی تحریروں سے خاص مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ سلیس اور بآسانی ذہن نشین ہونے والی ہے ۔ تفسیر ماجدی کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو ۔ سورہ فاتحہ میں رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پر تفسیر کے حاشیہ کا ایک حصہ ہے ۔

" رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا لفظ لاکر قرآن مجید نے گویا بتادیا کہ ہر صنف موجودات کا ایک مستقل نظام تربیت ہے ۔ اور سب کا آخری سرا اسی قادر مطلق ۔

واحد ویکتا کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی بھی صنف موجودات اس کے ہمہ گیر نظام ربوبیت سے آزاد و مستثنیٰ نہیں۔ یہ تعلیم بھی اس ایک لفظ سے مل گئی کہ اسلام کا خدا کسی مخصوص نسل مخصوص قوم، مخصوص قبیلہ کا خدا نہیں۔ یہ حقیقت تاریخ مذاہب میں نہایت درجہ اہمیت رکھتی ہے۔ اسلام سے قبل مذاہب جس صورت میں موجود تھے وہ اس وسیع تخیل ہی سے آشنا نہیں رہے تھے۔ ہر قوم خدا کو صرف اپنا خدا تسلیم کرتی تھی گویا خدا کی حیثیت صرف قومی خدا کی رہ گئی تھی۔ بابل، مصر، ہند، یونان، روم، عرب وغیرہ کی مشرکہ کوششوں کا ذکر نہیں۔ بنی اسرائیل جیسی موحد قوم بھی خدا کے خدائے کائنات ہونے کی پوری طرح قائل نہیں رہی تھی۔ قرآن نے ایک لفظ رب العالمین لاکر اس سارے مشرکانہ وکافرانہ عقائد کی تردید کردی۔ مشرک قوم کو سب سے زیادہ ٹھوکر صفت ربوبیت ہی کے سمجھنے میں دیر لگی ہے۔ اس لئے قرآن مجید نے تصحیح میں بھی اسی کو مقدم رکھا۔

(تفسیر ماجدی حصہ اول ۲۰۶)

حسن تحریر اور حق گوئی

مولانا موصوف نے جتنا کچھ بھی لکھا ہے۔ اس میں انشا پردازی کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے منفرد و دلکش محاسن پائے جاتے ہیں۔ حق گوئی آپ کا وصف خاص رہا ہے۔

آئین جوانمردی حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اس اللہ کے شیر نے ہمیشہ حق کو حق اور باطل کو باطل کہہ کر ببانگ دہل اپنے خیالات کا پرچار کرنے میں ذرہ برابر بھی جھجک سے کام نہیں لیا ہے۔ اپنے اور اپنے خدا کے نزدیک جس بات کو درست اور جائز سمجھتے تھے۔ بے محابا بیان کر دیتے تھے۔ صداقت خلوص اور دیانت داری۔ حق پرستی اور حق گوئی نیز حق جوئی ان کے خمیر میں داخل تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی۔ تحریک خلافت کی پھڑکتی رگ۔ ترک موالات کی روح رواں۔ علوم مشرقیہ۔ عربی فارسی۔ اردو ادب۔ علوم دین۔ تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔

انگریزی ادب۔ فلسفہ عمرانیات۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ۔ الغرض ان میں سے ہر صنف پر بڑی عمیق اور گہری نظر رکھتے تھے۔ اور ہر میدان میں ایک مجاہدانہ شان کے حامل نظر آتے تھے۔

مولانا کی اکثر تحریریں اور مختلف مضامین اور صدق میں قائم کردہ عنوانات ہمیشہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرلیا کرتے تھے۔ ان کی بڑی خوبی یہی تھی جہاں کہیں بدعنوانی یا سماجی و مذہبی خرابی دیکھتے اس پر فوراً تنقید کردیتے تھے۔ سماج کی برائیاں۔ معاشرے کی کمزوریاں۔ سیاسی بے چینیاں۔ ہندوستان میں ہوں یا پاکستان میں۔ عرب میں ہوں یا عجم میں مصر میں ہوں یا برطانیہ میں مولانا ان پر بے چین ہوکر اپنے غم و ملال کے جذبات پر دقلم فرمادیتے تھے۔ کسی شکل کسی حالت اور کسی بھی جگہ جہاں برائی نظر آئی آپ اس کی گرفت کرکے ہنگامہ برپا کردیتے تھے۔ پھر چاہے وہ پنڈت پنت کی ہو یا چاہے کسی شاہ برطانیہ کی۔ چاہے کوئی مانے یا نہ مانے وہ ایک بار برائی پر ضرب لگا کر اس کے انجام سے ضرور آگاہ کردیتے تھے۔ اور خود مطمئن ہوجاتے تھے۔ اپنا فرض ادا کرنے میں انھیں نہ جیل کا ڈر تھا۔ اور نہ جلاوطنی کا۔ وہ نہ فرد سے ڈرتے تھے۔ اور نہ کسی جماعت سے۔ وہ صرف برائیوں سے ڈرتے اور ہر قیمت پر اسے دور کرنا چاہتے تھے۔ ان کی گردن بڑی سے بڑی طاقت اور بڑے سے بڑے اقتدار کے آگے کبھی نہیں جھکی۔ وہ خالص اسلامی طرز زندگی کے دلدادہ تھے۔ ان کے قول و عمل میں بہت یکسانیت تھی۔ وہ اپنی تحریروں میں اس بات کا اعلان کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ کہ

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں — مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

بقول ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب ... وہ دراصل اردو زبان کے چیمپئن کہلانے کے مستحق ہیں۔

درحقیقت مولانا مرحوم صاحب سیف و قلم تھے۔ ان کے الفاظ

ہی ان کے لئے سیف کا کام کرتے تھے ۔ اور الفاظ کی تلوار عام تلوار سے زیادہ
کاٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔ وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز ۔ بہترین صحافی
زبردست عالم دین ۔ بہترین شارح قرآن ۔ اور بہترین مفسر قرآن بھی تھے
سب کے ہی خواہ اور سب سے بڑھ کر خود اپنے ہمدرد اور دوست ۔ وہ اپنے بے
لاگ قلم سے انسان دوستی کا حق ادا کرتے رہے ۔ وہ صحیح معنوں میں خلوص ۔
ایثار ۔ مروّت اور وفاداری کا مجسمہ تھے ۔ اس لئے ان کی تقریر و تحریر میں بے پناہ
تاثیر پائی جاتی تھی ۔ اگر تقریر کرنے پر آتے تو ان کا ہر جملہ دل کی گہرائیوں میں
اتر جاتا ۔ اور لکھنے پر کمربستہ ہو جاتے تو ہر لفظ نقش فریادی بن کر ان کی شوخیٔ
تحریر کی طرف اشارہ کرتا تھا ۔ وہ چسٹرٹن کی طرح پہلے چاک سے کچھ ہلکے نقوش
اور لکیریں بناتے اور پھر انھیں نقوش اور لکیروں سے پوری پوری قد آدم تصویریں
اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ سامنے آجاتے ۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ قاری
ذہن پر ایمانداری سے زور دے اور اس کے اندر یہ صلاحیت موجود ہو کر وہ تمام
کڑیاں ملا سکے ۔ مولانا کی تحریروں میں اکثر مشہور طنز نگار سوئفٹ اور جوزف
ایڈیسن کا اصلاحی جذبہ کارفرما دکھائی دیتا ہے ۔ آپ نے کئی کتابیں تصنیف
کیں ۔ ہر کتاب اپنی جگہ لاثانی اور ہر اعتبار سے معیاری ۔ یہاں تک کہ ہر
جملہ اور ہر پیراگراف بجائے خود ایک کتاب معلوم ہوتا ہے ۔" محمد علی کی ذاتی
ڈائری " (کیرنا مری نظر میں) اردو کے سوانحی ادب میں گرانقدر اضافے
شمار کئے جاتے ہیں ۔ ان میں حقائق سے بالکل چشم پوشی نہیں کی گئی ہے۔
۔ اور نہ ہی مبالغہ سے کام لے کر زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں۔
مولانا موصوف نے محمد علی جوہر کے سارے جوہر کھول کر رکھ دیئے ہیں
زمانۂ خلافت میں آپ برسوں محمد علی جوہر کے ساتھ رہے انھیں اٹھتے بیٹھتے
چلتے پھرتے دیکھا ۔ عالم خموشی اور قیامت والی تقریروں دونوں کے مزے لئے ۔
جلوت و خلوت میں جوہر کو اچھی طرح دیکھا بھالا ۔ مدتوں ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے۔

ایسے شخص کی تصویر کشی آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ وہ بے جا ستائش اور ذاتی تاثرات سے کام لے سکتے تھے۔ مگر اخلاقی بے ادبی اور ادبی بے انصافی کے ڈر سے ایسا کبھی نہیں کیا۔

"محمد علی کی ذاتی ڈائری" میں آپ نے سوانح نگاری کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ صداقت بیانی کی وجہ سے یہ کتاب تاثیر کے لحاظ سے بے حد مقبول ہوئی۔ اسی طرح اکبر الہ آبادی بھی مولانا کے رہین منت ہیں کہ ان کے قلم نے ان کا ایک ایسا جیتا جاگتا مرقع بنا دیا ہے۔ جو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنی دلکشی و دل آویزی میں برابر اضافہ کرتا رہے گا۔ سونے پر سہاگہ تو یہ ہوا کہ دونوں حضرات یعنی محمد علی جوہر اور اکبر الہ آبادی اوّل بھی مشرقی تھے اور آخر بھی مشرقی رہے۔ اور مولانا دریابادی بھی طبعی انقلاب کے بعد سر سے پیر تک مشرقی روح سماوی۔ بدن ارض ہند کا۔ تعلیم و تربیت اور ذہنیت علیگڑھ کی۔ قرآن کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے۔ اقوال و احادیث نبوی کے حافظ۔ اسلامیت کے ماہر۔ وقت کے بہترین مفسر۔ ایسے شخص نے اپنی زندگی کا پسندیدہ موضوع پاکر کیا کیا نہ کمالات دکھائے ہوں گے۔ اردو ادب کے یہ مایہ ناز صاحب قلم بہت سی اعلیٰ صفات کے مالک تھے۔ وہ ہر عمل کو میزان قرآنی سے تول لیتے تھے۔ سیرت نبوی کے پیمانے سے ناپتے تھے۔ اسوۂ حسنہ کے معیار کو اصل معیار گردانتے تھے۔ سیاست کے داؤں پیچ سے بخوبی واقف ہوتے ہوئے بھی آپ نے اپنے دامن کو اس سے بچائے رکھا۔ صرف خدمت زبان و ادب اور فروغ دین و مذہب کو اپنا شعار بنایا۔ آپ نے طرز نگارش وہی اختیار کیا جو انسانی مزاج کے موافق ہے۔ انسانی مزاج میں جو سردی اور گرمی پائی جاتی ہے اسی تناسب سے مولانا کا لب و لہجہ سردی و گرمی لئے ہوئے ہوتا تھا۔

مولانا کے دو شاہکار مضامین مولانا کی تلمی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ فلسفہ و معقولات سے لیکر مذہب و تصوف اور ادب تک مختلف

اصناف میں ان کے بلند پایہ مضامین اور مختلف تصانیف موجود ہیں۔ لیکن وہ اصلاً ادیب تھے۔ ان میں ادب اور انشاء کا ذوق اتنا رچا اور بسا ہوا تھا کہ ان کا امتیازی وصف بن کر رہ گیا تھا۔ جس سے ان کی مذہبی اور فلسفیانہ تصانیف بھی خالی نہیں۔ زبان و ادب کے ہر پہلو پر ان کی حکمرانی تھی۔ اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہمارے کلاسیکی ادب میں جو خصوصیات الگ الگ پائی جاتی تھیں۔ وہ مولانا میں یک جا جمع ہو گئی تھیں۔ سنجیدہ علم و ادب لطف زبان۔ روز مرّہ۔ طنز و ظرافت اور ضلع جگت سب پر ان کے قلم کی حکمرانی یکساں تھی۔ اس لحاظ سے وہ دور حاضر کے منفرد ادیب کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ ایک مختصر مضمون میں ان کی تمام خصوصیات کو دکھانا دریا کو کوزہ میں بند کرنا ہے۔ اس لئے ان کے دو ادبی شاہکار کے طور پر ان کے دو مضامین بعنوان "اردو کا ایک واعظ شاعر" اور "مرزا رسوا کے قصے" کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے کی روشنی میں ان کے ادب و انشا کی ایک ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی جائے گی۔ جس سے ان کے ادبی مذاق اور طرز تحریر کا اندازہ ہو سکے۔

مولانا حالیؔ کی متانت و ثقافت اور قوم و ملت کے درد میں ان کی غمگینی اور افسردہ دلی اتنی مسلم ہے اور قومی و اصلاحی نظموں کی اتنی شہرت ہے کہ جس نے ان کے دیوان کا مطالعہ نہیں کیا ہے وہ قیاس بھی نہیں کر سکتا کہ مسدس اور مناجات۔ بیوہ جیسی نظمیں کہنے والے شاعر کا قدم تغزل کے میدان میں بھی کسی بڑے سے بڑے غزل گو شاعر سے پیچھے نہیں اور وہ ایسی غزلیں کہہ سکتا ہے جن پر میرؔ۔ غالبؔ اور مومنؔ کا دھوکا ہوتا ہے۔

"اردو کا ایک واعظ شاعر" میں حالیؔ کی شاعری خصوصاً ان کی [illegible] زل پر ایسا تبصرہ ہے کہ وہ بجائے خود ایک ادبی شاہکار بن گیا ہے۔

اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ مولانا کی نظر جب پہلی مرتبہ حالی کا یہ مشہور
شعر ... تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب : بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد
گذرا تو انھوں نے اس کے تیور سے اسے غالب کا شعر سمجھا۔ مگر
مولانا شبلی سے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ غالب کا نہیں بلکہ مولانا حالی
کا ہے۔ مضمون کا آغاز اس حیرت سے ہوتا ہے۔

«ہائیں یہ کیا ارشاد ہوا کہاں مولوی حالی اور کہاں یہ شعر
بیچارے ایک سیدھے سادے واعظ قسم کے آدمی۔ روکھے پھیکے اشعار کے
ناظم۔ انھیں غزل اور پھر غزل کے پھڑکتے ہوئے شعر سے مناسبت کیا؟
شعر کے سارے تیور استاد غالب کے تخیل وہی۔ بندش وہی۔ زبان وہی۔
حالی کے کلام میں نہ حسن بیان۔ نہ لطف زبان۔ نہ یہ روح نہ یہ جان۔ نہ
تخیل میں رعنائی۔ نہ طرز بیان میں زیبائی۔ غرض دل نے کچھ جھنجلا کر اور
کچھ خفیف ہو کر یہ ساری جرحیں کر ڈالیں۔ لیکن حقیقت بہر حال حقیقت
رہتی ہے۔ دیوان اٹھا کر دیکھا تو غزلیات کی ردیف دال میں یہ شعر اپنی جگہ
موجود۔ کون حالی۔ وہی جن کے تغزل اور تشبیب کی کوئی وقعت دل میں
تھی ہی نہیں۔ بس شروع ہی سے یہ خیال جما ہوا تھا کہ غزل کی رنگینیوں
اور رنگین بیانیوں سے انھیں کیا واسطہ۔ ایک خشک نظم نویس۔ کلام
میں عاشقانہ مضامین کا قحط۔ بندشیں سست۔ خدا غریق رحمت کرے
دور اول کے اودھ پنچ کو۔ اور بھلا کرے اس کے نقادان فن۔ اور
شہسواران سخن کا۔ یہ اس کا فیض تھا کہ ایک عامی اور مبتدی
طالب علم ہی نہیں۔ خدا جانے کتنے پڑھے لکھوں۔ پختہ کاروں
لائق فائق زبان دانوں کے دل میں سوچا ہوا تھا۔ ادھر حالی کا نام
آیا ادھر کلام کی بے نمکی۔ بے اثری اور روکھے پھیکے پن کی تصویر آنکھ
میں پھر گئی۔

غرض یہ ہے کہ مولانا کے قلم کی جولانی ادب کے کسی خاص صنف تک محدود نہیں۔ اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ انھوں نے مختلف النوع ادبی پہلوؤں اور ادبی رسائل پر مضامین لکھے ہیں۔ ان کی شعر و ادب پر تنقید بھی ہے۔ ادبی شخصیتوں اور ان کے کارناموں پر تبصرہ بھی ہے۔ ادبی مجالس کے خطبے بھی ہیں علمی و ادبی بیانات بھی ہیں۔ ریڈیو کی نشریات بھی ہیں۔ مرنے والوں کی موت پر تاثرات بھی ہیں۔ کتابوں پر مقدمے اور ان پر نقد و تبصرے بھی ہیں۔ اور یہ سب اپنے اپنے رنگ میں فرد اور مولانا کی ادبی نکتہ سنجی کا نمونہ ہیں۔ اور ان کا خاص طرز نگارش اور اصلاحی نقطۂ نظر سب میں نمایاں ہے۔ دائرہ کوئی بھی ہو اس کا مرکزی نقطہ اصلاح اور عبرت و بصیرت ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ایک طوائف کی زندگی اور مرزا شوق کی مثنویوں سے بھی عبرت کا سبق دیتے ہیں۔

مولانا کی قد آور ادبی شخصیت کے ادبی کارنامے گوناگوں ہیں جن پر تفصیلی بحث کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔

۱۔ مولانا عبد الماجد بحیثیت طنز نگار

۲۔ مولانا کا نثری اسلوب اور طنز نگاری کی خصوصیات

۳۔ مولانا بحیثیت شاعر

مولانا عبدالماجد بحیثیت طنزنگار

جب سے دنیا میں ادب کا وجود ہوا ہے۔ اس وقت سے یا اس کے لگ بھگ طنزنگاری بھی معرض ظہور میں آئی ہے۔ انگریزی کے لفظ سٹائر (طنز) کی تعریف کی گئی ہے کہ وہ کسی مضحک یا نازیبا واقعے سے متاثر ہو کر ظرافت یا کراہت کا اظہار ہے جو موزوں الفاظ میں کیا جائے۔ بشرطیکہ اس میں خوش طبعی اور ادبیت نمایاں ہو۔ دوسرے ادیبوں کی رائے یہ ہے کہ "سٹائر ایسے جملے سے عبارت ہے جو کسی واضح تمسخر کی مدد سے امتیازی تاریخی جزئیات کے خلاف کیا جائے۔ آج کل طنز کے لئے (   ) کی اصلاح زیادہ موزوں سمجھی جاتی ہے۔ اہل ادب کے نزدیک طنز کلام کا وہ اسلوب ہے جس میں استعمال شدہ عبارت کے اندر اصل معنی چھپے ہوئے ہوں۔ اور ظاہر اس کی ضد ذہن نشین ہو۔ اس کا خاص مقصد کسی کی تحقیر یا استہزاء ہوتا ہے۔"

طنز ایک طرح کا عمل جراحی ہوتا ہے بشرطیکہ لطافت کے ساتھ ہو اس میں مواد کی اصلی اہمیت ہے۔ اس کا روپ خواہ کچھ بھی ہو۔ سوئفٹ کا کہنا ہے کہ طنز کا مقصود کبھی ذاتی تسکین کا جذبہ ہوتا ہے۔ طنزنگار اپنے گرد و پیش کی بے عنوانیوں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے وہ اپنی طنز و ظرافت سے سامعین یا قارئین کو متوجہ کر لیتا ہے۔ وہ مسلمات کو الٹ کر الٹ دیتا ہے۔ جس پر ہم اول ہنستے ہیں اور پھر سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اردو میں طنز و ظرافت کی داستان بڑی طویل ہے مختلف اہل قلم نے اس میدان میں قدم رکھا اور کامیاب ثابت ہوئے۔ مولانا عبدالماجد بھی انھیں میں سے ایک منفرد طنزنگار تھے۔ ان کے طنز کی نوعیت سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ موصوف کی زندگی کا اجمالی جائزہ لیا جائے۔

مولانا کی ولادت ۱۸۹۲ء کی ہے اور وطن دریاباد ضلع بارہ بنکی
مولانا کا خاندان اودھ کے معزز و ممتاز خاندانوں میں ہے۔ موصوف نے ابتدائی
تعلیم گھر حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۲ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں بی۔اے کیا۔
اور شروع ہی سے تصنیف و تالیف کی جانب میلان پیدا ہوگیا۔ اوّل اوّل
"الناظر"، لکھنؤ، وغیرہ سے قلمی وابستگی رہی۔ معارف اعظم گڈھ کے اعزازی
نگراں رہے۔ آپ کا ادبی ہفتہ وار صدق اور اس سے پہلے سچ اردو صحافت
میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی فلسفیانہ تصانیف و تراجم ہماری زبان
کا اہم سرمایہ ہیں۔ آخری عمر میں آپ مذہبی تصانیف پر تمام تر توجہ دیتے رہے۔
جن میں ترجمہ و تفسیر قرآن مجید (اردو و انگریزی) ارض القرآن۔ سیرت نبوی
۔حکیم الامت۔ اکبر نامہ۔ محمد علی وغیرہ موصوف کے فضل و کمال کی آئینہ دار ہیں۔
آغاز میں مولانا فلسفہ کی مزاولت کے بعد آزاد خیالی کی وادی میں سرگرداں رہے۔
لیکن توفیق الٰہی نے دستگیری فرمائی اور صراط مستقیم دکھایا۔ چند روز سیاست کی راہ
پر بھی گامزن ہوئے مگر بعد میں کنارہ کش ہوگئے۔ معاصرین میں شاید ہی کوئی ہو
جو مولانا کی دیانت و صداقت۔ وسعت معلومات اور اصلاحی خدمات بدلل تحریر
اور موثر اسلوب کا معترف نہ ہو۔ سچ اور صدق کی بدولت اردو اہل قلم میں
ان کا مرتبہ طنز نگار کی حیثیت سے مسلم ہوگیا ہے۔ مولانا کو قدرت نے نگاہ غائر
اور زبردست قوت استدلال۔ اصلاح پسندانہ ضمیر اور دلیرانہ طرز تحریر عطا کیا تھا
موصوف جس ماحول میں رہے اس میں ہر طرح کی کمزوریاں اور بدعنوانیاں
پائی جاتی تھیں۔ اپنے ہوں یا غیر سب کے سب (چند کو چھوڑ کر) انصاف سے
دور اور اصلاح سے نفور۔ ایک طرف تہذیب دوسری طرف تعصب۔
حکومت ہو یا ملک کی اکثریت۔ جہاں کسی نے جادۂ حق سے قدم ہٹایا اور مولانا
کا حق نگار قلم جنبش میں آیا۔ مگر اس کی محرک سیاست نہ تھی اس لئے کہ وہ
سیاسی آدمی نہ تھے۔ ان کا محرک صرف جذبۂ اصلاح اور داعیۂ اخلاص ہوتا تھا

اور ان کے طنز کا نشانہ فرد نہیں جماعت۔ ملت اور شخصیت نہیں ایک طرز تفکر ہوتا تھا۔ وہ اظہار حق میں اپنے بڑے سے بڑے دوست یا محترم کی رعایت کرنا یا کسی عظیم لیڈر یا وزیر سے مرعوب ہونا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اس فرض کے ادا کرنے میں اپنوں کی برائیاں اور غیروں کی خوبیاں حائل نہیں ہوتی تھیں یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ کہ وہ ایک پر چشم پوشی یا دوسرے پر خاموشی روا رکھتے اس کا قلم دراصل شمشیر برہنہ تھا۔ جو مسلمان۔ ہندو۔ سنی شیعہ۔ عالم۔ عامی۔ امیر۔ غریب میں امتیاز نہیں برتتا تھا۔ وہ کسی کی اچھی بات دیکھتے یا سنتے تو بے اختیار تعریف کے پھول برساتے۔ اور اگر کوئی بے راہ روی دیکھ لیتے تو تحت طنز کا نشانہ بنانے لگتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا روئے سخن شخص نہیں بلکہ شخصیت کی طرف ہوتا، ہے وہ اپنا فرض جانتے اور طنز کی درد پہچانتے تھے۔ ایک ماہر سرجن کی طرح خطرناک پھوڑے کے لئے تیز نشتر استعمال کرتے تھے۔ ان کے طنز کی مثالیں بے شمار ہیں۔ جن کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔ تاہم تبرک کے طور پر چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

سائنس کی ہلاکت آفرینی :- حادثہ ہندوستانی فوج کے تحت وہ فرماتے ہیں کہ ایک تربیتی طیارہ کا شہر کی گھنی آبادی میں ٹوٹ پڑنا نمونہ ہے اس حقیقت کا یہ سائنس جہاں حیات آفریں ہے وہیں ہلاکت آفریں بھی کتنی ہے یوں بالکل بیٹھے بٹھائے ختم ہو جانا اب تک تو صرف زلزلے یا بجلی وغیرہ گرنے کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ اب اس مرگ ناگہاں کے امکانات کتنے زائد اور وسیع ہو گئے ہیں۔ صدق جدید، اگست ۱۹۵۲ء

قوت خرید میں اضافہ کا حشر :- کے تحت لکھتے ہیں کہ اس ساری زحمت اور دردسری کی آخر ضرورت کیا ہے۔ ہندوستان کے ایک نیم ملا قسم کے ماہر معاشیات کو پیرس بطور خصوصی کے بلایا جائے اور وہ جا کر ملکۂ ذی اقتدار (ملکۂ برطانیہ) اور ان کے شوہر نامدار کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کر دیں کہ آپ حضرات بھی

کس وہم کے شکار ہو گئے ہیں۔

گرانی سے زیر باری جو کچھ بھی ہو رہی ہو یہ آپ حضرات کی مفلسی کی دلیل کسی درجہ میں بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو دلیل آپ کی قوت خرید میں اضافہ کی ہوئی۔ (صدق جدید)

جمہوریت میں جدّت (یو۔این۔آئی کے جائزے کے مطابق وزیروں کی تعداد ۱۹۶۱ء میں ملک کے اندر ۲۹۴ تھی اب ۱۹۶۷ء میں ۵۴۰ ہے مرکزی وزرا پہلے ۴۰ تھے اب ۵۶ ہیں۔ مرکز میں وزراء کے سالانہ مصارف ایک کروڑ پچاس لاکھ سے بڑھ کر دو کروڑ ستر لاکھ)

"گاندھی جی کے نام کی دہائی کوئی کب تک دے اور ان کے نام اور ان کی یاد سے فریاد کب تک کی جائے۔ (صدق جدید)

غرض یہ ہے کہ صرف سوا مہینے ڈیڑھ مہینے کے اقتباسات تھے جن سے ہر شخص مولانا کی طنزیہ نگارش اور ان کے لہجے کے بارے میں رائے قائم کر سکتا ہے۔ پورے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جن سلیم الطبع حضرات کو تعصب کی بیماری نہیں ہے۔ اور جن کے ضمیر پاک وصاف ہیں وہ اس نگارش کی ضرور داد دیں گے۔ جو سیاسی نوک جھونک اور دشنام طرازی سے پاک اور کلمۃ الحق کے اظہار میں بے باک ہے۔ اور جس کی بنیاد خود حکومت کے مسلم اعداد پر قائم ہے۔ مواد کی صحت کے ساتھ عبارت کا زور اور اختصار اور جا بجا برمحل اشعار۔ مزید برآں اس پر بھی اگر کوئی منہ آئے تو سمجھ لیجئے کہ اس کا مرض علاج کی حد سے گزر چکا ہے۔

مولانا کی طنزیہ تحریروں پر بعض حلقوں سے اعتراض بھی ہوئے مثلاً یہ کہ ان کے مزاج میں حدّت۔ لہجہ میں تلخی اور تلخی میں شدت زیادہ ہے نیز یہ کہ وہ مولویت سے بے طرح مانوس اور اصلاح سے بالکل مایوس نظر آتے ہیں۔ ان اعتراضوں میں کسی قدر صحت پائی جاتی ہے۔ چند لوگ

کبھی کبھی ان کی طرز کی یکسانیت کا گلہ کرتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ ان کے یہاں ملک و قوم کی خرابیوں کا اشارہ تو ہے مگر حل نہیں ۔ مگر اس تعلق سے چند حقائق پر غور کرنا مناسب ہوگا ۔ ان کو پیش نظر رکھنے کے بعد بہت سے اعتراضات خود بخود دور ہو جائیں گے ۔ اور بہت سے شکوک اپنے آپ رفع ہو جائیں گے ۔

اگرچہ یہ امر اپنی جگہ مسلم ہے کہ تشخیص خطرناک مرض کے لئے دوا بھی تلخ ضروری ہے ۔ مگر ہمارے مولانا نے معالج ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا ان کی حیثیت ایک معالج کی نہیں ایک مبشر کی ہے ۔ وہ بیمار کو کبھی نرمی سے اور کبھی گرمی سے صرف اتنا بتا دیتے ہیں ۔ کہ اس کا مرض کتنا خطرناک ہو چلا ہے ۔ وہ چاہتے تو اپنے طنز میں ظرافت کی چاشنی ملا سکتے تھے ۔ مگر انھوں نے ایسا اس لئے نہیں کیا کہ مزاح سے طنز کی تاثیر گھٹ جاتی ہے اور اس کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا نے ادبیت کا لحاظ رکھتے ہوئے مواد اور ہیئت دونوں میں طنز کو جس کامیابی کے ساتھ برتا ہے اس کی مثال اردو ادب میں مشکل ہی سے ملے گی ۔

مولانا کے نثری اسلوب اور طنز نگاری کی خصوصیات

یہ امر مسلم ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے دور کے منفرد صاحب طرز انشا پرداز تھے ۔ ان کی اردو معلّیٰ کا شمار ہمارے بیش قیمت کلاسیکل سرمایہ میں ہوتا ہے ۔ ایسا سرمایہ جو کمیاب بھی ہے اور نایاب بھی ہے ، کمیاب اس اعتبار سے کہ ہمارے نثری ادب کی اساس جس صاحب طرز انشا پردازوں پر ہے ان کی تعداد ان گنت اہل قلم میں مانی گئی ، ور تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے ۔ رجب علی بیگ سرور ۔ سر سید احمد خاں

مولوی محمد حسین آزاد ۔ مولانا الطاف حسین حالی ۔ مولانا شبلی نعمانی ۔ سید سلیمان ندوی ۔ مہدی افادی ۔ مولانا ابو الکلام آزاد ۔ رشید احمد صدیقی سید احتشام حسین ۔ آل احمد سرور ۔ ڈاکٹر محمد حسن تک ہماری اعلیٰ ترین نثری روایات کا جز و مولانا شبلی نعمانی سے ڈاکٹر محمد حسن تک مولانا عبد الماجد دریابادی نظر آتے ہیں ۔ بقیہ نثر نگار اس فہرست میں اس لئے شامل نہیں کیئے گئے ہیں ۔ کہ وہ ان اہم ادبی نثری ستونوں میں سے کسی نہ کسی کے سایہ تلے نظر آتے ہیں ۔ یا اپنی راہ الگ نہیں بنا پاتے ہیں ۔ شاید اس فہرست میں بھی مزید اختصار دو ایک ناموں کی حد تک ممکن ہو ۔ نایاب اس اعتبار سے کہ گذشتہ ۵۰ برس سے زائد کی مولانا عبد الماجد کی اِدھر اُدھر کتب میں رسائل میں منتشر سچ اور صدق میں محفوظ نثر عالیہ کو ابھی تک یکجا اور محفوظ نہیں کیا گیا ۔ مقالات ماجد ۔ نثریات ماجد ۔ انشائے ماجد اور متعدد دیگر تصانیف میں محض ان کا عطر پیش کیا گیا ہے ۔ ورنہ ان کی بیشتر عالمانہ ادیبانہ اور فلسفیانہ ادبی اور ہلکی پھلکی شوخ و شنگ تحریریں نہ ابھی تک انتخاب کی گئی ہیں ۔ اور نہ یکجا ۔ صدق جدید کے بے نام ور مدیر بے باک ترجمان مشرق تھے ۔ اکبر الٰہ آبادی مولانا شبلی نعمانی اور علامہ اقبال کی اس عظیم روایات کا تسلسل انھوں نے نہ صرف برابر قائم رکھا ہے ۔ بلکہ اس سے آگے بھی بڑھایا ہے ۔ ان کے یہاں قوم و ملت کا بڑا گہرا درد تھا ۔ جس نے ان کے قلم کو بے لاگ ۔ نڈر اور باغی بنا دیا تھا ۔ حریت فکر ان کے یہاں سرفروشی کی حد تک تھی ۔ وہ ایک انتہائی جری اور بیباک ادیب و صحافی تھے ۔ ان کے ایک ناقد نے لکھا ہے ۔ کہ ان کے طنز میں خشونت ہے ۔ شاید کسی بھی طنز نگار کو اس سے زیادہ خراج تحسین پیش نہیں کیا جا سکتا ۔ خشونت ہی دراکی و بے باکی کی وہ منزل ہے جو طنز نگار کو بہت مقبول بناتی ہے ۔ خشونت کی نمو حریت فکر سے ہوتی ہے ۔ جو ہمارے اردو ادب میں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے ۔

اس میخانے کے ساقی اور سنارے میخوار سب مصلحت وقت کے اسیر ہیں۔ اور تقریباً سبھی بادہ خود غرضانہ سے سرشار اور مدہوش نظر آتے ہیں۔ نفسی نفسی کی اس تاریخ گھٹا میں کبھی کبھی حق گوئی کے کوندے لپک جاتے ہیں جن کی روشنی میں مختلف اہل قلم اپنے اپنے حقوق کے لئے بلا کسی طمع کے صدائے احتجاج بلند کرتے نظر آ جاتے ہیں۔ ورنہ مطلع ادب و صحافت پر صدق کی اجتماعی بجلیاں چمکتی نظر آتی ہیں۔

صاحب صدق کا نثری اسلوب موضوع کے عین مطابق ہوتا تھا۔ اپنی مذہبی، دینی تحریروں اور تفسیر قرآن میں ان کا انداز عالمانہ وقیع اور پرشکوہ ہوتا تھا۔ لیکن سلاست کے ساتھ عالمانہ۔ فلسفیانہ اور تحقیقی مضامین میں ایک عالم، ایک فلسفی یا ایک محقق کی شان تصنیف وہ برقرار رکھتے تھے۔ اپنی ادبی و صحافتی تحریروں میں وہ سادگی و سلاست سے کام لیتے تھے۔ ان کے نپے تلے جچے چھوٹے چھوٹے جملے برجستہ فقرے۔ محاورے اشعار اور مصرعے۔ تراکیب اور بولتے ہوئے رواں دواں الفاظ۔ پھر الفاظ بھی کیسے کہ جو الفاظ جہاں رکھ دیئے ٹلائے نہیں ہٹ سکتے۔ انگشتری میں نگینے کی طرح چمکتے ہیں۔ ان کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عبارت نہایت چست اور متحرک ہوتی ہے۔ جاندار اور بے جان نثر۔ ڈھیلی ڈھالی اور پھیکی تحریر کا اس گلستان ادب میں گذر نہیں۔ یہاں شوخی و تازگی ہے۔ تراوٹ و جدت ہے۔ ندرت و الجھاؤ ہے۔ طباعی ہے حکیمانہ آنچ ہے سرخی ایسی جاتی جاتی ہے کہ طبیعت پھڑک اٹھے۔ چٹکی ایسی ہوتی ہے کہ بے اختیار تڑپنے والے کی زبان سے واہ واہ۔ سبحان اللہ نکل جائے۔ اظہار مدعا میں ایسے بے باک اور منہ پھٹ کہ دوسرا جو دل میں سوچتے ڈرے وہ ان کی خنجر قلم کی نوک پر دھری رہتی ہے۔ ترکوں کی طرح ڈرنے کا سوال نہیں۔ مگر یہ تو آج کل بیگم کی فوج سے نہیں ڈرتے۔ اس نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔

کر وہ نثر نگار کے پیچھے ہاتھ باندھ کر چلتی ہے یہ جدھر اور جیسے چاہیں اسے موڑ دیتے تھے۔ اس نثر میں شگفتگی و شادابی ہے۔ بشاشت اور خوش فکری ہے۔ سادگی اور روانی ہے۔ یہ نثر دل میں جاکر بیٹھ جاتی ہے۔ یا اس کے دھمکے دل اور دماغ میں محسوس ہوتے ہیں۔ اس میں کسک۔ اثر اور دھمک ہے۔ یہ بالکل ان کے ہاتھ میں ہے۔ کہ وہ اپنے پڑھنے والے کو جہاں چاہیں خوش یا اداس کر دیں۔ یا سوچنے اور سر دھننے پر مجبور کر دیں۔ ان کا لہجہ ان کے موضوع پر منحصر ہے۔ اگر تحریر ادبی ہے تو لہجہ انتہائی شیریں۔ سبک اور ادبی ہوتا ہے۔ لیکن تحریر اگر صحافتی ہے تو پھر اس میں لہجہ احتجاجی۔ بلند اور شوخ ہوتا ہے۔ لہجہ میں طنز اور طراری ہوتی ہے۔ یا محاسبے والا انداز ہوتا ہے۔ عام طور پر ان کا لہجہ بلند بانگ پر شکوہ یا پھر یاسیف و کرب میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اس لہجہ میں درد والم اور فکر جنوں کی آمیزش ہوتی ہے۔

صاحب صدق کے ادبی مضامین کا دائرہ بہت وسیع ہے اور جملہ نثری اصناف اپنے پورے علمی و ادبی طمطراق کے ساتھ "سچی باتیں" کے کالم میں یا شذرات کے تحت نظر آتی ہیں۔ یہ مضامین مذہبی۔ تحقیقی۔ فلسفیانہ۔ علمی یا ادبی ہوتے ہیں۔ ان میں طنزیے۔ مرقعے۔ انشائیے۔ خاکے۔ آپ بیتی۔ سفرنامے۔ تقاریر۔ معاشرتی جھلکیاں۔ منظر کشی۔ تراجم اور تبصرے وغیرہ ہوتے ہیں۔ صاحب صدق کے عنوانات دیکھیے کیسے بولتے ہوئے ہیں۔

"سچی باتیں،" "خوشامدیوں کے نرغے" "اندر سبھا کی ایک جھلک"، "فتح سنگھ کی فتح"، "کاغذ میں سیکولرزم"، "قانون کی دھجیاں"، "تعصب کی یلغار"، "گنوگھگتوں سے"، "جرأت کی قدامت"، "بلندیوں کی پستیاں"، "عزت مآب سے تمسخر"، "بے غیرتی کی منطق"، "نظام خوش انجام"، "چھاگلہ ازم"، "بے جانداریں"، "یکجائی منطق"، "در مدح خود می گوئند"، "ایک سادہ جیک"، "حکومت قہری"، "بزدل سورما"، "منصب کا جرمانہ"، "ایسے دلیسے کیسے کیسے ہو گئے"، "خیر سگالی صبح تک"، "بہ مہا خوشامد"، "تیز مرچ کی چاٹ"، "ناگفتنی پر

گفتگو،، ہوا کے رُخ پر،، پرسنل لا ،، پرعقبی حملہ،، دیر ہے اندھیر نہیں،، دیر و حرم کی یکجائی،، جہاں بات بنائے نہ بنے،، پرانے ذات شریف،، روشن خیالوں کی سٹ ملا پہاڑ کھودنے کے بعد،، بڑوں کی ہاتھا پائی،، بے خبری کا ریکارڈ، شکاری اپنے ہی جال میں،، مجسٹریٹ پاسبان کے روپ میں،، شرفائے شہر کی ڈھیلے بازی ،، مولانا محترم عریانیت ۔ اردو دشمنی ۔ مسلم بیزاری ۔ مذہبی مقامات کی بے حرمتی ۔ منافقت ۔ سائنسی استحصال ۔ تہذیب سے عاری فلمیں ۔ مہاتما گاندھی کی تعلیمات سے بے اعتنائی ۔ مغربی ریشہ دوانیوں ۔ ممالک اسلامیہ کی بے عملی بے دینی فرقہ واریت تخریب کاری ۔ خوشامد ۔ ارباب نشاط ۔ جنسی بے راہ روی ۔ فرقہ وارانہ فسادات ۔ فرقہ پرست تنگ نظر جماعتوں ۔ اسراف بے جا ۔ جدید جرائم ۔ کاغذی سیکولرزم ماضی سے بے تعلق ۔ اردو فارسی اور عربی تعلیم سے بے پروائی ۔ مسلم اداروں پر تعصب کی یلغار ۔ قانون کی بے حرمتی اور بے دینی کے خلاف ایک مسلسل احتجاج اور جہاد میں مصروف تھے ۔ ان کا اصل رنگ مذہبی ہے ۔ یہ رنگ ان پر کھِلتا ہے اور کھِلتا ہے ۔ بے گانگئ مذہب ۔ مسلم پرسنل لا ۔ ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں ۔ رنگین جھوٹ وہ ہے تو یہ سفید جھوٹ بلا تبصرہ ۔ گانے جیسے گلزاری لال ۔ کچھ جنوں میں بھی آمیزش دانائی ہے اس گل دیگر شگفت ۔ ایک خوشخبری جو خوش خبری نہیں ۔ اپنا چہرہ آئینے میں ۔ محمود اور ایاز ایک صف میں ۔ ایک سادہ چیک ۔ ایک بے وقار قوم ۔ خیر سگالی سے صبح تک ۔ بیک گردش نیلوفری ۔ نئی سیر ایک حادثہ ٹلی ۔ پھر وہی نیش زنی اور تعصب کی رد میں اس کی روشن مثالیں ہیں ۔ ’’سچی باتیں،، میں یہ رنگ بھی ملاحظہ فرمائیں ۔

’’ واعظ دین کی ذمہ داری یوں بھی بڑی ہوتی ہے ۔ دین کے نام سے زبان بہت سوچ سمجھ کر اور اپنے بول کو بہت سوچ سمجھ کر اور تول کر کھولنا چاہیئے ۔ ... بیان کردہ بیان حرم کعبہ میں ہو رہا ہو ۔،، (ایک ہندوستانی عالم نے ایک بڑے ہندوستانی عالم کو مدینہ منورہ میں یہ ارشاد فرماتے سنا کہ ’’ ٹیکہ لگوانا بہت

بڑا کام ہے۔ اس لئے کہ یہ توکل کے منافی ہے) اس پر صاحب صدق فرماتے ہیں کہ
"اور اگر علاج ہی ہر صورت میں ناجائز ہے تو پھر اس دنیا میں اسباب سے
تمسک اور توسل اور تدبیر سے کسی شعبۂ زندگی میں بھی کام لینا کس طرح جائز ٹھہرے گا۔
کیا مصیبت ہے کہ جہاں ایک طرف ہر جدید چیز لذیذ ہے۔ عزیز ہے ممدوح ہے۔
اندھا دھند لینے بلکہ اچک لینے کے قابل ہے۔ وہاں دوسری طرف ہر جدید چیز مردود
ہے۔ اچھوت ہے کھینے اور وحشت کھانے کے قابل ہے۔ اور دینداری مترادف سا
ہے قدامت پرستی کے" (صدق جدید، ۲ر جنوری ۱۹۶۰ء)
صاحب صدق کی وسعت نظر اور دقت نظر کی ایک جھلک ان کے
تحقیقی مضمون "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" (جدید ایڈیشن) میں ملاحظہ ہو
"جہاں تک کوشش و کاوش۔ تلاش و تفحص کا تعلق ہے مغربیوں کے
یہ کارنامے ہمارے لئے قابل رشک ہیں۔ معلومات کن کن گوشوں سے اور کہاں
کہاں سے لے آتے ہیں۔ کہ ہم مشرقیوں کا ذہن بھی وہاں تک نہیں پہنچتا۔
اور ان کے یہاں سے نادر کتب خانے ہماری دسترس میں کہاں ہیں۔ جو مصیبت
اور شامت یہ ہے کہ چونکہ ان کی تخلیقات کی بنیاد کج ہے اس لئے نتائج کی دیوار
سر بفلک کھڑی کرتے ہیں۔ تو وہ ٹیڑھی ہی چلی جاتی ہے اور عقائد تمدن اور
جزئیات سیرت نبوی سے متعلق یہ کجی اتنی شدت سے نمایاں ہو جاتی ہے۔ کہ ان
کی تخلیقات کا پڑھنا ہی ضرر آزما ہو جاتا ہے۔ (صدق جدید ۲ر دسمبر ۱۹۶۲ء)
صاحب صدق کے فلسفیانہ مضامین کی ایک جھلک "تخلیق
کا سدا بہار کاروبار" میں ملاحظہ فرمایئے۔
"کائنات پھیل رہی ہے اور وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔
ستارے ہم سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ کائنات کسی انجانی منزل کی طرف بڑھتی
جا رہی ہے۔ بڑے بڑے سیل ٹنس مضمون اور مقالے آج کل اس قسم کے فقرے سے
بھرے ہوئے دکھائی دیتے بلکہ کسی کسی مقالے کی تو سرخیاں بھی پائی گئیں۔ گویا سائنٹ

دنیا کے لئے یہ کوئی اہم اور نئے انکشاف ہیں۔ خیر وہ سائنس دنیا کے لئے کچھ بھی ہوں۔ مذہبی دنیا کے لئے تو یہ کھلی ہوئی اور بیّن یا خالص حقیقتیں ہیں خالق کائنات کی قوت تخلیق جب معطل نہیں ہوئی ہے تو آخر جس طرح چرند پرند ہر قسم کے جانور اور بحر و بحر۔ ہر طرح کے نباتات و جمادات ہر روز نئے نئے وجود میں آتے رہتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ نئے نئے ستارے وجود میں آتے رہتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ نئے نئے ستارے اور چاند و سورج نہ پیدا ہوتے رہیں۔ آسمانوں اور کہکشاؤں کی آفرینش کیا اب بند ہو گئی ہے؟ آخر یہ فرض ہی کیسے کر لیا گیا کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَاۡنٍ میں کیا کوئی استثنا بھی ہے۔ (صدق جدید ۱۲ اکتوبر ۶۷ء)

صاحب صدق جدید سراپا علم تھے ان کے علمی مضامین کی نہج پوچھئے تو ایک زمانے میں دھوم ہے۔ ان کی بھی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

"تاریخ طب یونانی اس میں تفصیل کے ساتھ دکھایا جائے کہ فن کی ابتدا، کس ملک سے کس زمانے میں ہوئی۔ دنیا میں اور کون سی طبیں رائج تھیں۔ یہ نام طب یونانی کیوں ہوا؟ اور کب سے پڑا؟ بانی۔ امام۔ مجدّد۔ مجتہد کون سے گذرے ہیں۔ ترمیم۔ ترقی تکمیل کے مدارج کیونکر طے ہوتے رہے ہیں۔ یا موجودہ دور میں فن کس منزل پر ہے۔ وغیرہ اور ازا سے اس کے موجودہ مرتبے تک پہنچاتے میں کتنا بڑا حصہ اطبا ہند کا رہا ہے۔"

(تاریخ اطبا ہند صدق جدید ۱۳ جنوری ۱۹۶۷ء)

صاحب صدق کی ادبی تحریروں میں بڑا زجادُ اور اسلوب کا بانکپن پایا جاتا ہے۔ ان کے انشائیے کے چٹخاروں کا مزہ لینا ہو تو علی گڑھ مرحوم، ایک آرٹسٹ، "ایک پرانی خانقاہ"، "بڑتالیس"، "دو دن بھوپال میں"، "یہ نانیاں دادیاں پرانی چشمک"۔ "دور الہلال کے مولانا ابوالکلام"۔ جدت کی قدامت، "نظام خوش انجام"۔ عمر کا چھتّرواں سال۔ قصبہ گدیہ۔ گڈ فرائی ڈے۔ موسم۔ سرکاری تقریب میں۔ مسلمان صدر جمہوریہ۔ انسان کی بے بساطی۔ اثر لکھنوی مرحوم۔

جوش وناقی سید حسین مرحوم کی ایک یاد۔ اقبال کا شکوہ ۔خاندانی قبرستان محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس۔ احمد غریب مرحوم۔ ریل کا سفر۔ راجے مہاراجے۔ نئی دنیا والے۔ عظیم باپ اسٹالن۔ تخلیق کا سدابہار کاروبار۔ کنکوے کا مقابلہ تقریر بے تاثیر۔ اور دوسری بھی باتوں اور ان کے دیگر شذرات کا مطالعہ کریے۔

ایک نمونہ، "چند گھنٹے علی گڈھ میں۔" دیکھئے۔ سرور صاحب۔ صدر اردو شعبہ کا ساتھ سفر میں لکھنؤ ہی سے ہوگیا تھا۔ اور کہنے والے کی زبان پراس وقت آگیا۔ تھا۔ کہ، جب سرور رفیق سفر ہو تو اب غم کیا ہے۔ اور بات ٹھیک ہی نکلی۔ سرور صاحب کی معلومات سے اردو ادب کی کتابوں سے متعلق نہ صرف اثنائے سفر میں استفادہ ہوتا رہا بلکہ علی گڈھ پہنچ کر دوسری صبح کو انھوں نے اچھا خاصا وقت میرے لئے نکالا۔ اور آزاد لائبریری میں اپنے ساتھ لے جاکر اردو لغت کی کمیاب اور نایاب کتابوں کا بڑا ذخیرہ میرے لئے نکلوایا۔ اور اس کے متعلق اپنی معلومات سے پوری مدد فرماتے رہے جتنا وقت ان کے ساتھ گذرا ایک طالب علم کا ایک صاحب علم کے ساتھ گزرا۔ اور دل ان کے شکریے سے لبریز رہا۔ (صدق جدید ۹ دسمبر ۱۹۶۲ء)

یادرفتگاں کے سلسلہ میں صاحب صدق نے جو اگلے وقتوں کے لوگوں کے خاکے کھینچے ہیں۔ ان کو اگر مرقعہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ان خاکوں (میں اختصار ہے۔ وہی اختصار ہی صدق کا طرۂ امتیاز ہے۔ اثر لکھنوی۔ اسٹالن۔ عطیہ فیضی۔ مولوی مسعود علی رضوی۔ علی عباس حسینی شفاء الملک حکیم عبداللطیف۔ مولانا عبدالاخر علی تلہری۔ شفاء الملک خواجہ شمس الدین۔ اور احمد غریب مرحوم وغیرہ کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اگر ان کا مقابلہ ان طویل ترین عالمی مقالات سے کیا جائے۔ جو ان سب پر لکھے گئے تو یہ بہت بھاری پڑیں گے۔ دوسرے کے مضامین کے بارے میں کچھ کہنا بے سود۔ صرف مولانا موصوف کی زعفران کی ایک پڑیا گھولی جاتی ہے۔

مولوی مسعود علی رضوی مرحوم ... شہرت نے لڑکپن ہی سے قدم لینے شروع کردیے تھے۔ آج طلباء کی اس ٹولی کے سردار کل اسٹرائک کے علمبردار مولانا شبلی پر اپنے جس خدمات سے سکہ بٹھایا تھا۔ استاد کی وفات کے وقت جب علمی جانشینی کی دستار فضیلت سید سلیمان کے سر بندھی تو دارالمصنفین کے پریس اور سارے کاروبار کی منیجری کی خلعت انہی کے جسم پر راس آئی اور مدتوں اسے خوب ہی انھوں نے نبھایا۔ ٹینس کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے۔ شکار کے شوقین اور دوڑ دھوپ کے ہر کام میں منجھے ہوئے تھے۔ سانپ کو دوڑ کر مارتے تھے خوش انتظامی، خوش دماغی اور جفا کشی کے پتلے تھے۔ اور زندہ دلی، شگفتہ مزاجی کے بادشاہ۔ روتوں کو جب چاہا ہنسا دیا۔ روٹھوں کو جب چاہا منالیا۔ نام مسعود کی مناسبت سے سالار مسعود غازی ہم نیازمندوں کی زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ مزاحاً مجھے میاں کہہ کر مخاطب کرتے رہتے۔ اور میں نے بھی جواب میں انھیں استاد کہنا شروع کردیا۔ (صدق جدید ۸ ستمبر ۶۷ء)

آپ بیتی لکھنا بھی ایک ہنر ہے۔ کتنوں نے لکھی ہوگی مگر مولانا مرحوم کا انداز بڑا ہی البیلا تھا۔ اپنے حالات عنوان ذیل کے تحت لکھتے ہیں....

عمر کا پچھترواں سال ۔ پیدائش وسط مارچ ۱۸۹۲ء کی ہے اس حساب سے آج عمر کا پچھترواں سال شروع ہوگیا۔ بات کہتے میں ۵ سکینڈ میں ختم ہوگئی حسرتوں کا دفتر جو اس کے عقب میں ہے اس کی شرح و بیان میں اگر آیئے تو گھنٹوں اور دنوں ہفتوں اور مہینوں کا کیا ذکر ہے ساری عمر کی عمر کو ناکافی پایئے۔

بچپن میں کسی کا سن چالیس پچاس کا سن لیتا تو یقین کرلیتا کہ وہ پورے بڑھاپے کو پہنچ چکا۔ جب اپنا سن چالیس کا ہوا تو دل نے کہا کہ سب غلط ہے ابھی تو پورا جوان ہی ہوں۔ جب پچاس کا ہوا تو نفس نے کہا تو نفس نے ایک بار پھر تاویل کی کہ بڑھاپا ابھی دور ہے اب تو ادھیڑ سن کا ہوا

ہوں دس سال کی لمبی اور بظاہر بہت بڑی مدّت بھی آناً فاناً اور گذر گئی اور اب واقعہ کی تکذیب کی مزید سکت نہ رہی۔ پھر بھی دل (اول دل یعنی نفس) جوان کا جوان ہی رہا۔ کسی حرص و ہوس میں۔ غفلت میں حب دنیا میں۔ کوئی فرق نہ آنے پایا۔ ۶۵ کی منزل آئی اور پھر ۷ کی یہاں تک کہ اب ستر ویں شروع ہو گئی اور اب بس نہیں چلتا کہ عمر گریزاں کی برق روی کو روک دیا جائے۔ ماہ و سال کے حساب کو ہاتھ لگا دیا جائے اور دنیا بھر کی جنتریوں اور کیلنڈروں کو پھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ بڑھاپا کیسا۔ ہر آرزو تازہ ہر ہوس زندہ۔ نفس کا ہر شعلہ دہکتا ہوا۔ پیدائش ایک کھاتے پیتے اور دیندار گھرانے میں ہوئی۔ نعمتیں بے شمار حاصل ہوئیں۔ دنیا کے لطف ہر طرح کے دیکھے۔ بہار کے ساتھ خزاں بھی آتی اور گذرتی رہی۔ پڑھنے لکھنے کی ہوس گویا مادر زاد تھی۔ اس کے طفیل نوجوانی میں فرنگی علوم کا نشہ سوار ہوا۔ اور بدمستی الحاد۔ عقلیت اور لاادریت کے دروازے تک کھینچ لائی عمر عزیز کے دس سال اس گمرہی اور برگشتگی کی نذر ہو گئے۔۔۔ اس کے بعد اسم ہادی کی تجلیات نے پھر زور باندھا اور جس طرح دبے پاؤں ایمان کی رونق رخصت ہو گئی تھی۔ اسی طرح تشکیک و انکار کی تاریکیاں بھی کافور ہوئیں اور پھر قسمت نے دستگیری کر کے مرشد تھانوی ؒ کے آستانہ تک پہنچا دیا۔ طبعی حادثے اور ایسے ہی سب کو دیکھنے پڑتے ہیں۔ اپنے حصہ میں بھی آتے رہے۔ جیسے ماں باپ کو بھائی بہن کی اور چھوٹی اولاد کی مفارقت۔ اور ہر زخم اپنی جگہ بھرپور ہی پڑا۔ عقلی دینی اور ایمانی نوعیت کے صدمے جو اٹھانے پڑے وہ ہوش ربا بھی تھے۔ کون جان سکتا تھا کہ خلیفۃ المسلمین کا شرعی منصب جو تیرہ سو سال سے مسلسل نسل بہ نسل چلا آ رہا تھا۔ یوں خاموشی کے ساتھ اور دفعۃً ختم ہو جائے گا۔ اور ادارۂ خلافت رسول کو دنیائے اسلام یوں بھول جائے گی جیسے یہ کبھی تھا ہی نہیں۔ اور رہا

ہندوستان کے اندر کا انقلاب دورِ انقلاب تو کوئی اس کے تاثرات ملفوظ و عبارت کی بسیط قید میں کیونکر آتے۔ ان آنکھوں نے اپنے سامنے اٹھتے ہوئے پیکرِ ایمان صدق، "محمد علی" اور حسرت موہانی کو دیکھا۔ شبلی کو دیکھا۔ اقبال کو دیکھا۔ بہادر یار جنگ کو دیکھا۔ شقاوتِ قلب کا یہ عالم رہا کہ قدر ان میں سے کسی کی بھی نہ کی۔ مرتبہ ان میں سے کسی کا نہ پہچانا۔ جو کچھ بھی دیکھا اس کے بعد شاعر کی ہدایت تو یہ تھی کہ۔۔

وقتِ طلوع دیکھا وقتِ غروب دیکھا اب فکرِ آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا۔

یہاں فکرِ آخرت مرتبۂ فکر میں کیا ہوتی۔ معمولی اور درجہ اوسط کی بھی نصیب میں نہ آئی۔ اور حقوق کی ادائیگی کی توفیق نہ خالق کے مقابلے میں ہوئی اور نہ مخلوق کے۔ حق ادا نہ بڑوں کے ہوئے نہ چھوٹوں کے نہ شاگردوں کے نہ پڑوسیوں کے اور نہ اہلِ خدمت کے۔ طاعتوں سے کورا اور عبادتوں سے معرّا۔ جس طرح آغاز میں تھا معلوم ہوتا ہے کہ انجام تک وہ نقشہ نہ بدلا۔ لکھنؤ میں ایک شاعر تھے (ماجس لکھنوی) اور غزل سے بڑھ کر ہزل سے ذوق رکھنے والے لیکن قادرِ المطلق جس کی زبان سے جو چاہے سنوا دے۔ ان کا یہ شعر جب پہلی بار سننے میں آیا تو جسم پر ایک سناٹا سا چھا گیا۔۔ ؎

محشر میں جو شیخ آئے تو اعمال ندارد
جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

اوروں نے کہا کہ یہ کسی اور کے بارے میں حق میں ہو یا نہ ہو اس کم نصیب کے حق میں تو ضرور ہے۔ اس پر خود غلط کو تھوڑا بہت بھروسا اپنی خدمتِ قرآنی کا ہے۔ حالانکہ اس سارے دفتر میں اس کے سوا اور ہے ہی کیا کہ کچھ اس کتاب سے نقل کردہ اور کچھ اس کتاب سے۔ تو جب عوامی زبان میں یہ شیخ کہلانے والے قبر پر لائے گئے تو وہاں قدر نا پرسش اقوال کی ہیں۔ الفاظ

کی نہیں اعمال کی ہوئی۔ یہاں ان کا سرمایہ تھا ہی کہاں جو پیش ہوتا۔ اعمال ندارد۔ جو کچھ تھا وہ تو صرف مال تجارت تھا کہ دوسروں کو کچھ دیا۔ کچھ سنا دیا۔ کچھ بتا دیا۔ اس کاروبار سے اپنی اصلاح کیا ہوتی۔ اپنے قلب میں تزکیہ اور تصفیہ کیا ہوتا۔ اپنی روح میں جلا کہاں سے پیدا ہوئی۔

"جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد"

عین اس وقت تفسیر کا مسودہ نئے ایڈیشن کے لئے صاف ہو رہا ہے۔ بلکہ کچھ حصہ کی کتابت بھی ہو چکی ہے۔ اس جدید مسودہ کی تیاری میں ترمیم و اضافے میں حک و اصلاح مہینوں کی نہیں برسوں کی لگی ہے۔ لیکن یقین کیجئے جب بھی کسی پچھلے مسودے پر نظر پڑتی ہے بس جی یہی پکار اٹھتا ہے کہ اسے تو رد ہی کر دیجئے۔ یہ چھپنے کے قابل ہی نہیں بس اپنے ننگ خلائق کے کام کی لاج رکھنا تو بس اسی کا کام ہو سکتا ہے۔ جو اگر چاہے تو مقہوروں کو مقبولیت سے نواز دے۔ اور ارادہ کرلے تو ابلیس تک کو پروانۂ مغفرت سنا دے۔ (صدق جدید، ۱۱ر مارچ ۱۹۶۴ء)

صاحب صدق کے سفر نامے خاصے دل چسپ ہیں۔ ان کی نگاہ سیاح کی اور جزئیات کے بیان میں داستان طرازی کا اندازہ عام ہے۔ سرکاری جس میں عربی اسکالر کی سند اعزاز انھیں پیش کی گئی تھی اس کے بارے میں دیکھئے ان کا قلم کیا گل کھلاتا ہے۔

"دربار میں حاضری کا زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ اللہ اللہ کیا شان و آن۔ کیا جاہ و جلال۔ زینت و جمال کا کمال اگر شاہی محل میں بھی نہ ہو گا تو اور کہاں ہو گا؟ کمروں کی تعداد۔ برآمدے۔ ہال۔ گیلریاں۔ صحن۔ چمن۔ نشاط خانے۔ کھیل گھر۔ تالاب۔ حوض۔ غسل خانے۔ باورچی خانے۔ خدا معلوم کتنے وسیع و بلند برآمدے۔ قدم قدم پر چوکی۔ پہرے۔ باہری پھاٹک پر ایک دربانوں۔ چوبی داروں کی پلٹن۔ بلکہ دار مسلح سپاہیوں۔ محافظوں کی فوج۔

کی فوج اور اس کے درمیان وہ رہ رہا ہے۔ جو جمہوریہ ہند کا صدر ہے۔ قیام کل ڈیڑھ دن رہا۔ دلی جیسے غدار شہر میں یہ مدت ہی کیا ہوئی۔

(صدق جدید ۵ مئی ۱۹۶۷ء)

چند گھنٹے علی گڈھ میں کے لکھتے ہیں

...رقبۂ یونیورسٹی کی توسیع۔ شاندار عمارتوں کی افزونی۔ لائبریریوں کے اندر کتابوں کا اضافہ۔ ان سب چیزوں کو نہ پوچھئے۔ چلتے چلتے تھک جائیے۔ اور عمارتوں کا سلسلہ ختم نہ ہو۔ یہ میڈیکل کالج۔ وہ پالی ٹکنک۔ یہ فلاں ہوسٹل وہ فلاں لیبارٹری۔ اور بڑی آزاد لائبریری کے علاوہ نسبتاً چھوٹی اسلامک اسٹڈیز لائبریری کی حدود میں اگر پہنچ جائیے تو سامان اپنے اندازہ اور شوق سے بھی کہیں بڑھ کر پائیے۔ آنکھیں پڑھتے پڑھتے تھک جائیں گی اور کسی ایک شعبہ کا ادنیٰ جز بھی احاطہ میں نہ آنے پائے۔ علوم و فنون جیسے کچھ وہ ہیں ان کی تحصیل اور ان میں تکمیل کے لئے بہترین اڈے۔ (صدق جدید ۹ دسمبر ۱۹۶۲ء)

دو دن بھوپال میں بھی اس سلسلہ کی خاص تحریر ہے۔ مگر اس میدان میں ان کا اصل کارنامہ ان کا حج کا سفرنامہ ہے۔

صاحب صدق کے بڑے کارناموں میں ان کی بہترین نثری تقاریر کا بھی شمار رہے گا۔ منشی سجاد حسین اور "طرحدار لونڈی" اکبر الہ آبادی۔ مرزا رسوا اور وہ امراؤ جان ادا" اور اس طرح کے نہ جانے کتنے علمی ادبی، تہذیبی گوشے ہیں جو نشریات ماجد میں محفوظ ہیں۔ عام طور سے وہ عام اور ادبی جلسوں میں تقریر نہیں کرتے تھے۔ لیکن عرصہ بعد ۳۰ ستمبر ۱۹۶۲ء طلبائے ندوہ کی مجلس اصلاح کے جلسۂ توسیع خطبات میں انھیں تقریر کرنا ہی پڑی۔ اس تقریر با تاثیر کی جھلک ملاحظہ ہو۔۔۔

"صورتیں اتنی نفیس۔ سیرتیں اتنی پاکیزہ لیکن جب زندہ دلی کا شگوفہ چھوڑنے پر آئیں۔ تو اچھے اچھے دل لگی بازوں کو نیچا دکھا دیں۔ علی گڈھ اور ندوہ کے

درمیان نہ وہ بیگانگی ہے اور نہ دوری جو فرض کرلی گئی ہے۔ راہیں الگ الگ ہوں۔ درمیانی منزلیں بھی الگ ہوں لیکن دونوں کی ایک ہی منزل مقصود۔ اور وہ کیا۔ یہی امت کی فلاح و بہبود۔ بس فرق اتنا کہ ایک نے لائبریری اور لیباریٹری کو اپنایا۔ اور دوسرے نے اپنا دل محراب و منبر سے اٹکایا۔ پیام دینا تو ندوہ کا کام تھا خوش ہوئیے کہ آج اسے دوسرے کا پیام سننے کی توفیق ہو رہی ہے۔

گفت سے کچھ کم نعمت یہ شنود حق کی بھی نہیں ۔ صدق جدید ۱۷ اکتوبر

صاحب صدق مشرقی تہذیب و تمدن کے ترجمان و پاسبان ہیں ان کی تحریروں میں معاشرتی جھلکیاں ہر رنگ میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ کس بے باکی کے ساتھ لکھتے ہیں۔

جگت گرو کے چرنوں میں ۔ نئے صدر جمہوریہ جب کرسیٔ صدارت پر بیٹھنے سے کچھ قبل جگت گرو سنکر آچاریہ کی خدمت میں آشیرواد لینے کے لئے حاضر ہوئے تو شنکر آچاریہ جی کے پیر بھی چھوئے۔ یہ موقعہ فخر و مباحات کا یقیناً ہے۔ کس کے لئے؟ آیا خود شنکر آچاریہ کے لئے کہ ملک کے صدر کا سر ان کے آگے یوں جھکا یا صدر محترم کے لئے جنھیں جگت گرو کے پیر چھونے کی اجازت مل گئی۔ صدق جدید ۲۶ مئی ۶۷

اہل سیاست کی بد عنوانیوں پر لکھتے لکھتے ان کی بد اخلاقی کے بارے میں

"**شرفا، شہر کی ڈھیلہ بازی**" کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

"راجدھانی یعنی دہلی کی میونسپل کارپوریشن کے جلسہ منعقدہ ۱۱ اکتوبر میں ۱۰ منٹ تک کانگریس اور جن سنگھی ممبر ایک دوسرے سے گتھم گتھا اور گھونسے اور مکے چلتے رہے۔ ایک دوسرے پر پیپر ویٹ پھینکے گئے۔ ایک چپراسی زخمی۔ کارپوریشن میں لیاقتی کا بے مثال منظر ایک ممبر کی شرٹ جھیتڑے جھیتڑے۔ کاغذات اور میزیں ڈیسک اور مائیکروفون سب الٹ پلٹ دیئے گئے۔

آزادی ملک میں آئی لیکن آزادی بن کر نہیں یکسر طوفان بے تمیزی بن کر۔ ملک کا کون سا خطہ اور زندگی وطن کا کون سا شعبہ اب بھرپور نفرت

انگریزوں سے خالی ہے۔ کاش یہ آزادی نہ ملی ہوتی۔ ملک سدا محکوم ہی رہتا لیکن ہماری شرافت ہماری تہذیب و شائستگی کو دھبہ تو نہ لگتا۔ اور ہمارے آبائے شہر ایک ایک دوسرے سے بڑھ کر دھینگا بازی تو نہ سیکھی ہوتی۔ (صدق جدید) ۳ نومبر ۶۷ء

منظر کشی میں صاحب صدق کا قلم فوٹو کیمرہ کے مترادف ہے۔ جس چیز کا بیان کرتے ہیں اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رقصاں ہو جاتا ہے۔ انسان کی بے بساطی کا نقشہ کھینچتے ہوئے مدھیہ پردیش اسمبلی میں کارروائی کے دوران معزز ممبروں پر شہد کی مکھیوں کے حملے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"چائے کے لئے آگ جلی تو دھواں پیدا ہوا۔ اور دھواں چھتّہ تک جا پہنچا۔ مکھیاں بھڑکیں اور بگڑیں اور غضبناک ہو کر حملہ آور ہو گئیں۔ ان کا حملہ معاذ اللہ۔ گولی اور گولہ سے بڑھ کر بے پناہ۔ ابھی چپراسی کو کاٹا۔ ابھی دربان کو جھنجھوڑا۔ یہ آئیں وہ آئیں۔ اور لیجئے اب حملہ وزرات مآبوں پر شروع ہو گیا۔ نہ چوکیداروں کی لاٹھیاں کام آئیں۔ نہ کانسٹبلوں کے ڈنڈے۔ نہ منصب و مرتبہ کا رعب سپر بن سکا وزیر با تدبیر اعزاز و وقار کا خیال کئے بغیر بے تحاشہ بھاگے۔ کسی نے کمبل کے اندر گھس کر جان بچائی۔ کسی نے غسل خانے کے اندر اپنے کو بند کر لیا۔ جب کہیں مصیبتوں سے جان بچی۔ صدق جدید ۶ا جنوری ۶۷ء

ترجمہ صاحب صدق کا خاص میدان ہے۔ وہ اس کے مرد میدان بھی ہیں اور سالار کارواں بھی۔ عربی فارسی۔ انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں سے ان کے اردو تراجم عربی و علمی حلقوں میں گذشتہ نصف صدی سے داد تحسین کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

صاحب صدق کا کارنامہ "تفسیر ماجدی" ہے۔ فلسفہ مذہب اور دوسرے علوم و فنون کے بارے میں ان کے بیش قدر تراجم کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی ایک سرسری جھلک شاید کافی ہو۔

خلائی جہاز کے سلسلہ میں اس حدیث نبوی کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ . . . .

اس طرح یہ اللہ قوم یاجوج کو اٹھا کر کھڑا کرے گا
اور یہ اوپر بلندی سے لپکتے جھپکتے ہوئے دوڑیں گے
(دنیا میں قتل و غارت کے بعد) پھر کہیں گے کہ زمین
والوں کو تو ہم ختم کر چکے اب آسمان والوں کو ختم کر لیں
پھر آسمان کی طرف اپنا تیر چھوڑیں گے۔ (الحدیث)
اور سب باتوں کو چھوڑیئے۔ سردست خیال اس جزیہ پر جاہیئے کہ اس جدید ترین
اور بے پناہ تجربے پر اطلاق "سیر" کا کس خوبی و صفائی کے ساتھ نگاہ کشفی نے
کر دیا ہے۔ صدق جدید ۱ فروری ۶۰ء

صاحب صدق کے مختصر مگر جامع اور پُر معنی تبصرے ان کے ادب اور
کے بارے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔
تین مسافر۔ مصنفہ ڈاکٹر قطب النساء ہاشمی کے بارے میں لکھتے ہیں۔
ساحل و سمندر (کتاب میں اصل موضوع سے ہٹ کر غیر متعلق باتیں بہت سی
آگئی ہیں۔ اور مولانا شبلی کے باب میں تو ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے قول کو
قابل اعتماد اور کسی حد تک مستند لیا گیا ہے۔ واقعات اور زبان دونوں میں
اصلاح اور نظر ثانی کی گنجائش رہ گئی ہے۔ واقعات میں مثلاً یہ کہ آرنلڈ انگریزی
کے پروفیسر تھے (انگریزی کے نہیں بلکہ فلسفہ کے تھے) یا یہ کہ ان کی کتاب "
پریچنگ آف اسلام" عربی کی تحقیق میں ہے۔ یا کہ مولانا شبلی کی سیرۃ النبی
کی تکمیل میں چودہ جلدوں میں ہوئی ہے۔ یا یہ کہ سرسید کے ایک ہم عمر مفکر مولوی
وحید الدین سلیم بھی تھے۔ یا یہ کہ مسلم لیڈروں میں محمد علی۔ ابو الکلام کی طرح
کوئی صاحب مولانا انصاری بھی تھے۔ اور زبان میں اس طرح کے الفاظ و
ترکیبیں۔ علماؤں۔ واقعات کی کسوٹی۔ ذہین "تبسم" وغیرہ۔ صدق جدید
۲۶ دسمبر ۶۷ء

صاحب صدق کی سچی باتیں ہوں یا شذرات یا دیگر کالم ان ایک بہت ہی واضح اور بہت نمایاں پالیسی ہوتی تھی۔ اور وہ تھی مشرقی اقدار و روایات کی ترجمانی،، ان کی نظر میں ہمیشہ تلخ تر حقائق برگزیدہ تھیں۔ اس لئے ان کی صحافتی تحریروں میں ادبیت کے ساتھ ساتھ اصلاحی طنز کی خاراشگافی نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ جس سے زبانوں کو پناہ ملتی ہے اور نہ برائیوں کو۔ "سچ"،، اور پھر "صدق"،، کا ایک دلچسپ پہلو صاحب صدق کے ادبی معرکے ہیں۔ نیاز فتح پوری۔ جوش ملیح آبادی اور یگانہ چنگیزی سے لے کر حیات اللہ انصاری تک ان کے یہ معرکے ہماری ادبی۔ تہذیبی۔ مذہبی۔ ثقافتی زندگی کے ایک بہت ہی باغ و بہار پہلو ہیں۔ جب بھی اردو ادب کے ادبی معرکوں کی تاریخ مرتب کی جائے گی۔ تو یقین ہے کہ اس کا یہ باب اس اعتبار سے عجیب و غریب ہوگا کہ معرکے کوئی بھی ہوں مگر آخر میدان انہی کے سر رہا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ "صدق" میں ادبی معرکہ کی سج دھج اودھ پنچ سے کم نہیں ہوتی تھی۔ اودھ پنچ کے یہاں ادبی توازن کا اہتمام ذرا کم ہی نظر آتا ہے۔ مگر یہ اس کے تمام فنی آداب برتتے تھے۔ اور کبھی جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹتے تھے۔ اودھ پنچ کا پورا توپ خانہ میدان سر کرنے کے لئے اتر پڑتا تھا۔ مگر صاحب صدق خود توپ خانے کی کمان ایک ماہر جنرل کی طرح سنبھال لیتے تھے اور منزلیں مارنے میں عجلت سے کام لینے کے بجائے موقع کی تاک میں رہتے تھے۔ ان کا جملہ ہمیشہ غیر متوجہ اور فوری ہوتا تھا۔ اور یہ بھی ہوتا تھا۔ کہ حریف کو زک دینے کے لئے ان کی محض ایک پھبتی کافی ہوتی تھی۔ اور لیسپا ہونے والے کا بیان صفائی۔ چنیں اور چناں ہفتوں بلکہ مہینوں جاری رہتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ مولوی مدن والی بات نہ آپاتی۔

آخر بات تو یہ ہے کہ اردو نثر اور اردو طنزیہ ادب میں صاحب صدق مولانا عبدالماجد کی حیثیت ہمیشہ اس لئے رہے گی کہ ان کی

تحریریں ادبی ہوں یا صحافتی۔ طنز و ادب کی دلآویز آمیزش اور فنی خوبیوں کے باعث وقتی یا ہنگامی ہونے کے باوجود مستقل اور دائمی حیثیت رکھتی ہیں۔ ظفر علی خان کو شاعری میں جو ملکہ اور درجہ حاصل ہے۔ کہ ہنگامی اور لمحاتی موضوعات کو انھوں نے ابدیت عطا کر دی ہے۔ وہی شان صاحب صدق کی صحافتی اور ادبی نثری تحریروں میں ہے۔ ان کا قلم لمحہ اور لحظہ کی سچائی کو ایسا اسیر کر لیتا تھا کہ اس کو نہ وقت کی گرما ندکر سکتی ہے اور نہ ہنگامہ کے گزرنے سے کوئی ہنگامہ کی شدت اور تاثیر متاثر ہوتی ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جس نے ان کی تحریروں کو آب حیات بخشا ہے۔ اور کلاسیکی کا بلند درجہ عطا کیا ہے۔

اردو ادب کی طرح اردو صحافت اور طنز و ظرافت کے بقائے دوام کے دربار میں اسی لئے وہ ہمیشہ صف اول میں نظر آئیں گے۔ اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں کی دلچسپی مقبولیت و افادیت میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا۔

مشرقی تہذیب و تمدن۔ ادب و صحافت۔ مذہب و ثقافت کا کوئی تذکرہ نہ ان کے بغیر مکمل سمجھا جائے گا اور نہ مستند۔ ان کی تحریروں کی روشنی میں یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے طنز کی طرح تلخ مگر حقیقت کی یہ تلخی بڑی خوش گوار۔ عزیز اور گوارہ ہے۔

مولانا عبدالماجد بحیثیت شاعر

فیضِ قدرت سے مولانا موصوف کو غیر معمولی شعری و ادبی صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں۔ وہ نہ صرف منفرد نثر نگار، صحافی اور ناقد ہی تھے۔ بلکہ اوائل عمر میں ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے بھی رونما ہوئے تھے۔ ناظر تخلص فرماتے تھے۔ اکبر الہ آبادی کے نام ان کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حضرت اکبر سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اکبر کے ان خطوط سے اگر ایک طرف مولانا کی سیرت و شخصیت ان کے علمی و ادبی مشاغل اور ان کے مذہبی خیالات پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف اکبر کی مردم شناس نظر اور ادب و فلسفہ اور مذہب سے متعلق ان کی وسیع معلومات اور صحیح خیالات کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ یہ آٹھ نو سال کا زمانہ مولانا کی عمر کا بہترین زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ اسی زمانے میں وہ دہریت کے غار سے نکل کر روحانیت کے راستہ پر گامزن ہوئے۔ اس زمانے میں انھوں نے فلسفہ کی گراں بہا کتابیں لکھیں اور ترجمے کئے جس سے اردو ادب مالا مال ہوا۔ اسی زمانے میں مولانا کو شعر و شاعری سے رغبت بھی ہوئی۔ اور اکبر مرحوم نے مولانا کو شعر و شاعری طرف بھی متوجہ کرانا چاہا۔ ان کی سخن شناس نظر نے مسٹر عبدالماجد کے اندر شعر گوئی اور شعر فہمی کی صلاحیت کا اندازہ کر لیا تھا۔ اکبر مرحوم نے مولانا کے بارے میں یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اگر یہ نوجوان شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہو جائے تو بہت جلد اعلیٰ پائے کا حاکم بن سکتا ہے۔ اس لئے وہ مختلف خطوط میں شاعری کی طرف رغبت دلاتے رہے۔ کہیں اشاروں کنایوں میں

اور کہیں صاف صاف۔ وہ چاہتے ہیں کہ ناظرہ یا بادی مشق سخن جاری رکھیں۔
خطوط اکبر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ "زود پشیماں (ڈرامہ) کے مصنف مولانا
عبدالماجد شاعر بھی ہیں اور اس ڈرامہ میں جتنی غزلیں ہیں وہ انھیں کی ہیں۔
ملاقات کے ایک سال بعد سلسلہ مراسلت شروع ہوا۔ اکبر مرحوم کا پہلا خط
۱۶ راگست ۱۹۱۳ء کا ہے اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر مرحوم مسٹر عبدالماجد کی
قابلیت فضیلت اور تحقیقی لگن سے بے انتہا متاثر ہوئے۔ اور ان کو یہ بھی یقین
ہوگیا کہ اس نوجوان فاضل کے اندر شاعری کا جوہر موجود ہے۔ اس لئے اپنے دوسرے
خط میں کس خوش اسلوبی سے شاعری کے محرکات بیدار کرنے کے لئے لکھ رہے ہیں
"آپ فلاسفر ہیں شعر کی قدر زیادہ نہ ہوگی لیکن واقعات موجودہ کے لحاظ سے شاید
ان اشعار کو ناپسند نہ کریں گے"

مولانا نے غالب کے فلسفہ پر ایک مضمون لکھا جو انڈین پریس
الہ آباد کے رسالہ "ادیب" میں شائع ہوا۔ اکبر مرحوم نے اس مضمون کو پڑھنے
کے بعد مولانا کو لکھا۔ "میں آپ کو مذاق شعر سے کس طرح بے بہرہ سمجھوں۔
غالب کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت دلآویز ہے۔" اکبر مرحوم کے
ان الفاظ نے کہ "میں مذاق شعر سے کس طرح بے بہرہ سمجھوں" مولانا کو ضرور
متاثر کیا ہوگا۔ اور وہ پہلے "غزل گویم یا نہ گویم" کی کشمکش میں مبتلا رہے ہونگے
بالآخر شاعری کا جذبہ غالب آیا ہوگا۔ اور وہ غزل کہنے پر مجبور ہوگئے۔ اور تقریباً
ایک سال بعد مولانا نے اپنی پہلی غزل اکبر مرحوم کی خدمت میں روانہ کی۔ اکبر
غزل کے متعلق یہ حوصلہ افزا خیالات ظاہر کئے۔

عزیزی وحبیبی سلمہ اللہ تعالیٰ

مجھ کو حیرت ہوئی کہ آپ ایسے شعر کہہ سکتے ہیں جو رنگ سخن ظاہر ہوتا ہے وہ
بہت پختہ ہے۔ کیا کہنا چاہیئے۔ اور کیونکر کہنا چاہیئے۔ اوّل میں کوئی جگہ اعتراض
کی نہیں بلکہ آپ کی تقلید مناسب ہے۔ دوم میں البتہ کہیں کہیں اصلاح

کی ضرورت ہے۔ بہرکیف میں آپ کی غزل دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ یہ شعر تو ہر اعتبار سے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

رہی ہرچند عقل صبر آموز   نہ گئیں بے قراریاں نہ گئیں

کیا خوب کہا ہے۔ آپ انشاءاللہ بڑی باطنی ترقیاں حاصل کریں گے۔

خط ۲۵ دسمبر ۱۹۱۳ء

افسوس کہ یہ غزل باوجود تلاش کے دستیاب نہ ہوسکی۔ حکیم عبدالقوی صاحب نے بتایا کہ معارف اور الناظر میں جو کچھ غزلیں شائع ہوتی تھیں شاید ان میں ہو اس غزل سے متعلق مولانا ماجد لکھتے ہیں۔

"۱۹۱۴ء سے میرا دور غزل گوئی شروع ہوتا ہے۔ شادی سے دو سال قبل شروع ہوا۔ اور شادی کے ڈیڑھ دو سال بعد تک رہا۔ پہلی غزل زاریاں نہ گئیں۔ باریاں نہ گئیں کی زمین میں تھی"

"غزل اصلاح کے لئے حضرت کی خدمت میں روانہ کی ہے۔ حالانکہ طبیعت پر رنگ حسرت موہانی کا غالب تھا حسرت موہانی کے رنگ میں پہلی غزل کامیابی کے ساتھ کہہ دینا مولانا کی رنگ طبیعت اور ملکۂ شعری پر قدرت ہونے کو ظاہر کرتا ہے کچھ عرصہ بعد مولانا نے اکبر مرحوم کی خدمت میں دوسری غزل بھیجی۔ اکبر نے اس غزل کی بڑی تعریف کی لکھتے ہیں۔۔

"آپ کی غزل دیکھ کر کم تعجب ہوا اور زیادہ خوشی ہوئی۔ تعجب اس بات کا کہ ابتدا ہی میں ایسے کھرے شعر آپ کہنے لگے۔ تعجب میں کمی اس لئے کہ اچھی فطرتی سمجھ اور علم نے آپ کی طبیعت کو معنی کا عمدہ سانچہ بنا دیا ہے۔ نقص زیادات کو دخل نہیں۔ خوشی اس بات کی کہ ان خیالات کو میں نے پسند کیا طریقۂ اظہار بھی خوب ہے۔ شاعری۔ پالٹیکس۔ اخلاق عملی فلسفہ سب کی جھلک ہے۔

رکاکت سے خالی۔۔۔

اہل دفا بھی۔ الخ۔ خوب ہے نہایت صحیح و بامعنی ہے۔

غالب زبان وشوق ۔ بہت ہی بلیغ ہے ۔

یہ کیا ہوا ۔ ا اس میں بھی معلوم سے نامعلوم کی طرف کیا لطیف سعود ہے۔

حیراں ہوں ۔ وجد آفریں شعر ہے۔

میرے دل کو بھی ۔ اس میں بھی کیا بلاغت ہے ۔ ماشاء اللہ ۔ چشم بد دور۔

الغرض سب شعر کم و بیش اچھے ہیں ۔ اب رہی زبان اور طرز بیان اس میں کوئی نقص نہیں ۔ البتہ افزائش حسن کی گنجائش ہے ۔ طبیعت کا نشوونما خود اس کو پیدا کرلے گا ۔ جب عالم معنی کے استغراق سے طبیعت آسودہ اور بے فکر ہوکر حسن صورت کا مذاق پیدا کرے گی ۔ تحریر میں ان اشارات سے زیادہ اس وقت میری قوت سے باہر ہے ۔ بہرکیف آپ کو داد دیتا ہوں ۔ سبحان اللہ کہتا ہوں ۔ ترقی عمر واطمینان کی دعا دیتا ہوں ،،

یہ غزل مولانا کے ڈرامہ ’’ زود پشیماں ،، میں موجود ہے ۔ مولانا نے اس غزل کو نظیر جان طوائف کی زبان سنوائی ہے ۔ غزل سنانے سے پہلے نظیر جان نے ماسٹر صاحب (ایک کردار سے اجازت لی کہ حکم ہو تو ناظر کی ایک تازہ غزل سناؤں) ماسٹر ۔ اُف کس مہمل گو کا نام لیا اچھا خیر یہی سنا ۔ اور نظیر جان بصد انداز دلربائی غزل سنانے لگی ۔

غزل

جاں بازیوں کو خبط سے تعبیر کر چلے — تم یہ تو خوب عشق کی توقیر کر چلے

پروا نہیں نظارے کا در شوق سے ہو بند — اب دل میں نقش ہم تری تصویر کر چلے

مٹتی ہے آپ کی کوئی فرد قرار جرم — مانا کہ ہم شکایت تقدیر کر چلے

کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں مری وحشتیں کہ اب — غم خوار مجھ کو بستۂ زنجیر کر چلے

غالب زبان شوق پہ آیا نہ عیب حسن — لو ہم تمہارے آگے بھی تقریر کر چلے

حیراں ہوں ان کے حسن میں کیا ایسا سحر تھا — میرے بھی دل کو جس سے وہ تسخیر کر چلے

اگلا سا غیرت نہیں اب لطف والتفات — بارے ہمارے نالے بھی تاثیر کر چلے

منسوب کرکے عشق کو اک بوالہوس سے تم	اس جذبۂ لطیف کی تحقیر کر چلے
یہ کیا ہوا کہ ان کی جفاؤں کا ذکر چھوڑ	ناظرؔ بھی شکوۂ فلک پیر کر چلے

اکبرؔ مرحوم نے کم و بیش سب اشعار کو بہتر تسلیم کیا۔ لیکن چند اشعار کی انھوں نے بڑی داد دی۔ اس داد کو عارفانہ داد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔
اکبرؔ مرحوم پر مذہب و تصوف کا غلبہ ہو چکا تھا۔ اور وہ چاہتے تھے کہ مسٹر ماجد مولانا عبدالماجد بن جائیں اور ان کا دل نور ایمان سے منور ہو جائے۔ داد میں ان کے ان خیالات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ کس بلیغ پیرائے میں تشریح کرتے ہوئے اپنی قلبی تمنا کا اظہار کرتے ہیں۔
حیراں ہوں کہ حسن میں کیا ایسا سحر تھا۔	میرے بھی دل کو جس سے وہ تسخیر کر چلے۔
وجد آفریں شعر ہے۔ میرے بھی دل کو۔ "اس۔ بھی ،، میں کیا بلاغت ہے۔
ماشاءاللہ چشم بد دور۔ اس نے بھی اکبرؔ مرحوم کو اس لئے متاثر کیا کہ اس وقت دلِ ماجد فلسفہ کے دیوتا کا پجاری تھا۔ اور حسن حقیقی کی لذت سے بظاہر محروم لیکن۔ اس۔ بھی ،، نے یہ ظاہر کر دیا کہ ایسا بے نیاز دل بھی سحر آمیز حسن سے متاثر اور مسخر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ گو یا وہ اس حقیقت کا اعتراف کر رہا ہے
آں دل کہ رم نمودے از خوبروجواناں	دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے
یہ شعر حالی نے مسدس کے دیباچہ میں سرسید احمد خاں کی پرکشش شخصیت سے متاثر ہونے کے بعد اپنے لیے لکھا ہے۔ ناظرؔ بھی حالی کی زبان سے بھی ڈھیلے الفاظ میں یہ کہہ رہے ہیں۔
بھلا حال اور الفت سے ہو خالی	یہ سب تم صاحبوں کا حسن ظن ہے
اور شاید ان کے دل کے کسی گوشہ میں یہ دبی دبی خواہش بھی موجود ہوئی۔
آناں کہ خاک را بنظر کیمیا کنند	آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

نظیر جان جب غزل سنا چکی تو ماسٹر نے دوسرے کردار مشرف سے غزل کے متعلق رائے معلوم کی۔

ماسٹر ۔ مشرف یہ غزل بلحاظ شاعری کیسی ہے؟

مشرف ۔ میں کیا بتاؤں کیسی تھی۔ بہت سی شعریں تو میری سمجھ میں نہیں آئیں۔

ماسٹر ۔ تم نے سچ کہا۔ واقعی مہمل کلام تھا۔ دلی میں غالب ایک بڑا مہمل گو ہوا ہے۔ مہمل گوئی کی کوئی کیا تقلید کرتا۔ اس کا رنگ تو اچھا ہوا اس کے ساتھ ختم ہوگیا۔ مگر اسی زمانے میں مومن۔ شیفتہ۔ حالی دو چار شخص اور بھی مہمل گوئی کرنے لگے۔ ان کے مرجانے کے بعد میں توخوش تھا کہ یہ رنگ دنیا سے اٹھ گیا۔ مگر حسرت۔ ناظر۔ رسوا وغیرہ دو ایک شخص اب بھی اس روش پر چل رہے ہیں۔

مولانا نے اپنے ڈرامے میں ماسٹر کی زبان ناظر کو مہمل گو کہلایا ہے۔ اور مہمل گویوں میں سب سے بڑا مہمل گو غالب کو بتایا ہے اور اس کے بعد مومن۔ شیفتہ۔ حالی اور دو چار دوسرے شعرا کو بھی مہمل گویوں میں شمار کیا ہے۔ اس دور میں حسرت اور رسوا جیسے مہمل گویوں کے ساتھ ناظر کا نام لیا ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ مولانا خود اپنی شاعرانہ حیثیت سے بخوبی واقف تھے۔ اور اپنے کو انھیں شعرا کی صف میں شمار کرتے تھے۔ کسی شاعر کے لئے یہ بڑے فخر و انبساط کی بات ہے کہ اس کی غزلیں طوائف زبانی یاد کر کے محفلوں میں گائے۔ کیونکہ وہی غزل محفلوں میں گائی جاتی ہے جس میں شاعرانہ حسن اور موسیقیت دونوں موجود ہوں۔ اور جو کہ ماہر شعر سامعین کے دلوں کو وجد میں لائے۔

دسمبر ۱۹۰۳ سے ۱۹۰۵ تک مولانا نے کوئی غزل اکبر مرحوم کی خدمت میں نہ بھیجی۔ اکبر کلام ناظر کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔ لیکن جب

آٹھ۔ نو مہینے گذر جانے کے باوجود ناظر نے کوئی غزل نہیں بھیجی تو ۱۰ ستمبر ۱۹۱۵ء کے خط میں دریافت کرتے ہیں۔

"آپ کا دماغ سائنٹیفک اور آپ کا دل ملائم ولطیف۔ اور اسی سبب سے میں آپ کو بہت زیادہ وقعت کا مستحق سمجھتا ہوں۔ شعر وسخن کا کیا حال ہے؟ آپ کی غزلیں بہت خوب تھیں"

ناظر نے کیا جواب دیا یہ تو معلوم نہیں۔ شاید کوئی عذر پیش کیا ہو، اس کے چار۔ پانچ مہینے کے بعد فروری ۱۹۱۶ء میں کچھ اشعار روانہ کئے۔ جن کے متعلق مولانا لکھتے ہیں۔ "اب بالکل یاد نہیں آتا کہ یہ اشعار کیا اور کس مضمون کے تھے" اکبر مرحوم نے ان اشعار کو سراہا لیکن غزل گوئی کی طرف بھی توجہ دلائی۔ لکھتے ہیں "آپ کے اشعار کی نسبت لکھنا بھول گیا۔ نہایت معنی خیز۔ بامزہ لیکن آپ کو غزل کہنا چاہیئے۔ جیسی غزلیں آپ نے پہلے کہی تھیں"

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اپنے علمی و ادبی کارناموں میں اتنے زیادہ مصروف و منہمک تھے کہ انھیں اپنے ناظر ہونے کا خیال نہیں رہا۔ اور وہ باوجود اصرار کے غزل گوئی کے لئے وقت نہ نکال سکے۔ ایک سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا۔ اکبر مرحوم کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ انھوں نے تین ۳ نومبر ۱۹۱۶ء کو دوبارہ توجہ دلائی . . . "کبھی دو چار شعر ضرور کہہ لیا کیجئے۔ جوہر قابل موجود ہے" بار بار متوجہ کرتے رہنے سے مولانا کو بھی ناظر ہونے کا خیال آیا اور انھوں نے کچھ پرانی اور نئی غزلیں اکبر مرحوم کی خدمت میں بھجوا دیں۔ ہوسکتا ہے غزل گوئی کا سلسلہ جاری رہا ہو اور مولانا نے کسی وجہ سے ان کو اکبر مرحوم کی خدمت میں نہ بھیجا ہو کیونکہ ۳ نومبر کو اکبر نے توجہ دلائی تھی اور ۱۸ نومبر کے خط میں کئی غزلوں کے بھیجنے کے متعلق اپنی رائے لکھی۔

"ان غزلوں میں وسعت خیال زیادہ ہے۔ لیکن بلحاظ قواعد زبان سابق کی غزلیں زیادہ کھری تھیں۔ ان کا سبب زبانی کہوں گا۔ اگر زندہ رہا۔

جہاں آپ کو بجا شبہ ہے۔ نہ صرف وہاں بلکہ اور مصرعوں میں بھی تغیر و تبدل کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ دو چار دن میں واپس بھیج دوں گا۔"

اکبر مرحوم نے ان نئی اور پرانی غزلوں کو اصلاح کرنے کے بعد واپس کر دیا ہوگا۔ اس عرصہ میں مولانا نے ایک تازہ غزل کہی اور اکبر مرحوم کے ملاحظہ کے لئے بھجوائی۔ اس غزل کے دو چار شعر اکبر نے پسند کئے۔ افسوس ہے یہ غزل بھی دستیاب نہ ہو سکی۔ میرے خیال میں یہ پوری غزل اچھی ہوگی۔ ایسی شگفتہ و شاداب زمین میں بڑے دلکش اور بامعنی اشعار کہے ہوں گے۔

اکبر مرحوم لکھتے ہیں۔ "اپنی خیرت لکھئے۔ طبیعت کو تعلق ہے۔ ہمدم میں اردو کانفرنس کا کچھ حال چھپا ہے۔ آپ کا نام نظر نہ آیا۔ آپ کے یہ دو شعر بلحاظ معنی بہت خوب ہیں۔

وہ مدت ہوئی مل چلے ہیں عدو سے ۔ مری آہ اب تک اثر ڈھونڈتی ہے
نگاہ کرم اس ستم گر کی ناظر ۔ فقط آپ کی چشم تر ڈھونڈتی ہے

اس مقطع کو آپ بھی یاد رکھئے۔" دو تین مہینوں کے بعد مولانا نے ایک اور تازہ غزل کہہ کر اکبر مرحوم کے پاس بھجوائی۔ اس غزل میں کچھ اشعار عاشقانہ رنگ میں تھے۔ لیکن خیالات میں اور رنگینی پائی جاتی تھی۔ ترتیب الفاظ میں صفائی اور صحت بھی موجود تھی۔ اس سے قبل اکبر مرحوم انتخاب الفاظ اور بندش کے متعلق کچھ لکھ چکے تھے۔ یہ غزل ان کے معیار غزل گوئی پر پوری اتری فرماتے ہیں ... "آپ کی غزل خوب ہے ترتیب الفاظ بہت صاف اور صحیح ہے۔ اگرچہ آپ نرے تقلیدی خلاستفر نہیں ہیں۔ لیکن شاعری آپ کو زیادہ تر اور رنگینی کی طرف لے جائے گی۔ البتہ کچھ عاشقانہ طرز کا مضائقہ نہیں۔ بلکہ مناسب بھی ہے۔ اس باب میں پھر کچھ لکھوں گا۔ دو ایک شعر اس غزل میں بلحاظ داد کے مستحق ہیں" افسوس ہے کہ اس کا علم نہ ہو سکا ہے کہ یہ غزل کس ردیف و قافیہ اور بحر میں تھی۔ مولانا نے

کوئی تحریر بھجوائی ہے ۔ اور خیریت دریافت کی ہے ۔ اکبر مرحوم نے چند سطروں میں جواب دیا اور اپنی حالت کے پیش نظر فنا پر کچھ اشعار کہنے کی فرمائش کی ۔

" ماشاء اللہ آپ نے خوب لکھا ۔ دستخط کر کے واپس کرتا ہوں اب کسی قدر افاقہ ہے ۔ لیکن کیا اعتبار ۔ فنا پر کچھ اشعار کہئے عبرت کے رنگ میں یا فلسفیانہ ۔ الحمد للہ آپ کو علم نے عمر سے بہت آگے کر دیا لیکن یہ فطرت کی سنجیدگی ہے "

اس خط پر کوئی تاریخ نہیں ہے لیکن یہ خط ۹ مئی ۱۹۱۷ء اور ۲۳ مئی ۱۹۱۷ء کے درمیان لکھا گیا ہے ۔ جب اشعار کہنے کی ترغیب پر بھی مولانا نے خاموشی اختیار کی تو ۲۵ اگست ۱۸ء کو پھر لکھتے ہیں ۔

" آپ کو تو شعر کہنے کی فرصت نہ ملتی ہوگی ۔ لیکن مولانا اپنی عدیم الفرصتی اور ادبی مشغولیت کی وجہ سے پھر بھی اکبر کے حکم کی تعمیل نہ کر سکے اور اشعار نہیں بھیجے ۔ اکبر انتظار کرتے کرتے رہے ۔ انتظار کرتے کرتے ۹ - ۱۰ مہینے گزر گئے ۔ بالآخر مجبور ہو کر ۱۱ رجون ۱۹ء کو شعر کہنے کی طرف دوبارہ متوجہ کیا " جب آپ کو فرصت ملے دو چار شعر کہہ لیا کیجئے " اور ۶ جولائی ۱۹ء کو پھر شعر کہنے کی فرمائش کرتے ہیں ... آپ عدیم الفرصت ہوں گے ورنہ عرض کرتا کہ کبھی دو چار شعر کہہ لیا کیجئے " مولانا نے یہ مشورہ بھی ٹال دیا اس کا سب سے بڑا سبب علمی و ادبی مشاغل میں ان کا انہماک تھا ۔ شاعری کا جذبہ فلسفہ و ادب کے جذبات سے مغلوب سا ہو گیا تھا ۔ لیکن بالکل ختم نہیں ہوا تھا ۔ آخر موقعہ پا کر اکبر اور مولانا نے تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد آخر دسمبر ۱۹ء میں ایک غزل داغ کی مشہور زمین میں [illegible] کہہ کر بھیجی ۔ مولانا لکھتے ہیں ۔ " مدت کے بعد ایک غزل اور کہہ کر اصلاح کے لئے روانہ [illegible] کی ہے ۔ یہ داغ کی مشہور زمین ...

" لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد — ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں
میں کہی تھی۔ اکبر نے غزل کو داغ کی غزل سے ہر اعتبار سے بہتر بتایا ہے وہ چاہتے تھے کہ داغ اور ناظر کی غزلوں پر تفصیل سے لکھیں لیکن شدید علالت کی وجہ سے شاید وہ نہ لکھ سکے۔ ۱۴ جنوری ۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ " آپ کی غزل داغ کی غزل سے ہر اعتبار سے بہتر ہے۔ حضرت سلیمان نے اس خیال سے اتفاق کیا بلکہ ایک شعر کی نسبت انھوں نے کہا ہے کہ یہ نہایت اچھا ہے۔ میں نے اور اشعار بھی منتخب کئے۔ داغ کے رنگ میں۔ اگر داغ سے آپ پڑھیں تو آپ کی عالمانہ اور اخلاقی متانت پر داغ آجائے۔ لیکن اس غزل میں تو میری نگاہ میں داغ پھیکے رہے۔ آپ کی غزل اور داغ کی غزل پر انشاء اللہ ریویو کرکے آپ کو لکھوں گا یا آپ سے کہوں گا تاکہ وجہ ترجیح آپ کو معلوم ہو اور آپ تو خود سمجھتے ہیں اس زمین میں میری بھی ایک مختصر غزل ہے۔ اس کے بعد اگست ۱۹۲۱ء تک یعنی ۲ سال سے زیادہ مراسلت کا سلسلہ جاری رہا۔ اور ۵۶۔ ۵۸ خطوط اکبر مرحوم نے لکھے۔ ان میں علمی و ادبی اور دیگر مسائل پر اظہار خیال کیا۔ لیکن یہ بات حیرت انگیز ہے کہ کسی ایک خط میں بھی اکبر نے شاعری کی طرف توجہ دلائی اور نہ کوئی ذکر کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر کو مولانا کی شاعری سے تائب ہونے یا اس سے کنارہ کش ہو جانے کی کسی نہ کسی طرح اطلاع ہو گئی تھی۔ بہرصورت وجہ کچھ بھی ہو شاعری کا سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا۔ ان خطوط میں تین خطوں کے اندر ایک ایک غزل یعنی کل تین غزلوں کا اور ایک میں کچھ اشعار کا تذکرہ ہے۔ اس تمام سرمایۂ شاعری میں سے صرف ایک غزل " زود پشیماں " کے ڈرامہ میں موجود ہے۔ بقیہ غزلوں اور اشعار کا پتہ نہ لگ سکا۔

ڈرامۂ زود پشیماں " میں پانچ غزلیں اور ہیں ممکن ہے نئی اور پرانی غزلوں میں یہ غزلیں بھی شامل ہوں۔ اور اکبر مرحوم نے اسی پر اصلاح کی ہو۔ اور اس طرح کل چھ غزلیں اس وقت موجود ہیں۔ زود پشیماں کم یاب ہو چکا ہے اس کی پانچوں غزلیں حسب ذیل ہیں۔

غزل ۱

مجھ کو محروم کرم میری وفا نے رکھا
ان کو مشغول ستم ان کی جفا نے رکھا

دل یہ کیا جانے کہ شمشیر ہے کیا تیر ہے کیا
اس کو بسمل تیری انداز و ادا نے رکھا

یہ ترا شعلۂ رخ گیسوئے مشکیں سے چھپا
یا چھپا کر مہ تاباں کو گھٹا نے رکھا

ایک دم ہو نہ سکی ہم سے کبھی طاعت حق
ایسا پابند ہمیں حرص و ہوا نے رکھا

شوخیاں تیری نہ ظاہر ہوئیں خود تجھ پہ کبھی
تجھ کو دھوکے میں تری شرم و حیا نے رکھا

مرگ و انجام کا بھولے سے بھی آیا نہ خیال
دل کو غفلت میں سدا نشو و نما نے رکھا

کس زباں سے کہیے اپنے تئیں ناظر آزاد
قید الفت میں تو اس زلف دوتا نے رکھا

غزل ۲

ان کے انداز میں الفت نہ وفا ہوتی ہے
ہاں اگر ہوتی ہے کوئی تو جفا ہوتی ہے

پھر ہے بیتاب زباں عرض تمنا کے لئے
دیکھیے دیکھیے پھر مجھ سے خطا ہوتی ہے

تجھ کو کھلنے نہیں دیتی کبھی عصمت تیری
شوخیوں پر بھی تری مہر و وفا ہوتی ہے

مل ہی جاتی ہیں کبھی اپنی نگاہیں ان سے
وہ بھی جب ایسی ہی تقدیر رسا ہوتی ہے

لذت وصل کے منکر تو نہیں ہم لیکن
لذت کاہش ہجر اس سے سوا ہوتی ہے

اس نے خودداری ناظر کو مٹا کر چھوڑا
یہ محبت بھی عجب سخت بلا ہوتی ہے

غزل ۳

شورش جوش جنوں اب جلوہ دکھانے کو ہے
یعنی جو کچھ دل میں تھا سب لب پہ آج آنے کو ہے

رخصت اے ضبط و تحمل۔ الوداع اے پاس وضع
بندشوں سے اب زباں آزاد ہو جانے کو ہے

ہو چکی صبر و سکون و خامشی کی انتہا
جام ضبط آہ و نالہ اب چھلک جانے کو ہے

تو جا تک تم کو اے اہل تماشا سیر نو
دست بسمل سے عنان ضبط چھٹ جانے کو ہے

خوب کوشش کی بنا لیکن ستمگر یہ بھی سوچ
کیا وفا کیشی کا جذبہ اس سے مٹ جانے کو ہے

بے ادب اب ان سے کچھ کہنے کو ہیں اب مضطرب — ان کے چہرے پر حیا کی پھر جھلک آنے کو ہے
سچ بتا ناظرؔ مسرت اتنی کیسے آج کیا — ان کی محفل میں کوئی تیری غزل گانے کو ہے

غزل ۴

مدت ہوئی ہے پاس نزاکت کئے ہوئے — آہ و فغاں سے شور قیامت کئے ہوئے
دیکھو آ گیا نا زباں پر کسی کا نام — مدت سے ہم تھے ضبط محبت کئے ہوئے
نکلا سا وہ سکون متانت کہاں کہ اب — شوریدگی ہے بندۂ وحشت کئے ہوئے
پھرتا ہے پھر نظر میں کسی کا خرام ناز — سامان منتہائے قیامت کئے ہوئے
وہ دل کہ جلوہ گاہ سرور نشاط تھا — اب غم ہے اس کی مدفن حسرت کئے ہوئے
یہ شوق دید ہے کہ چلا میں عدو کے گھر — خودداری غرور سے فرصت کئے ہوئے
پھر دل میں ہے کہ دیکھئے جرأت کا امتحاں — انجام کو حوالۂ قسمت کئے ہوئے
اب دل میں ولولہ بھی نہیں ہے کوئی کہ ہو — اندازۂ زبونیٔ قسمت کئے ہوئے
بیگانہ وار در پہ کسی کے چلا ہوں پھر — سامان صد نہفتنِ الفت کئے ہوئے
ناظرؔ کے ہوش و عقل بھلا اب کہاں درست — ہے مست اس کو بادۂ الفت کئے ہوئے

غزل ۵

زینت حسن ہے خود اپنے پہ نازاں ہونا — نازش زخم جگر رہین نمکداں ہونا
عاشقی کیا ہے بجز کشمکش عقل و جنوں — دل کو آفت میں پھنسا آپ ہی حیراں ہونا
زندگی اصل میں ہے اک قفس طائر روح — موت کیا ہے اسی زنداں سے گریزاں ہونا
نامرادی مری ہمزاد تھی تو کیوں یارب — میری قسمت میں لکھا صاحب ارماں ہونا
ہم شہیدان وفا موت کے خود ہیں مشتاق — کفر اسی شرح میں ہے طالب درماں ہونا
اے اجل آس ہے تیرے ہی دم آس والم — تجھ سے زیبا نہیں انساں کو ہراساں ہونا
راز ہستی وہ گرہ ہے جو کبھی کھل نہ سکی — فلسفی کے لئے آخر ہے پشیماں ہونا
اس جفا کار نے اب کی بھی تلافی تو کیا — اب مقدر میں تو ہے قبر کا مہماں ہونا
میرا انجام ہے دنیا کو اک عبرت کا سبق — دوستو تم نہ کبھی عشق میں غلطاں ہونا

سب کو آخر ہے فنا حسن ہو یا عشق و وفا　　اہل ہستی کبھی ہستی پہ نہ نازاں ہونا
لذت درد کے منکر کو سنا دو یہ شعر　　ناظرؔ آساں نہیں غالبؔ سا سخنداں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ　　ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

نعتیہ غزلیں ۔ مولانا کی دو نعتیہ غزلیں جو پہلی بار رسالہ الناظر لکھنؤ میں شائع ہوئی تھیں ۔ یہ غزل مولانا محمد علی مرحوم کی مشہور نعتیہ غزل ہے ۔ " تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں " کی ردیف و قافیہ میں ہے ۔ اس کے علاوہ مولانا دریابادی نے دو نعتیہ غزلیں اور کہی تھیں ۔

غزل ۱

پڑھ صل علیٰ حق کے محبوب کی ہو باتیں　　رحمت کی گھٹائیں ہوں اور نور کی برساتیں
وعدے ہیں شفاعت کے تسکین کی ہیں باتیں　　آقائے دو عالم کی دیکھو تو مداراتیں
محشر میں اماں پائی صدقے میں درود کے　　دشواری میں کام آئیں بھیجی ہوئی سوغاتیں
غم واری امت سے اک آن نہیں غافل　　ظاہر میں تو ہے پردہ در پردے میں ملاقاتیں
دارین کے کیا جلوے فردوس کے کیا نقشے　　سب کا یہی دولہا ہے سب کی یہی باراتیں
اک نام مبارک ہے یا حق کی تجلی ہے　　سارا یہی توشہ ہے کل ہیں یہی سوغاتیں
دیدار کی حسرت ہے اور نام کی رٹ ہر دم　　اس شغل میں دن گذرے اس دھن میں کٹیں راتیں
مجھ نامہ سیاہ پر بھی رحمت کی نگاہ ہو جائے　　وابستہ نگاہوں سے ہیں لاکھوں کراماتیں
ہم نام پیمبر میں ہے اتنا اثر اب بھی　　یونان کو دی ذلت شیطان کو دی ماتیں[1]

غزل ۲

بڑھتا ہوا محشر میں جب صل علیٰ آیا　　رحمت کی گھٹا اٹھی اور ابر کرم چھایا
جب وقت پڑا نازک اپنے ہوئے بیگانے　　یاں کام اگر آیا تو نام ترا ۔ آیا

---

[1] مراد مصطفیٰ کمال پاشا ہے یہ غزل اس زمانے میں لکھی گئی ہے جب مصطفیٰ کمال پاشا کی فوج نے یونان کی فوج کو سمرنا میں فیصلہ کن شکست دی ۔

پرسش تھی گناہوں کی اور یاس کا تھا عالم — یہ کس کی خبر لینے محبوب خدا — آیا
یہ نام مبارک تھا یا حق کی تجلّی تھی — دم بھر میں ہوا فاسق ابدال کا ہم پایہ
چرچے ہیں فرشتوں میں اور رشک ہے زاہد کو — اس شان سے جنّت میں شیدائے نبی آیا
کیوں نزع کی دشواری آسان نہ ہو جاتی — تھا نام ترا لب پر اور سر پر ترا سایہ
اک عمر کی گمراہی اک عمر کی سرتابی — جز تیری غلامی کے آخر نہ مفر پایا
حکمت کا سبق چھوڑا عزت کی طلب چھوڑی — دنیا سے نظر پھیری سب کھو کے تجھے پایا
کچھ تھے سیاہ کاری اپنی ہے فزوں حد سے — دیکھا تو کرم تیرا اس سے بھی سوا پایا

فاسق کی ہے یہ میّت پر ہے تو تری اُمّت
ہاں ڈال تو دے دامن کا اپنے ذرا سایہ

تغزّلِ ماجدی

مسٹر عبد الماجد ناظر کی چار غزلیں جو معارف میں ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئیں تھیں درج ذیل ہیں۔

۱

آہ منت کش اثر نہ ہوئی — شب غم کی کبھی سحر نہ ہوئی
نہ ہوئی ترک ہم سے خوئے وفا — ہم نے چاہا کہ ہو مگر نہ ہوئی
غلط انداز کتنی ہے وہ نظر — آج تک میرے حال پر نہ ہوئی
اس قدر محویت معاذ اللہ — ان کے آنے کی بھی خبر نہ ہوئی
راز الفت کسی پہ کھل نہ سکا — وحشت شوق پردہ در نہ ہوئی
کس قدر ہے غیور میری دعا — کبھی شرمندہ اثر نہ ہوئی
ہم گدایان عشق کو ناظر — فکر الطاف اہل زر نہ ہوئی

معارف مئی ۱۹۱۶ء

(۲)

رفتار فلک دیکھ زمانے کی ہوا دیکھ
اے کور اجر دہر کا انجام ذرا دیکھ

مغرور نہ ہو حسن خداداد پہ ظالم
ڈر نالۂ دل سے اثر آہ رسا دیکھ

ہر شے سے ٹپکتا ہے میرا جذب تمنا
نالہ کا اثر دیکھ یہ تاثیر دعا دیکھ

آخر تو ہیں ہم مدعیٔ صبر و تحمل
رہ جائے نہ دل میں ترے ارمان جفا دیکھ

حد سے نہ گزر مشغلۂ جور میں اے یار
نازک ہے بہت رشتۂ پیمان وفا دیکھ

آشفتہ سری پر مری کیوں طنز ہے اتنا
تو خود تو ذرا برہمیٔ زلف دوتا دیکھ

لازم ہے کبھی دلدہی ان کی بھی ستمگر
ٹوٹے نہ کہیں ہمت ارباب وفا دیکھ

خودرائی و تقویٰ پہ ہے کیوں ناز رے زاہد
ناظر کو در بت پہ کبھی ناصیہ سا دیکھ

معارف جون ۱۹۱۷ء

(۳)

لب تک جو شکوے آپ کے آ آ کے رہ گئے
دب دب کے ولولے دل شیدا کے رہ گئے

پھیلا جو اہل ملک میں حب وطن کا جوش
ارباب جور اور بھی گھبرا کے رہ گئے

اظہار لطف اس سے نہ کرتے تو خوب تھا
یہ کیا کہ دل کی آگ کو بھڑکا کے رہ گئے

نکلا ہجوم عشق بھی گویا کہ روئے شوق!
ارمان دل میں شرح تمنا کے رہ گئے

اے خضر ساتھ جو سفر میں تو بات ہے!
یہ کیا کہ صرف راستہ بتلا کے رہ گئے

تجھ کو تو صرف غیر سے تھی بدگمانیاں!
یہ کیا ہوا کہ آپ بھی شرما کے رہ گئے

کیا طے کریں گے وادیٔ الفت کی منزلیں
ناظر کہ ابتدا ہی میں گھبرا کے رہ گئے

معارف اکتوبر ۱۹۱۷ء

(۴)

جذبات دل کا عکس جو میرے سخن میں ہے
اک لطف تو بھی طرز کلام کہن میں ہے

کس نے کہا کہ سیر گل و نسترن میں ہے
لطف حیات عشق کے سوز و محن میں ہے

غربت میں کوئی لاکھ مسافر نواز ہو!
حاصل کہاں وہ لطف جو بزم وطن میں ہے

ہم ہیں بلاکش غم فرقت تو کیا ہوا
یاد اپنی ہر گھڑی تو تری انجمن میں ہے

ترکیب سیرت بشری کچھ عجیب ہے ، یعنی وفا بھی اس بت پیماں شکن میں ہے
زاہد بھی اپنے زہد پہ قائم نہ رہ سکا ، کچھ ایسی دل کشی نگہ سحر فن میں ہے
پردیس کی بہار بھی کوئی بہار ہے ، مخصوص اس کا لطف سواد وطن میں ہے
وہ راحت لطیف کہاں وصل میں نصیب حاصل جو دل کو عشق کے رنج و محن میں ہے
اہل جہاں کو کیوں ہے کشش سوئے دیر ہے کیا ایسی بات کیش بت و برہمن میں ہے
کچھ محتسب کا خوف نہ دار و رسن کا ڈر کتنا خمار بادۂ حب وطن میں ہے

ناظر سا باوفا بھی ادھر کھنچ کے آ رہا
کچھ ایسا جذب حلقۂ دار و رسن میں ہے

معارف دسمبر ۱۹۱۷ء

نعتیہ غزل

◇

پڑھو رب سلم کہ ذکر نبی ہے ، جو سب کا ہے مولا جو سب کا ولی ہے
مبارک رہے شیخ کو طوف کعبہ ، جبیں میری ہے اور ان کی گلی ہے
ہوئی ہے محبت تو محبوب حق سے ، کہاں جا کے قسمت ہماری لڑی ہے
میں جاتا تھا یثرب یہ جنت میں لائے فرشتوں کو سوجھی یہ کیا دل لگی ہے
نہ پرسش کا کھٹکا نہ محشر کی پروا دم نزع ہے آنکھ ان سے لڑی ہے
یہ کس جا پہ لائی اجل اے میں صدقے کہاں باغ جنت یہ ان کی گلی ہے

رہی ہے نظر مہر کی دشمنوں پر
غلامی کا حق کچھ تو ان سے قوی ہے

الناظر (لکھنؤ) ۱۹۲۳ء

بارگاہ رسالت میں اظہار عقیدت

آہ اک شب تو با اثر ہوتی　　وہ تجلیِ حق ادھر ہوتی
پائے اقدس پہ آنکھ تر ہوتی　　شب گذرتی یونہی سحر ہوتی
نالۂ نارسا رسا ہوتا　　سرمۂ چشم خاک در ہوتی
کچھ تو ارمان دل نکل جاتا　　کچھ تو تسکین چشم تر ہوتی
نقش پا کو لگاتے آنکھوں سے　　یوں دوائے دل و جگر ہوتی
حسرت دید دل میں لب پہ درود　　اب تو ہر شب ہے یوں بسر ہوتی

ہے حضوری نصیب میں شاید
ہند میں اب نہیں بسر ہوتی

مولوی دہلی جلد ۲ ص ۸
صفر و ربیع الاول ۱۳۴۵ھ

ان چند غزلوں سے ناظر کی رنگ شاعری کا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بادۂ الفت سے مست ہونے اور عقل و ہوش کے درست نہ ہونے کے باوجود ناظر نے آبروئے شیوۂ اہل نظر کا ہمیشہ پاس رکھا ۔ مولانا محترم اگر اپنا زیادہ وقت شاعری میں صرف کرتے ۔ تو یقیناً اردو کے ایک نامور شاعر کی حیثیت سے مقبولیت و شہرت حاصل کر لیتے ۔

(۱) مولانا عبدالماجد بحیثیت مرد صدق گفتار

(۲) 〃 〃 〃 سوانح نگار

(۳) 〃 〃 〃 مفسر قرآن

مولانا عبدالماجد بحیثیت مرد صدق گفتار

صدق گفتاری ایک ایسی نعمت خداوندی ہے جو بغیر توفیق الٰہی کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔ اگر صدق گفتاری صدق نگاری کی صورت اختیار کرے تو مسئلہ اور بھی مشکل اور راستہ اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ راستی کو موجب رضائے خدا کہا گیا ہے۔

مولانا عبدالماجد کی صدق گفتاری اور صدق نگاری اپنی جگہ بالکل منفرد و بے مثال تھی۔ اگرچہ وہ سچی باتیں سپرد قلم کر کے بعض اوقات کچھ لوگوں کے لئے تلخی کام و دہن کی آزمائش کا سامان فراہم کر دیتے تھے۔ اور کبھی کچھ افراد ان کی تحریروں پر چیں بجبیں بھی اٹھتے تھے۔ لیکن نیت بخیر ہونے کی وجہ سے انھیں کو کبھی نادم و منفعل ہونے پر مجبور نہ ہونا پڑا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی کی رنجش بیجا کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے ناکردہ گناہوں کو بھی اپنی خطاؤں کی فہرست میں شامل کر لینے پر آمادہ ہو جاتے۔ اور کسی کی دلآزاری اور رعنائی خیال کی توہین کو مناسب نہ سمجھتے۔

مرزا غالب کو بھی ایک موقعہ پر ایسی ہی صورتحال پیش آئی تھی جب انھیں ایک سہرا لکھنا پڑا تھا۔ اور پھر گذارش احوال کہنا پڑا تھا۔۔۔

آزردہ رو ہو اور میرا مسلک ہے صلح — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مولانا موصوف کو بھی جھوٹ کی عادت نہیں تھی۔ اور ان کا قلم ہمیشہ ان کی ضمیر کی آواز اور الہامی صداقتوں کا ترجمان ہوتا تھا۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نے بطور رہنما اصول کے اپنے ہفتہ وار انگریزی جریدہ «کامریڈ» کے صفحۂ اول پر ایک انگریزی شاعر کا یہ مقولہ لکھ رکھا تھا۔ (ترجمہ) راست اقدام

کھڑے ہو۔ اپنے خیالات کو کہہ ڈالو اس صداقت کا اعلان عام کرو کہ جو تمہارے پاس ہے تاکہ سب اس سے مستفیض ہو سکیں۔ جرأت سے کام لو اور ہر قدم پر۔۔
(امر بالمعروف) کا اعلان کرتے رہو۔ صرف وہی لوگ زندہ رہتے ہیں جو باہمت اور صدق گفتار ہوتے ہیں،،

یہی جرأت و بے باکی۔ صداقت، راست گوئی، ہمت اور اعلاء کلمۃ الحق جو مولانا محمد علی کے جوہر تھے۔ مولانا عبدالماجد کی صحافت وانشا، تصنیف وتالیف تنقید و تفسیر کے بھی رہنما اصول ہیں۔ مولانا عبدالماجد نے خدمت خلق اور تنقید و دگار کو بھی اپنا مشغلۂ حیات بنالیا تھا۔ آپ کی مضمون نگاری کا سلسلہ اودھ اخبار لکھنؤ ،، وکیل ،، امرتسر اور ،، پیسہ ،، اخبار لاہور سے شروع ہوا۔ اور الناظر لکھنؤ ادیب۔ الہ آباد۔ افادہ۔ آگرہ۔ کانفرنس گزٹ۔ علی گڈھ۔ ذخیرہ۔ حیدر آباد ہمدرد۔ دہلی اور متعدد انگریزی ماہناموں تک پہنچا۔ پھر یہ سلسلہ صدق جدید کی بدولت تاحیات قائم رہا۔ اور ان کے لئے ادبی دنیا میں غیر معمولی شہرت و مقبولیت کا حامل بنا۔

مولانا موصوف نے تقریباً نصف صدی پہلے سے یہ عزم کیا تھا کہ سچ بولنے کی طرح نو ڈالی جائے اور اس شوق کو سکۂ رائج الوقت بنایا جائے۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے سچ کے نام سے ایک دینی اور اصلاحی ہفتہ وار پرچہ کی ادارت کا کام سنبھالا۔ اس کے پروان چڑھانے میں ان کے شعور کی بیداری فطری دینداری اور طبعی جدت پسندی تینوں برابر کی شریک تھیں۔ یہ اخبار ۱۹۳۳ء تک سات سال برابر جاری رہا۔ تقریباً دو سال کے عرصہ کے بعد ۱۹۳۵ء میں انھوں نے صدق کے نام سے اسی کوشش کو دوبارہ لکھنؤ سے شروع کیا۔ صدق پہلے دہ روزہ تھا۔ پھر ہفتہ وار ہوگیا۔ ان اخبارات کی سچی باتوں اور تنقیدی نوٹوں نے ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ ان میں جدید فتنوں اور آئین نو خامیوں کے تذکرے بھی ہوتے تھے۔ اور ان پر

نکتہ چینیاں بھی۔ سچ اور صدق میں شائع ہونے والی سچی باتوں کا ایک مجموعہ "سچی باتیں" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکا ہے۔ سچ بولنے اور ضمیر کی آواز کو کاغذ پر قلم بند کرنے میں جو خدشے ہوتے ہیں۔ انھیں کی بنا پر مولانا کو مجبور ہو کر ۱۹۵۰ء میں یہ اخبار بند کرنا پڑا۔ لیکن چند ماہ کے اندر ہی صدق جدید کے نام سے یہ سلسلہ پھر شروع کر دیا گیا۔ اور بفضل تعالیٰ اب تک جاری ہے۔ بقول حکیم عبدالقوی دریابادی "مولانا عبدالماجد اخبار صدق جدید لکھنؤ کے مدیر کی حیثیت سے ہند و پاک دونوں میں نمایاں شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر کردہ سچی باتیں اور نوٹ دونوں ملکوں کے اخبار کثرت سے نقل کرتے ہیں۔ اس اخبار میں مولانا کے قلم سے کتب و رسائل پر تنقیدیں بھی وقتاً فوقتاً نکلتی رہتی ہیں۔ جو اعلیٰ تنقید اور انشائے ماجد کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں،، نقوش لاہور شخصیات نمبر ۱۹۵۵ء۔

مولانا عبدالماجد نے اپنے علمی و ادبی، سیاسی و نفسیاتی۔ مذہبی و اخلاقی زندگی کی تہذیب و اصابت میں جن بزرگوں اور مشاہیر کی محبت و ارتباط سے فیض اٹھایا۔ ان میں مولانا شبلی۔ عبدالحلیم شرر۔ مرزا محمد ہادی رسوا۔ مولانا محمد علی جوہر۔ اکبر الہ آبادی۔ ڈاکٹر اقبال۔ سید سلیمان ندوی مولوی عبدالسلام ندوی۔ مولانا عبدالباری ندوی۔ مولانا مسعود علی ندوی۔ مہدی افادی مولوی عبدالحق۔ مس اینی بسنٹ۔ مہاتما گاندھی۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد شامل ہیں علاوہ ازیں مولانا کے ذہن رسا اور فکر طبع نے غیر معمولی طور پر مولانا روم اور امام غزالی کے اجتہاد اور صاحب نظری سے اکتساب فیض کیا ہے اور اسی وجہ سے اس مقام پر پہنچ کر ان کا قلم اہل بصیرت کو مقرر صلائے عام دیتا رہا ہے۔ کہ میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے۔ مولانا عبدالماجد کے طرز انشا کے ارتقاء کی کہانی کچھ اس طرح ہے۔ کہ ابتدا میں انھوں نے مولانا شبلی نعمانی کا تتبع کیا پھر انگریزی انشا پردازوں کی شیوہ بیانی اور تاثیر سے اپنی عبارت کو اور اشارات کو

آراستہ کیا۔ اور طنز و مزاح کو نمک خوان تکلّم بنایا۔ رفتہ رفتہ صورتحال یہ ہوئی کہ ایک صاحب طرز انشا پرداز بن کر دنیائے ادب کے سامنے آئے اور مقبولیت عام حاصل کی۔ زور بیان اور جوش اظہار کے پہلو بہ پہلو مرصّع نگاری اور ندرت استدلال۔ سادگی و بے ساختگی۔ شدت احساس و تاثیر مصوّری جذبات و دلکشی۔ متانت و شگفتگی۔ لطائف و شائستگی۔ دلآویزی و معنویت.... دلگدازی و اشاریت۔ حسن آفرینی و نشتریت کا کج ادائی و اجتہادات بحر علمی و کلاسکیت صداقت و انفرادیت ان کے طرز تحریر کی خصوصیات ہیں۔

مولانا کے طرز انشاء اور ادب عالیہ کا ایک نمونہ مشتے از خروارے پیش کیا جاتا ہے۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر فروری ۱۹۶۱ء میں آل انڈیا ریڈیو سے نشر شدہ ایک مختصر تقریر کے چند جملے ملاحظہ ہوں۔

"پھر دن چڑھا اور نمازیوں کی ٹولیاں صاف ستھر الفنیس لباس پہنے عیدگاہ اور سجدوں کی طرف چل پڑیں۔ بوڑھے اور بچے سب ساتھ ہیں۔ اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر وللہ الحمد کے زمزموں سے اور نغموں سے راستے بھی گونج رہے ہیں اور مسجد کے در و دیوار بھی۔ کیا دھن ہے اور کیا مستی ہے۔ ہر ایک کی زبان پر یہی نعرۂ خدا پرستی ہے۔ مسلمان ان تین دنوں میں جتنا گوشت کھائے گا اس سے بڑھکر دوسروں کو کھلائے گا۔ اور غریبوں اور مفلسوں کو بھی۔ امیروں اور رئیسوں کے دسترخوانوں کا مزہ ایک بار تو حاصل ہو ہی جائے گا"

مولانا کے قلم نے ہمیشہ صدق نگاری سے کام لیا ہے اور یہی طریق کار ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ کالج کے زمانۂ طالب علمی میں جب ان پر فلسفیت کا غلبہ ہوا۔ تو فلسفیانہ مضامین میں وہ سب تاثرات و اندیشہ ہائے دور دراز بہو بہو ظاہر ہو گئے۔ اور جب ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۹ء تک دس سال الحاد اور غفلت نے زور باندھا تو اس عہد کی نگارشات و تصنیفات میں اس کی

ترجمانی ہوگئی۔ پھر "صد بار اگر توبہ شکستی باز آ،" کی آواز پر جب مذہبیات و الٰہیات کی طرف ان کی بازگشت ہوئی تو یہ سب کیفیتیں تصوف اسلام اور تفسیر ماجدی نیز دیگر مضامین و تخلیقات میں ظہور پذیر ہوگئیں۔

مولانا موصوف کی صدق گفتاری میں ایک استواری۔ استقامت۔ استقلال اور وضعداری پائی جاتی ہے۔ کہ جوان کی قوت ایمانی۔ راسخ الاعتقادی اور غیر متزلزل عزم کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے غذائے انسانی کے عنوان سے ایک مختصر مضمون اپنے زمانۂ طالب علمی میں آریہ سماجیوں کے رد میں لکھا تھا۔ جس میں گوشت کو انسان کی فطری غذا ثابت کیا گیا تھا۔ اس دور "ترک کاریت" میں جب موقع ملتا تھا مولانا اپنے نظریے کی تائید میں برابر نوٹ لکھتے رہتے تھے۔ جو بالعموم برادران وطن کی مذہبی کتابوں قابل اعتماد اشخاص کے اقوال یا غیر ملکی رسائل سے ماخوذ ہوتے تھے۔ یا جو تحریک شروع کرتے تھے۔ اس کو تکمیل تک پہنچانے میں پوری تندہی اور حکمت عملی سے کام لیتے تھے۔ اور منزل مقصود پر پہنچ کر ہی دم لیتے تھے۔

پروفیسر آل احمد سرور ایک واقعہ بیان کرتے ہیں " (نقوش لاہور شخصیات نمبر بعنوان رشید احمد صدیقی) کہ ان کی سفارش پر پروفیسر رشید احمد صدیقی صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے سجاد انصاری کی کتاب "محشر خیال" ایم۔ اے اردو کے نصاب میں داخل کرلی۔ نصاب پر اتفاق سے مولانا عبدالماجد کی نظر پڑ گئی۔ جنھیں ہر رعنائی خیال کو گناہ ٹھہرانے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوتا۔ انھوں نے رشید صاحب کو خط لکھا کہ یہ کتاب جس میں خدا اور مذہب کے بارے میں شوخیاں کی گئی ہیں ہرگز مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں نہ رکھنی چاہیئے۔ رشید صاحب نے مولانا کا یہ خط مجھے دکھایا۔ اور خاموش ہو رہے۔ مولانا نے پھر صدق میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ ہم لوگ پی گئے۔ آخر مولانا نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو متوجہ کیا جو دینیات کی فیکلٹی کے ڈین تھے۔ انھوں نے وائس چانسلر کو ضابطہ کا خط لکھا اور اس کتاب کے نصاب سے خارج کئے جانے پر زور دیا۔ حلیم صاحب وائس چانسلر نے شعبہ اردو کے

بلایا اور مشورہ دیا کہ کتاب نصاب سے خارج کر دی جائے ۔ بالآخر مولانا عبدالماجد کی بات مان لی گئی ۔ اور مختصر خیال نصاب سے خارج کر دی گئی ۔

مولانا عبدالماجد کو ارضیات سے بھی دلچسپی تھی ۔ اور فلکیات سے بھی ۔ نفسیات سے بھی لگاؤ تھا ۔ اور اجتماعیات سے بھی ۔ تجلیات سے بھی واسطہ تھا اور روحانیات سے بھی ۔ تصوف سے بھی علاقہ تھا ۔ اور حکمت سے بھی ۔ منطق سے بھی رابطہ تھا اور الٰہیات سے بھی ۔ سیاست سے بھی تعلق تھا ۔ اور ادب سے بھی ۔ درباروں سے بھی سروکار تھا اور خانقاہوں سے بھی ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے ذاتی رجحانات اور خاندانی معمولات زندگی کے تجربات اور قدیم شریفانہ روایات ان کے انداز حیات کے وقار کے ضامن تھے ۔ اور ان کے طرز فکر میں قوس و قزح کی رنگینیاں اور کہکشاں کی نظر فریبیاں پیدا ہو گئی تھیں ۔

مولانا کی بچی باتیں بالخصوص اردو مسلم یونیورسٹی ۔ سیکولرزم اقلیتیں ، تعلیمات دین ۔ احتساب نفس ۔ تزکیۂ باطن پر مشتمل ہوتی تھیں ۔ وہ نہ کسی سے مرعوب ہوتے تھے ۔ اور نہ کسی کی خوشامد کرتے تھے ۔ نہ کسی سے کوئی توقع رکھتے تھے ۔ نہ کسی کی شکایت کرتے تھے ۔ فقر و درویشی گوشۂ تنہائی ۔ اور مطالعہ کتب ان کا محبوب مشغلہ تھا اور خوشحال کسانیکو بہر حال خوش اندر ، ان کا طریقۂ حیات و طرز زندگی تھا ۔ ان کا پیغام تھا کہ جب موقع ملے اپنے اندرون کا جائزہ بار بار لیجئے ۔ اور احتساب نفس پوری بے مروتی کے ساتھ ساتھ ہر روز بار بار کرتے رہیئے ۔ جب شاید کہ نفس کی کج روی کچھ قابو میں آسکے ،،

مولانا ماجد صدق جدید کے اداریٔ نوٹوں یعنی سچی باتوں میں برابر مسلمانوں کو بہت مخلصانہ انداز میں تنبیہ کرتے رہتے تھے ۔ اور تعلیمات اسلامی کے وہ پہلو بیان کرتے تھے کہ جو دوسرے خطیبوں اور واعظوں کے بیان کردہ مسائل سے بہت مختلف ہوتے تھے ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انضمام مذاہب و ادیان کی تبلیغ و کوشش بے سود ہے ۔ اس طریقہ کار بطور انداز استدلال سے قومی یکجہتی اور میل ملاپ حاصل

نہیں ہو سکتا۔ اصل چیز ایک دوسرے کے عقائد و جذبات مذہبی کا احترام ہے کثرت نہیں [illegible] ۔ اور رنگا رنگی میں یک رنگی پیدا کرنا (زندہ رہو اور زندہ رہنے دو) کے اصول اپنانے میں مدد دے سکتا ہے۔ مولانا کو شکوہ ہے کہ ہم لوگ قرآن کی تعلیم سے کوسوں دور ہیں ورنہ اس کتاب لاریب فیہ میں مسلمانوں کے خوف و حزن کا علاج بھی موجود ہے۔ اور ان کی بدحالی اور شکستہ دلی کا تدارک اور معالجہ بھی۔

مولانا محترم شاعروں اور قصہ گویوں کی لفاظیوں کے خلاف بھی برابر آگاہی دیتے رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارے شعرا با ستثنائے چند شہروں کی بولی بولتے ہیں۔ شراب خوری کی دل بھر کر ترغیب دیتے ہیں۔ عشق بازی کا شوق دلاتے ہیں۔ اور فرشتوں۔ انبیاء حتیٰ کہ خدا کی شان میں بھی گستاخیاں کرتے ہیں۔ ملت کے مزاج فاسد کی اصلاح کے لیے وہ اسلامی قدروں کی طرف توجہ کرنا ضروری سمجھتے تھے شاعرانہ ہرزہ سرائیوں۔ نیز مشاعروں کو درجۂ اسفل میں جگہ دینے کے قائل تھے شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کے رسالہ کلیم دہلی پر ۱۹۳۶ء میں اُن کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔

"جوش صاحب اب تک شاعر انقلاب تھے اب کلیم کے صفحات میں داعیٔ انقلاب کی حیثیت سے جلوہ آرا ہیں۔ پہلے ہی نمبر میں اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت پر ایک پرجوش مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ اس کو یوں شروع فرماتے ہیں "نوع انسانی کے مصلح بننے کا خیال کس قدر مضحکہ خیز تخیل ہے۔ تو دعوت انقلاب کو سنجیدگی اور حقیقت سے کس قدر تعلق ہے۔ دعوت انقلاب بار بار پڑھنے کے بعد [illegible] انقلاب میں نہیں ملتا۔

تذکرہ تجاس ذیل سے ہوگا۔ ہندو مسلمان دونوں کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں۔۔۔۔
میں تمہاری صفوں میں آندھی کی طرح گذروں گا۔ تمہارے بے مغز سروں پر کڑکی کمانوں
کی طرح کڑکوں گا۔ اور طوفانی بادلوں کی طرح گرجوں گا۔ تم پر میرا غیظ و غضب بھرے
ہوئے دیوتاؤں کا غیظ و غضب ہے۔ اے سودکھ ہندوؤں اور اے نادان مسلمانو! یا
دین دینا دھرم دھرم کا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ ان جھوٹی اور کھوکھلی آوازوں سے
اے دھوتی اور پاجاموں کے گرد ہو! اے بوٹے اور بڑے کی الجھنو! اے داڑھی اور
چوٹیوں کے اطلاو! تمہاری کس کس حماقت پر رحم کروں۔ یہ جوش و خروش غیظ
و غضب اگر محض تخلص کی مناسبت سے ہے اور یہ گرج اور چمک اور یہ
ہوش ربا تجلیات آتشیں اور سب سے بڑھ کر جواں ایک صاحب کے "یہ لن ترانیاں"
اگر اس میں کلیم کی شاعرانہ رعایت سے ہیں تو اس حسنِ ادا کی داد نہ دینا ظلم ہوگا لیکن
اگر ان کے سوا کوئی اور مصلحت ملحوظ رکھی گئی ہے تو اتنا رسا دماغ کوئی کہاں سے لائے۔
مرزا جعفر علیخان اثر صاحب کے اور بعض دوسرے صاحبوں کے ادبی مضامین
اچھے ہیں۔ خود جوش صاحب بھی تو بہت اچھے ادیب بن سکتے ہیں۔
(انشائے ماجد جلد اول)

فی الحقیقت جو شاعری ابتلاء عادتوں میں کی جاتی مولانا کو اس سے نفرت تھی
وہ اس کے عیب سے بھی واقف تھے اور اس کے ہنر کے مزاج بھی تھے۔ مولانا کی سخن
فہمی، نکتہ رسی۔ اور شعر و سخن سے دلچسپی کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ نسیم صدیقی کی ایک
غزل کے متعلق یہی باتیں کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ (صدق جدید جلد ۱۲ نمبر ۹)
"رنگینیٔ گفتار سے معمور ہے محفل اور غایت گفتار [illegible] رہا ہے
اور اس آب دیتی اور رنگ بیتی دونوں کے کتنے نقشے نگاہ کے سامنے کر دیئے۔
گفتار حسن گفتار بلکہ صرف گفتار سے جو غایت گفتار کس درجہ مختلف ہوتی ہے۔ قوال
[illegible] شاعر کا بہترین کلام پیش کر رہا ہے۔ کلام دل میں نشتر چبھو رہا
[illegible] مجازی عشق کو شہ [illegible]۔ لیکن قوال کی نظر پھیلا کے جیبے۔

پر ہے۔ اس کا مطلوب و مقصود جو کچھ بھی ہے بس محفل کی نذر رہا ہے۔ واعظ شیوا بیان بہترین نکتہ بیان میں لا رہا ہے۔ منہ سے نکلے ہوئے بول دلوں کو کھائے جا رہے ہیں۔ واعظ کی دل کی گہرائیوں میں نہ اللہ کا خوف ہے۔ نہ اللہ کی رضا کی طلب۔ سامعین خود قبلۂ مقصود بنے ہوئے ہیں۔ معتقدین کا حلقہ جتنا ہی بڑھ جائے اچھا ہی ہے اور حصول جاہ کے ساتھ ساتھ حصول مال و اضافۂ مال کی بھی کوئی صورت نکل آئے تو کیا برا ہے۔"

۱۹۶۹ء میں مرزا غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں ہر طرف بڑی بڑی تقریبات منائی گئیں۔ اور ادبی و سیاسی۔ ملکی و غیر ملکی حلقوں۔ اداروں میں غالب کے کمالات و کرامات پر خوب خوب خامہ فرسائیاں اور شیوا بیانیاں ہوئیں۔ جن میں غالب کی شخصیت۔ ذہانت۔ نغز گوئی۔ معنی آفرینی۔ داخلیت۔ خارجیت۔ فلسفہ تصوف عشق۔ دلبانگی۔ انفرادیت۔ مخلصیت۔ تعقید۔ شعور۔ اصطلاحات۔ انداز بیان۔ حسن ادا۔ طنز و مزاح۔ بذلہ سنجی۔ نفکر۔ تصرف۔ شعلہ نوائی۔ کج ادائی۔ مکتوب نگاری۔ صاحب نظری وغیرہا وغیرہ۔ سب کچھ زیر بحث آیا۔ مولانا عبد الماجد نے سب باتوں کو بغور سنا۔ اور سب پہلوؤں کو بامعان نظر دیکھا۔ لیکن جب مرزا غالب کے کسی پرستار یا شیدائی نے ان کے حب الوطنی یا انقلابی سرگرمیوں پر قلم اٹھایا۔ یا ان کو نقیب انقلاب و مجاہد آزادی قرار دے کر اہل محفل کو گرمایا۔ تو مولانا کی صدق گفتاری اس کو برداشت نہ کر سکی۔ اور بلا تکلف صدق جدید کی بھی باتیں اس کی تردید میں گرم نوا ہو گئیں۔ مولانا عبد الماجد کو ادیبوں و شاعروں سے طبعی محبت تھی۔ لیکن اس قسم کا التزام یا اتہام وہ روا نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ خوش فکری کی قدر کر سکتے ہیں۔ لیکن تزئین صداقت کسی حال میں بھی جائز قرار نہیں دے سکتے۔

مولانا کے مزاج میں خوش طبعی اور شگفتہ شالی بھی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ وہ دریائے لطافت کے غواص تھے اور بحر فصاحت کے شناور۔ وہ سراپا متانت و سنجیدگی ہونے کے باوجود بعض اوقات اپنے رنگین جملوں دلکش فقروں اور معنی خیز الفاظ سے محفل احباب

کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔ خود بھی محظوظ ہوتے تھے اور دوسروں کو خوش وقت کرتے تھے۔ رعایت لفظی، ضلع جگت، ایہام، اور ترصیع جو کام عہد رفتہ میں لیا جاتا تھا وہ بذات خود ایک فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا عبدالماجد کی تقریریں اور تحریریں اکثر اس فن کاری سے بھری ہوئی ہیں۔ اور بہت لطف دے جاتی ہیں۔

بھارت میں جب قومی دھارا کا زور شروع ہوا تو مولانا نے اس کو امرت دھارا کے قسم کی چیز قرار دیا۔ اس مضمون میں مولانا کی صدق گفتاری اور طنز نگاری اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے۔ اور بہت خوبصورتی کے ساتھ اس تحریک کی بنیادی کمزوریوں کو اور فتنہ پردازیوں کو طشت ازبام کر دی تھی۔

مولانا بہت حاضر جواب اور نکتہ رس واقع ہوئے تھے۔ ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے بڑے نکتے پوشیدہ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا ہاشم فرنگی محلی نے کچھ پنیر جس کو انگریزی میں Cheese کہتے ہیں مولانا کو بطور تحفۂ درویش بھیجا اس کے جواب میں مولانا نے عند الملاقات فرمایا کہ . . .

"آپ نے کیا چیز اس ناچیز کو بھیجی"

ایک موقع پر دیار جرأت کے دیوان کا ایک نسخہ جس کا سرورق نہایت خوبصورت اور جاذب نظر تھا۔ مولانا موصوف کو پیش کیا گیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا

"ایک اندھے کا دیوان اور اتنا روشن"

ایک شادی کی تقریب کے موقع پر بعد مغرب بجلی کا نظام درہم برہم ہو گیا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ اتنے میں جناب امیر حسن نورانی بھی اس طرف آنکلے۔ صاحب سلامت ہوتے ہی مولانا نے فرمایا۔ "نورانی کی موجودگی میں یہ تاریکی"

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں جو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم صدر جمہوریہ ہند کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ اردو کی زبوں حالی کا شکوہ بہت کھلے الفاظ میں کیا۔ مولانا عبدالماجد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے صدق جدید میں لکھا "خوب ہوا جو رشید کے یہ ارشادات مرشد کے سامنے ہوئے" ۔۔۔

والا ماست تک پہنچ گئے ؛؛

کمبنڈا کے تجارتی دنیا کی خبر جب مولانا کی نظر سے گذری کہ وہاں کے کھلونے بنانے والے ایک کارخانے نے گڈے اور گڑیا کے جنسی فرق کی پردہ داریوں کو ختم کر دیا۔ اور کھلونوں میں برہنگی کی کیفیت پیدا کر دی تو مولانا نے ۴ اراکتوبر ۱۹۶۶ء کے صدق جدید کی سچی باتوں میں لکھا :- اس کاروبار کی ترقی اور پھیلاؤ کا کیا کہنا جس میں نفس کے لئے لذت اور منفعت دونوں کے سرچشمے ابل پڑیں ۔ گاہک کے لئے لذت کی دولت اور دوکاندار کے لئے دولت کی لذت ؛؛

مولانا عبدالماجد اسلامی ۔ ادبی ۔ نفسیاتی ۔ اور اخلاقی دنیا کے علاوہ صحافتی دنیا میں بڑے وسیع مطالعہ اور سوجھ بوجھ کے مالک تھے ۔ ان کی نظر میں ملکی و غیر ملکی اردو و انگریزی اخبارات و رسائل پر رہتی تھیں ۔ اور ان میں سے کام کی باتوں سے اقتباسات اکثر و بیشتر بڑے دلکش اور جاذب توجہ عنوانات کے ساتھ سچی باتوں کا موضوع ہوا کرتی تھیں ۔ مولانا کے تبصرے اور تنقیدیں ان اخبارات کے تراشوں میں مواعظ حسنہ اور برمحل نصائح کے مواقع نکال لیتی تھیں ۔ اور روز مرہ کے معمولی یا افتادہ واقعات سے اخلاقی نکتہ اور صحت مند نتائج اخذ کر لیتی تھیں کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی تھی ۔ اور ان کے زاویہ نگاہ کی تعریف میں صداقت اور حسن استدلال مرحبا اور سبحان اللہ کہہ اٹھتے تھے ۔

نومبر ۱۹۶۸ء میں لکھنؤ کے ایک قابل مخیر اور ادب نواز مقبول احمد لاری نے اپنی طلائی جوبلی کے موقع پر مختلف تعلیمی اور سماجی اداروں کو بیش قیمت عطیات سے سرفراز کیا لیکن اس فہرست میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں آیا ۔ اس فروگذاشت سے متاثر ہو کر مولانا نے تبصرہ فرمایا " بنارس کو یاد رکھنا اور علی گڈھ کو بھول جانا اس دور میں مولانا لیک مسلمان کے اور کون کر سکتا ہے ۔ کیا اس کا بھی امکان تھا ۔ کہ کوئی ہندو دھار درہش کے موقع پر بنارس کو بھول جاتا اور علی گڈھ کو یاد رکھتا ؛؛

صحافت میں جانب داری یا ملکی سیاسیات میں عملی شرکت سے مولانا کو دور کا بھی واسطہ نہیں تھا بالخصوص بقول ان کے غیر ملکی سیاسیات پر کوئی رائے زنی صدق کے مسلک میں داخل نہیں ہے لیکن پھر بھی اگر کوئی ایسی خبر دیکھتے تھے جس سے اندیشہ گزرتا تھا کہ غیر ملک اپنے ملک کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کا مرتکب ہو رہا ہے تو اس پر تنبیہ و تہدید کو فرائض صحافت میں شمار کرتے تھے۔

مسٹر بھٹو کی سیاسی پارٹی کے منظور کردہ اس ریزولیشن کہ . .

"پاکستان کو آسام کی حکومت اور عوام سے خصوصی تعلقات قائم کرنا چاہئیے"

مولانا صدق جدید میں "غلط راہ پر" کے زیر عنوان لکھتے ہیں "ایک دوسرے کے اندرون ملک کے معاملہ میں مداخلت کرنا خصوصاً جب کہ اسباب رنجش پہلے ہی سے موجود ہوں ـ ہرگز اپنے ساتھ خیر خواہی نہیں ـ رنجش کو گھٹانے کا یہ راستہ نہیں ـ یہ تو اس کو بڑھانا ہوا ـ مشرقی پاکستان جس طرح معاملہ خالص پاکستان کا ہے ـ ہندوستان کو اس میں بولنے کا کوئی حق نہیں ـ ٹھیک اسی طرح آسام معاملہ ہندوستان کا ہے پاکستان کیوں اس میں دخل در معقولات کرے"

(۵ جنوری ۱۹۶۸ء)

مولانا مرحوم کی صدق گفتاری کی زد میں ایوب خان ـ یحیٰی خان بھی آتے تھے اور ڈاکٹر ذاکر حسین بھی ـ حیات اللہ انصاری بھی آتے تھے ـ اور آل احمد سرور بھی ـ علی یاور جنگ بھی آتے تھے اور ڈاکٹر علیم بھی ـ ڈاکٹر احسن فاروقی بھی آتے تھے اور جوش ملیح آبادی بھی ـ آر ـ ایس ـ ایس اور جن سنگھ کے منتظمین اعلیٰ بھی آتے تھے اور مجلس مشاورت کے قائدین ملت بھی ـ لیکن ان کی طنز نگاری اور حق گوئی میں ذاتی حملوں اور شخصی کمزوریوں کا کوئی ادنیٰ شائبہ یا تذکرہ نہیں ہوتا تھا ـ نہ مقصد کسی کی تذلیل و توہین ہوتی تھی وہ بے لاگ تبصرے کرتے تھے ـ اور غیر جذباتی انداز میں صاف صاف اپنی رائے لکھتے تھے ـ

ملک وقوم کی خدمت اور انسانی برادری کی سیوا کو اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ اور صحافت نہ
انشاء کو یک باوقار اور جرأت مندانہ مشغلہ بنائے ہوئے تھے۔ مولانا کو اپنے طویل تجربہ کو
جو بھی باتیں کرنے سے انھیں حاصل ہوا تھا۔ ہفتہ وار "صحافت کے آداب" کے زیر عنوان
محفوظ کر دیا ہے۔ جو حسب ذیل ہے۔

(۱) مقصود خدمت دین وملت رکھیے عام خدمت خلق بھی اس کے تحت آجاتی ہے۔
(۲) وطن کا بڑا حق ہے جس طرح پڑوسی کے استاد کے اور اہل خاندان کے ہوتے ہیں۔
البتہ مسلمان پرستار وطن کا نہیں ہوسکتا عبودیت کا خصوصی تعلق تو صرف ذات حق
کے لئے مخصوص ہے اس کی مخلوق میں سے کسی کے حصہ میں نہیں آسکتا۔
(۳) خبر برائے خبر کا روزناموں میں جو بھی درجہ ہو ہفت روزہ میں تو یہ ایک مہمل چیز ہوگی
ہفت روزہ میں اپنے تبصرہ سے یا کم از کم خبر کی سرخی ہی سے ہر خبر کو با مقصد بنا کر پیش
کیجئے۔
(۴) پبلک کے جذبات کی نمائندگی پر ہو کر اکتفا نہ کیجئے۔ پبلک کے مذاق اور جذبات
کی اصلاح کی کوشش جاری رکھیے۔
(۵) اپنی مقبولیت اور مرجعیت کا خیال کسے نہیں ہوتا۔ ایک حد تک یہ خیال بالکل
فطری ہے۔ لیکن اس جذبہ کو ہمیشہ حدود کے اندر رکھیے۔ اور اپنے اوپر غالب
ہرگز نہ آنے دیجئے۔
(۶) صحافت ایک قسم کی تجارت نہیں ایک قسم کی عبادت ہے۔ بس اسی کو نصب العین
بنا کر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیے۔
(۷) دوسروں کا احتساب ہر پبلک معاملے میں روا کیجئے۔ لیکن اپنے کو احتساب سے
بالا خیال نہ کیجئے۔ احتساب نفس کو سب پر مقدم رکھیے۔
(۸) بلاوجہ معقول کسی کی دل آزاری کیا معنی۔ دل شکنی کو بھی گوارہ نہ کیجئے۔
اور مروت کے حدود بھی قائم کر لیجئے۔ ان سے آگے قدم نہ رکھیے۔
(۹) ملک کی اکثریت کا اور حکومت وقت کے قانون کا لحاظ ضرور رکھیے۔

حتی الامکان راہ سلامت روی اختیار کیجیے لیکن مرعوبیت اور احساس کمتری کی حد تک ہرگز نہ پہنچ جایئے۔ صلح و سازگاری دوسری چیز ہے اور بزدلی و خوشامد بالکل دوسری۔

(۱۰) بلا وجہ کسی سے نہ الجھیے۔ نہ خواہ مخواہ تکرار پیدا کیجیے۔ لیکن دوسری طرف جھکیے اور گریے بھی نہیں۔

(۱۱) پبلک تنقید آزادی سے کیجیے لیکن ذاتیات سے اتر آنے سے اپنے آپ کو اہتمام کے ساتھ بچایئے۔ کسی کے نسب پر۔ وطن پر یا شکل و صورت پر طنز کرنا سب ذاتیات ہی کی شکلیں ہیں۔

(۱۲) مزاج شگفتگی، خوش طبعی۔ علامتیں شرافت نفس کی ہیں، اور تفحیص، تضحیک اور پھکڑ بازی۔ علامتیں دنائت اور سفلہ پن کی۔ اس فرق عظیم کو ہمیشہ نظر میں رکھیے۔

(۱۳) آپ بھی ہر حال میں انسان ہی ہیں اور معاملہ بشری جذبات رکھنے والے غصہ سے آپ بھی بھڑک اٹھتے ہیں۔ ایسے موقع پر نفس کو قابو میں رکھنا ہی آپ کی بلند کرداری کی دلیل ہوگی۔

(۱۴) دیانت کے امتحان بھی اسی راہ میں سخت سخت آتے رہتے ہیں۔ بچنے کو بچانے کا خاص اہتمام کیجیے۔

(۱۵) غلطی کا امکان ہر بشر کی طرح آپ کے لیے بھی ہے۔ غلطی کا علم ہو جانے پر اس کے اعتراف سے اسے واپس لینے سے۔ اس پر معذرت کرنے سے شرمایئے جھجکیے نہیں۔

(۱۶) جس طرح زبان سے نکلی ہوئی ایک ایک بات قابل گرفت ہو سکتی ہے اسی طرح قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بھی جرح کی زد میں آ سکتا ہے۔ خیال کریئے اور ڈرتے رہیئے۔ اس وقت جب آپ کا سارا دفتر آپ کے سامنے ہوگا۔ اور آخری اور حقیقی عدالت میں اس کے ایک ایک لفظ پر سوال ہو رہا ہوگا۔

یہ ہیں وہ سنہرے اصول صحافت صدق جن پر سوال تا حیات کاربند رہے۔ ان کی تحریروں میں خرد آموزی بھی ہوتی تھی۔ اور دانش پروری بھی

صنعت آمیزی بھی ہوتی تھی اور بصیرت افروزی بھی۔ جرأت بھی ہوتی تھی اور للہیت بھی۔ ان کے کھدر پوشی اور خرقہ بدوشی ان کے ضمیر کی شرافت اور زندگی کی پاکبازی کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے اپنے مزاج خسروانہ کو حیات درویشانہ میں ڈھال لیا تھا۔ وہ فکر آخرت کو نشاط حیات پر مقدم رکھتے تھے۔ وہ درباروں سے بھی تعلق برقرار رکھے ہوئے تھے۔ اور درگاہوں سے بھی۔ وہ مرد مومن بھی تھے اور مرد آہن بھی۔ وہ صاحب قلم و عرفان بھی تھے اور صاحب نظر ایقان بھی۔ وہ نباض قوم بھی تھے اور ماہر نفسیات بھی۔

اکبر الہ آبادی پر جو الزام عائد ہوا تھا اور جس کی رپٹ رقیبوں نے تھانے میں لکھوائی تھی وہی الزام مولانا پر بھی لگایا گیا تھا کہ

ع " ماجد نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں "

لیکن مولانا کو اس کی مطلق پرواہ نہ تھی وہ تند و تیز ہواؤں میں بھی اپنا چراغ جلائے ہوئے تھے اور صدق گفتاری کو آئینۂ حق نما بنائے ہوئے تھے۔ ان کی انشائے لطیف نے ایک بلند معیار اور باوقار نمونہ ملک و قوم کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ جس میں " تجد " بھی ہے اور " وجد " بھی۔ وہ ہمارے برگزیدہ انشاپردازوں کے سلسلہ کی آخری کڑی تھے۔ اور ان کی انفرادیت خود " بوبد " کی روشن دلیل ہے۔ ان کی تقریر و تحریر کا انداز بآسانی پہچان لیا جاسکتا ہے۔ اور آن واحد میں واضح کر دیتا ہے کہ کس قلم کار کی سحر طرازی ہے۔ اور کس نابغۂ روزگار کی جادو بیانی ہے۔ ان کے مقالات میں علامہ شبلی اور مولانا محمد حسین آزاد کی اردو خاکہ نگاری۔ زرّیں نگاری کی جھلک بھی موجود ہے۔ اور مولانا محمد علی کی جرأت و بےخوفی بھی۔ وہ لکھنؤ کے دبستان ادب کی گذشتہ عظمتوں کی یادگار تھے۔ اور وضعداری کی زندہ مثال۔ وہ پیرانہ سالی میں بھی آئین جوانمرداں پر قائم رہے۔ اور خودی کی سربلندی کے قائل۔ ان کی زندگی صدق نگاری کے مصداق اس شعر کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ ۔ ۔ ۔

آئین جوانمرداں حق گوئی و بےباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مولانا عبدالماجد بحیثیت سوانح نگار

اردو زبان میں سوانح نگاری کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ظاہر ہے خود اردو زبان کی عمر تین سو سال سے زیادہ ہے۔ جو کسی زبان کے ارتقا کے لئے بہت مختصر مدت ہے۔ لیکن یہ امر حقیقت ہے کہ جس طرح اردو زبان نے اپنی مختصر زندگی میں ہر صنف میں غیر معمولی ترقی کی اسی طرح سوانح نگاری کے میدان میں بھی اس نے تیز رفتاری دکھائی۔

اردو میں باقاعدہ سوانح نگاری کا آغاز مولانا الطاف حسین حالی نے کیا۔ "حیات جاوید" "یادگار غالب" ان کے دو سوانحی شاہکار ہیں۔ اس اعتبار سے سوانح نگاری کے باقاعدہ آغاز کے لئے ۸۰ سال سے زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ مگر اس قلیل عرصہ میں اردو زبان کو چند باکمال سوانح نگار بھی ملے۔ اور کچھ ایسی سوانح عمریاں بھی سوانح نگاری کے فن کو ترقی دینے والوں میں مولانا شبلی نعمانی اور ان کے تلامذہ کی حیثیت نمایاں ہے۔ اس کے بعد سوانح نگاری عام ہو گئی۔ اور لکھنے والے بھی بے شمار پیدا ہوئے۔ لیکن معیاری اور صاحب طرز سوانح نگار گنے چنے ہی ہیں۔

سیرت نگاری کا جو اعلیٰ شاہکار مولانا شبلی نعمانی کا "الفاروق" ہے یہ کتاب قدیم اور جدید اصول سوانح نگاری کا دلکش اور مناسب امتزاج ہے۔ اور عہد حاضر کی بہترین سوانح عمریوں میں شمار کی جاتی ہے اس میں شبلی کا فنی شعور درجہ کمال پر نظر آتا ہے۔ وہ ایک مشکل ٹیکنیک سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ مولانا راشد الخیری۔ خواجہ حسن نظامی۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ غلام رسول مہر وغیرہ نے اچھے سوانحی خاکے پیش کئے ہیں۔ اس عہد کے دوسرے ممتاز سوانح نگاروں میں عبدالحلیم شرر۔ مرزا حیرت دہلوی۔ قاضی سلیمان منصورپوری۔ عبدالرزاق کانپوری۔ حکیم محمد حسین الہ آبادی۔ منشی محمد دین فوق وغیرہ ہیں۔

حالی اور شبلی کے بعد سوانح نگاری نے مختلف مراحل طے کرکے بیسویں صدی میں قدم رکھا۔ اور ان کے بعد اردو ادب میں چند اچھے سوانح نگار منظر عام پر آئے۔
"سیرت عائشہ،، لکھ کر مولانا سید سلیمان ندوی نے اردو میں کسی عورت کی پہلی سوانح عمری لکھنے کا فخر حاصل کیا۔ اس دور میں اسلم جے راجپوری۔ حبیب الرحمن شیروانی۔ رشید احمد صدیقی۔ قاضی عبد الغفار۔ شوکت تھانوی نے اچھے سوانحی خاکے پیش کئے۔ ان حضرات نے اس صنف کو بہت کچھ دیا۔ اور اسے آگے بڑھایا۔
شبلی نعمانی کے سلسلہ کے ایک صاحب طرز انشاء پرداز اور باکمال سوانح نگار مولانا عبد الماجد دریابادی تھے۔ اور موجودہ دور کے اردو مصنفین کی صف اوّل میں سے تھے جو علمی وادبی دنیا میں مختلف حیثیتوں سے بہت ممتاز تھے۔
اور جب انھوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو ان کو شبلی نعمانی کی رفاقت اور رہنمائی حاصل ہوئی ایسی حالت میں ان کو سوانح نگاری کے اصول وضوابط سے جو واقفیت ہو سکتی ہے۔ وہ دوسرے کے لئے اس حد تک ممکن نہ تھی۔ اس کے ساتھ ان میں بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مغربی علوم اور انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے مغربی سوانح نگاروں کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ اس لئے ان کے سامنے اس فن کی راہیں بہتوں سے زیادہ روشن تھیں۔ مشرق ومغرب روایات سوانح نگاری کو پیش نظر رکھ کر مولانا عبد الماجد نے جو ادبی خدمات انجام دیں۔ ان سے انھوں نے اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا۔

بحیثیت سوانح نگار ان کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے تو اس سے اردو سوانح نگاری کے معیار پر بھی روشنی پڑے گی۔ اور اس فن میں خود مولانا کی مہارت اور دوسرے پہلوؤں کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

مولانا عبد الماجد نے زمانۂ طالب علمی سے مضمون نگاری شروع کی تھی اور جب وہ کالج کے طالب علم تھے اس وقت ایک اچھے مضمون نگار کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کرلی تھی۔ ان کے مضامین میں کبھی کبھی خاکے بھی ہوتے تھے۔ اور ان کے

انداز تحریر اور حالات پیش کرنے کے ڈھنگ میں کسی قدر ندرت ہوتی تھی جس کا اندازہ ان کے مضامین سے بخوبی ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے سوانح نگاری میں اچھی خاصی مہارت حاصل کی اور مغربی سوانح نگاروں کی مشہور کتابوں کا مطالعہ کیا۔ جس کی بدولت ان کو جدید سوانح نگاری کے اصولوں سے بھی واقفیت حاصل ہوئی۔

مولانا نے بعض ادیبوں اور شاعروں پر جو سوانحی مضامین لکھے ہیں ان میں بعض بہت مقبول ہوئے ہیں۔ ان کی اپنی فنی خوبیوں کے باعث انھیں ادبی جواہر پارے کہا جا سکتا ہے۔ نواب مرزا شوق لکھنوی اور ان کی مشہور مثنوی "زہرِ عشق" پران کا مضمون اب بھی نئے لکھنے والوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اکبر الہ آبادی پر مولانا کے مضامین حرفِ آخر کہے جا سکتے ہیں۔

مولانا مرحوم نے فن سوانح نگاری میں جو مہارت حاصل کی اس کا پورا اندازہ عام طور پر اس وقت ہوا جب ان کی لکھی ہوئی چند سوانحی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ اس میں مولانا کے طرز تحریر کی انفرادیت بھی پورے طور پر نمایاں ہے۔ اور حالات کو پیش کرنے کا خاص ڈھنگ نظر آتا ہے۔

سوانح حیات کے سلسلے میں مولانا کی حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:
(۱) حکیم الامت (۲) اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں۔ اکبر الہ آبادی کے حالات اور شاعرانہ کمالات پر مضامین کا مجموعہ۔ (۳) محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق مشہور سیاسی رہنما مولانا محمد علی جوہر کی زندگی کے اہم حالات اور کارناموں کا ذکر۔ (۴) سیرت نبوی قرآنی۔ قرآن شریف کی آیات کی مدد سے آنحضرت صلعم کی زندگی کے مختلف گوشوں کو پیش کیا ہے۔ اور نہایت مربوط طریقے سے۔ ان کتابوں کے علاوہ مولانا کے مضامین کے مختلف مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سوانحی مضامین بھی شامل ہیں۔ ان کتابوں کو سامنے رکھ کر سوانح نگاری کے اہم اصولوں کی کسوٹی پر رکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب کس حد تک ہوئے ہیں۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے جو تکنک اختیار کی تھی اس میں کیا خوبیاں

اور کیا خامیاں تھیں۔

حکیم الامت۔ نقوش و تاثرات — مولانا اشرف علی تھانوی کے حالات و کارناموں کا مرقع ہے۔ مولانا اشرف علی بیسویں صدی کے علماء اور صوفیا میں بہت ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ اسی لئے وہ اپنے تجدیدی کارناموں کے باعث حکیم الامت کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اس آخری دور میں ان سے بہتر اور تمام تصوف و سلوک کا باعمل مرشد شاید ہی کوئی دوسرا نظر آئے۔

مولانا عبدالماجد نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں مولانا تھانوی کا تعارف اور اپنی کتاب کا سبب تصنیف جس انداز میں تحریر کیا ہے اس سے نہ صرف یہ کہ کتاب کے مواد پر روشنی پڑتی ہے بلکہ خود مولانا عبدالماجد کے انداز سوانح نگاری اور اس کے مقاصد پورے طور پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ان کے انوکھے طرز تحریر نے لطیف اشارات و کنایات کی مدد سے ساری اہم باتوں مختلف الفاظ میں سمیٹ لیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"حکیم الامت امام اشرف علی تھانوی بزرگ کس مرتبہ اور ولی کس پایہ کے تھے یہ حال تو وہی بتا سکتا ہے جو خود بھی بزرگ، عارف اور ولی اللہ ہو۔ اپنے کو تو اس کوچہ کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اس لئے اگر کسی صاحب نے اس کتاب کو اس ارادہ سے کھولا ہے کہ اس میں حضرت کے مرتبۂ معرفت و ولایت کی تفصیل درج ہوگی یا ان صفحات میں حضرت کے مناقب عرفانی و مدارج روحانی کا بیان ہوگا تو خیر اسی میں ہے کہ آگے وہ ورق گردانی کی زحمت ہی نہ گوارہ فرمائے۔ اور کتاب کو بے پڑھے کہ بند رہنے دے۔ یہ چند اوراق نہ کتاب المناقب ہے نہ ملفوظات مرشد یا سیرت الشیخ۔ اس کا موضوع ان سب سے الگ ہی نہیں سب سے پست بھی ہے۔

حضرت شیخ کے کمالات و فضائل جو کچھ بھی ہوں۔ حکیم الامت اشرف علی تھانوی نامی ایک انسان بھی تو اسی صدی میں ہوئے ہیں۔ ان کی عمر کے آخری پندرہ سولہ سال کے زمانے میں اس نامۂ سیاہ کو ان سے نیاز مندانہ گہرا نیاز رہا ہے۔

ہر کس ان نقوش و تاثرات کے اندر بند کر دینے کی کوشش الٹی سیدھی آپ کو یہاں ملیگی؛
اور چونکہ ان کی انسانیت ان کے مفسّر و فقیہہ اور درویش ہونے الگ کی بھی نہیں جاسکتی۔
اس لئے ضمناً ان کے علم و فضل، تفقیہہ اور سلوک کا لانا بھی ناگزیر ہو گیا ہے۔

ع بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر۔

مولانا عبد الماجد نے نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ اپنے مقصد کو بڑے پر اثر انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس سے ان کے اصول سوانح نگاری پر روشنی پڑتی ہے۔ اور با مقصد سوانح نگاری کے خد و خال بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے پوری کتاب انہی مقاصد کو پیش نظر رکھا ہے۔ جس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے بخوبی ہوتا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے حالی کی سوانح نگاری کے بارے میں لکھا ہے

"سوانح عمری میں سب سے زیادہ ضروری چیز وہ ہمدردی ہے جس کے بغیر سوانح نگار ہیرو کی نفسیات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ حالی کے یہاں یہ چیز موجود ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کی کتاب کو مدلل مداحی۔ کتاب المناقب اور یک رخی تصویر کہا گیا ہے۔ اور اس قسم کے اعتراضات تو باسول کی کتاب لائف آف جانسن پر بھی کئے گئے ہیں۔ حالانکہ سوانح نگاری میں یہ دلیل راہ کا کام دیتی ہے"

سرور صاحب کے اس حقیقت افروز بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے۔ کہ مولانا عبد الماجد کے اندر ہمدردی کا وہ وصف پوری طرح موجود ہے۔ جس نے ان کو ہیرو کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھنے میں مدد دی۔ حالی کی حیات جاوید اور یادگار غالب کو بعضوں نے مدلل مداحی قرار دیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ یک رخی تصویر ہے۔ لیکن اس دعوے میں صداقت جتنی بھی ہو یہ بہر حال [illegible] کرنا پڑے گا کہ ہیرو کے فضائل و مناقب سوانح حیات کے لازمی جزو ہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تصویر کا ایک ہی رخ رکھا۔ [illegible]

[illegible] سہارا۔

مولانا عبدالماجد نے حکیم الامت میں مولانا اشرف علی تھانوی کے حالات ایک خاص زاویہ نگاہ سے پیش کئے ہیں۔ انھوں نے مولانا کو ایک مکمل انسان اور محسن انسانیت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ نہ یہ کہ ان کے نام ونسب، طول طویل خاندانی حالات لکھ کر اصل مقصد کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کی یہ سوانح نگاری کے عام اصولوں سے ذرا ہٹ کر چلنے کی پہلی کوشش ہے۔ انھوں نے حکیم الامت کے متعلق جن جذبات وتاثرات کا اظہار کیا ہے ان کی روشنی میں مدلل مداحی والا جو الزام لگایا جاتا ہے وہ ان پر بھی صادق آسکتا ہے۔ وہ اپنے مرشد تھانوی کے متعلق لکھتے ہیں کہ ..... " اپنی اس چھپن سال کی زندگی میں اللہ والے متعدد دیکھ ڈالے۔ اللہ والوں میں خود اپنی والدہ اور ہمشیرہ ہی کو دیکھا۔ بڑے بڑے عابد زاہد متقی۔ تہجد گزار نظر سے گزرے یہاں تک کہ سرسری زیارت مکہ مکرمہ میں وقت کے مجاہد اعظم شیخ سنوسی ثانی کی بھی نصیب رہی لیکن اصلاح وارشاد کی مسند نشینی کا معیار ۱۵ - ۱۶ سال کے تجربے میں جیسا حضرت تھانوی کو پایا۔ کسی اور کو نہ پایا۔

ع عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں "

مولانا عبدالماجد نے مذکورہ بالا عبارت میں جس گہری عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے اور مختصر الفاظ میں جو مداحی کی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مولانا تھانوی کو بحیثیت ایک انسان متعارف کرانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان کی مداحی کی بنیاد اس غیر معمولی عقیدت پر ہے جو ان کی عملی زندگی کو دیکھ کر مولانا عبدالماجد کے دل میں پیدا ہوئی۔

اس کتاب میں مولانا عبدالماجد نے سوانح نگاری کے عام اصولوں سے انحراف کرکے ایک خاص نیا انداز اختیار کیا ہے۔ مولانا حالی نے سوانح نگاری میں تنقید کو بھی شامل رکھا ہے۔ حیات سعدی۔ اور یادگار غالب دونوں میں سوانح اور تنقید دونوں موجود ہیں۔ لیکن

حیات جاوید جو بعد میں لکھی گئی ہے۔ ایک ایسی مکمل سوانح عمری ہے جس میں صرف حالات ہیں تنقید نہیں ہے۔ حالی کا اصول یہ تھا کہ وہ حالات پر بہت زیادہ زور نہیں دیتے۔ ہر چیز کا جائزہ تنقیدی نقطۂ نظر سے لیتے ہیں۔ ان کی سب سے زیادہ توجہ اپنے ہیرو کے کارنامے نمایاں کرنے میں رہتی ہے۔ مولانا عبدالماجد نے حقائق و دلائل کے ساتھ مولانا تھانوی کی زندگی کے حالات اور اور روزمرّہ کے معمولات کو اپنے مشاہدات کے بعد بیان کیا ہے۔ اس میں ان کے انداز بیان نے مزید دلکشی پیدا کر دی ہے۔ جب مولانا تھانوی سے ان کی پہلی باقاعدہ ملاقات ہوئی اور ان کی مجلس میں شریک ہوئے تو اس وقت کے تاثرات کو اس طرح بیان کیا ہے....

" یہ نشست حضرت کی خاص سہ دری میں ہوئی۔ درمیان میں شرقی غربی دیوار سے متصل ڈیسک کے سامنے ایک سندنما فرش پر حضرت تشریف فرما ہاتھ میں تسبیح، ایک چھوٹی گھڑی سامنے ڈیسک پر قلمدان وغیرہ کے ساتھ رکھی ہوئی دوسری بڑی گھڑی۔ دھوپ گھڑی کے حساب والی دیوار میں لگی ہوئی۔ داخلے والے دروازے پر حضرت کا نظام نامۂ اوقات لگا ہوا۔ غافل انسان کو وقت کی قیمت اور اہمیت کا سبق دینے والا۔ بائیں طرف مولانا بٹھائے گئے اور اس کے بعد ہم لوگ۔ بیٹھنے بٹھانے کے سب کے آداب قاعدے حضرت کی مجلس میں مقرر تھے۔ ہر چیز میں ترتیب اور ڈھنگ۔ ہر بات میں نظم و آہنگ۔ یہ تو مجلس خاص اور خصوصی تھی۔ بعد میں یعنی بعد نماز ظہر مجلس عام میں بھی یہ قاعدہ تھا کہ حضرت کے داہنے ہاتھ پر سہ دری میں جو جگہ پڑی ہوئی تھی وہ عام طالبین و واردین کے لئے تھی۔ ہر شخص جہاں جگہ پائے بیٹھ جائے کسی دوسرے کو نہ اٹھائے نہ کھسکائے۔ بائیں طرف نسبتاً جگہ کم تھی اور تنگ تھی کوئی سات آٹھ شخصوں کے بیٹھنے بھر کی۔ ادھر مخصوص بٹھائے جاتے تھے۔ دو چار شخص سامنے بھی بیٹھ سکتے تھے۔ ایک ایک در کی دیوار کی آڑ میں بغیر دوسرے کے حق میں حجاب بنے

ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ "

مصرعہ سنا ہوا ہزار مرتبہ کا تھا۔ شنیدہ اور دیدہ کے درمیان، فرق کا درجہ بالکل واضح ہوا۔ رعب و ہیبت کی کیفیت میں اب خاصا فرق آگیا تھا اور حاضری کے بعد معلوم ہوگیا تھا کہ مولانا محض نور کے بنے ہوئے اور تقدس کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ آب و گل سے ترکیب پائے ہوئے انسانی دل بشری جذبات رکھنے والے انسان ہیں"

سوانح نگار کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی کے اچھے برے افعال کا محاسبہ کرے یا اس کی پردہ دری کرے بلکہ اس کا فرض یہ ہے کہ دیانت داری کے ساتھ اور سلیقہ مندی سے اپنی معلومات و مشاہدات کو اچھے پیرایہ میں پیش کرے۔ اس اصول کی روشنی میں مولانا عبدالماجد کی لکھی ہوئی سوانح کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اس اصول کی کتنی پابندی کی ہے۔ ایک اچھے سوانح نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ تفصیلات کے انتخاب میں کسی اہم پہلو کو نظر انداز نہ ہونے دے۔ حکیم الامت میں لکھتے ہیں . . .

" کوئی نو ساڑھے نو پر خانقاہ پہنچ جاتا۔ گھر سے دو قدم پڑھ ہی حضرت سہ دری میں تشریف فرما ہوتے۔ ہاتھ میں تسبیح کبھی ہوتی کبھی نہ ہوتی۔ بائیں طرف دیوار میں دھوپ گھڑی کے حساب سے وقت بتانے والی بڑی گھڑی لگی ہوتی ہے اس کے نیچے بیٹھنے کا ایما فرمایا جاتا۔ ایک جیبی گھڑی کھلے ہوئے کیس میں حضرت کے سامنے ڈایک پر رکھی رہتی دو چار لوگ اور آجاتے عموماً اہل خصوص ہی ہوتے بڑا مجمع کبھی نہ ہوتا۔ نشست کوئی ڈیڑھ گھنٹے رہتی۔ باتیں ہر قسم کی ہوتی تھیں۔ گفتگو کا بیشتر حصہ مولانا خود فرماتے۔ لیکن ہم لوگوں کو بھی بولنے چالنے بے تکلف پوچھنے یا جیسے سوال و جواب کرنے کی اجازت تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی سائل کے سوال پر یا خود مولانا کسی فقہی۔ کلامی۔ تفسیری یا سلوکی مسئلہ پر کوئی مسلسل تقریر ذرا لمبی شروع فرما دیتے جیسے حاضرین بڑے انشراح

قلب مے ساتھ سنتے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا۔ عموماً در بیشتر یہ تھا کہ معمولی طرز پر دو دوستوں کے درمیان جیسے گفتگو ہوا کرتی ہے مہی رہتی بغیر اس کے کہ سننے والوں کے دماغ پر کسی قسم کا دار پڑے ،،

حکیم الامت میں مولانا نے مختلف پہلوؤں سے مولانا تھانوی کی زندگی کے حالات اور شخصیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے سوانح نگاری کے مروجہ اصولوں سے ہٹ کر جو واقعات وحالات جہاں مناسب سمجھا بیان کر دیئے ہیں۔ کتاب کا بیشتر حصہ ان کی باہمی خط وکتابت پر مشتمل ہے جو دونوں کے درمیان ہوتی رہی۔ ان کو مرتب نے اس انداز سے ترتیب دیا ہے کہ وہ سوانح عمری کا ایک جز معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا عبد الماجد کے خط کا اقتباس حسب ذیل ہے

"پچھلے زمانہ حاضری کی ممنونیت کی داستان کہاں تک پھیلاؤں البتہ اتنی شکر گزاریوں کے ساتھ ایک شکایت بھی ہے اس کا اظہار ضروری ہے

(ا) شکایت یہ ہے کہ اب کی جب حاضر ہوا تو تاریخ و وقت حاضری صرف ظن غالب کے طور پر عرض کیا تھا۔ لیکن جناب نے اسٹیشن تک زحمت فرمائی میں اس گاڑی سے پہنچنے سے معذور رہا۔ اس کا علم مجھے ایک عرصہ کے بعد محض اتفاقاً مولوی محمد محمود صاحب سے ہوا۔

(ب) دل کی بڑی ندامت و تکلیف ہوئی۔

(ج) آئندہ کے لئے دست بستہ اس قسم کے اخلاق سے معافی چاہتا ہوں

(د) مجھے اس سے بجائے راحت کے تنگی معلوم ہوتی ہے ،،

اس طویل خط کا جو مختصر جواب مولانا تھانوی نے دیا اس کا وہ حصہ درج ذیل ہے جو مذکورہ بالا اقتباس سے متعلق ہے۔ ہر جواب مختصر اور ایک جملے میں ہے۔۔۔

(ا) بہت ضروری ہے۔ یہ شکایت نہیں ذوق محبت کے مزے۔۔
مگر جیسے شکایت میں مجھ کو مزہ آیا زید ہے کہ اس روایت کے خلاف واقعہ

ثابت ہونے سے آپ کو اس سے زیادہ مزہ آئے گا۔

(ب) یہ ان کا اجتہاد تھا۔ نہ میں نے ان سے ظاہر کیا نہ واقعتاً اس مقصد سے گیا تھا۔ اس وقت یہ تو مجھے یاد نہیں رہا کیوں گیا تھا۔ خاص کر جب اپنے دوست پر بار پڑنے کا احتمال ہو۔

(ج) اس کے ذمہ دار سر دفتر صاحب ہیں۔ محمود صاحب نہیں۔

(د) میں تو واقعی آپ کے دست بستہ ہونے سے پہلے ہی پابستہ ہوں میں کبھی تکلیف دینا نہیں چاہتا اطمینان فرمائیں "

دونوں خطوں کے اقتباسات سے مولانا تھانوی کی زندگی کے کئی گوشے سامنے آجاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ سوانح نگار کی عقیدت۔ محبت اور احتیاط کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اس کو سوانح نگاری کا ایک انوکھا طرز کہا جا سکتا ہے۔

مولانا عبدالماجد کی یہ کتاب شروع سے آخر تک اسی طرز اور نرالے انداز میں لکھی ہوئی ہے۔ اس کتاب کو دیکھنے والا پہلی نظر میں مضامین کی بے ربطی اور عدم تسلسل کو دیکھ کر اکتاہٹ محسوس کرتا ہے کیونکہ مولانا عبدالماجد نے عام سوانح نگاروں کی طرح کتاب کو نہ تو ابواب و فصول پر تقسیم کیا ہے نہ مضامین کی ترتیب کا کوئی نظام ہے۔ اس کو ان کی سوانح نگاری کی ایک خامی بھی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن جب ہم کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو مولانا کی دلکش انشاء پردازی اور انوکھے طرز تحریر کی کشش ہمیں آگے آگے بڑھنے کی دعوت دیتی ہے۔ اور پوری کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو مسرت ہوتی ہے۔ کہ جو کچھ وہ چاہتا تھا وہ سب اس کے سامنے آگیا۔ حکیم الامت کا انداز ایک داستان کا سا نظر آتا ہے۔"

ایک بار جب مولانا عبدالماجد جب اپنے مرشد مولانا تھانوی سے ملنے تھانہ بھون گئے تو اس وقت کے حالات سفر لکھتے ہوئے انھوں نے تھانہ بھون پہنچنے پر اپنی دلی مسرت کا اظہار دلکش انداز میں کیا ہے۔ اور اس کے بعد مولانا تھانوی کے معمولات کو اس طرح بیان کیا ہے۔ کہ مختصر الفاظ میں ان کی زندگی کا بہت

سی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں وہ لکھتے ہیں ۔

"معمول یہ تھا کہ طالبین و سالکین کا تانتا ہر زمانے میں بندھا رہتا تھا ۔ یہ لوگ آتے اور اپنے کھانے پینے کا انتظام خود کرتے۔ خانقاہ میں ٹھہر جاتے ۔ ان میں اچھے اچھے ذاکر شاغل اور مشائخ ہوتے اور ان میں سے بعض بعض تو اپنے زہد و ریاضت کی بنا پر خود قابل زیارت ہوتے لیکن یہ لوگ ملنے ملانے کی ڈھب سے زیادہ واقف نہ ہوتے ۔ دن تو دن رات کو بھی اگلے اور پچھلے حصوں میں اپنے کام میں لگے رہتے ۔ کام سے مراد محض نوافل و اوراد ہی نہیں بلکہ ہاتھ پر کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنے میں بھی ان حضرات کو تامل نہ ہوتا ۔ سادگی ۔ اخلاص ۔ بے طمعی ۔ بے نفسی کے بیسوں سبق ان لوگوں کی زندگیوں کو دیکھ کر سیکھے جا سکتے ہیں ،،

حکیم الامت اس انداز کی سوانح عمری جس کا کچھ اندازہ چند مذکورہ بالا اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے ۔ اردو میں سوانح نگاری پر یقیناً اپنے طرز کی پہلی کتاب ہے ۔ جس کو ایک صاحب طرز انشا پرداز اور ایک ماہر فن سوانح نگار نے اپنے مخصوص انداز میں مرتب کیا ہے ۔

محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق رئیس الاحرار مولانا محمد علی ہندوستان کے محبوب رہنما گزرے ہیں اور سیاسی رہنما گزرے ہیں ۔ اور بقول مولانا عبدالماجد ۔۔۔ وہ مسلمانان ہند کے سب سے بڑے سردار تھے ۔ یہ کتاب مولانا عبدالماجد نے اپنی ذاتی یادداشتوں کی مدد سے مرتب کی ہے اسی لئے انھوں نے اس کا نام " ذاتی ڈائری کے چند ورق ،، رکھا ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم ہندوستانی رہنما کی زندگی کا حقیقی مرقع ہے ۔ اور اس کے اندر وہ بحیثیت انسان ایک عظیم سیاسی رہنما اور بے مثل قائد کی حیثیت سے نمایاں نظر آتے ہیں ۔ اس طرح اس کتاب کو سوانح نگاری کا ایک انوکھا شاہکار کہا جا سکتا ہے ۔ کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبدالماجد نے کتنی محنت اور کاوش سے یہ کام انجام دیا ہے ۔

مولانا عبدالماجد کو جس طرح اپنے مرشد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے گہری عقیدت تھی اسی طرح ان کو مولانا محمد علی سے بے پناہ محبت تھی ۔

جس کا اظہار انھوں نے خود ان الفاظ میں کیا ہے۔

"عقیدت دینی۔ مذہبی۔ روحانی رنگ کی جس زور و قوت۔ جوش و ولولے سے حضرت حکیم الامت صاحب کے ساتھ ہوئی کسی دوسری زندہ ہستی کے ساتھ نہ تھی۔ لیکن عقیدت سے ذرا ہٹ کر ایک شے محبت بھی ہے۔ یہ محبت اس جوش و قوت کے ساتھ محمد علی سے تھی۔ گویا ایک مقتدا تھے۔ تو دوسرے محبوب"

مولانا عبد الماجد کو پہلی بار ۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی سے ملاقات کا موقع ملا۔ اس کے کچھ دنوں بعد خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوا۔ تعلقات بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۱ء تک یعنی (محمد علی کا سال وفات) یہ تعلقات قائم رہے۔ عبد الماجد صاحب کو ان کی رفاقت میں کام کرنے کا موقع ملا۔ ان کی زندگی میں انھوں نے بہت قریب سے مولانا محمد علی کی زندگی کا مطالعہ کیا اس لیے ان کے حالات اور کارناموں کو پیش کرنے والا ان سے بہتر کوئی دوسرا شاید نہیں ہے۔ یہ کتاب اصلاحی معنوں میں ایک باضابطہ سوانح عمری نہیں کہی جا سکتی کیونکہ اس کی ترتیب سوانح نگاری کے مروجہ اصولوں پر نہیں کی گئی بلکہ ایک سن وار ڈائری کی صورت میں مرتب کی گئی۔ لیکن مولانا عبد الماجد نے اس کی ترتیب میں سوانح نگاری کے بعض اہم اصولوں کو برتا ہے۔ اور یہ کتاب ان بنیادی مقاصد کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے۔ جو سوانح نگار کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ حالانکہ خود مولانا عبد الماجد نے اس کے سوانح عمری ہونے کی تردید کی ہے۔ وہ کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"آئندہ صفحات میں میں نے اپنے تاثرات و مشاہدات کو یکجا قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی مستقل سیرت یا سوانح عمری ایک بالکل الگ چیز ہے۔ کوئی صاحب اس ذاتی ڈائری کو اس کا بدل یا قائم مقام نہ خیال فرمائیں"

مولانا عبد الماجد کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ مولانا محمد علی کے خیالات اور کارناموں کو سوانح عمری کے اصولوں پر نہیں لکھا گیا ہے۔ اسی لیے اس کو ایک مکمل سوانح عمری نہیں کہا جا سکتا۔ اور کسی حد تک درست بھی ہے نہ اس میں ان کا نام و نسب ہے اور نہ خاندانی حالات۔ نہ ابتدائی تعلیم و تربیت اور نہ دوسرے

ضروری حالات و واقعات۔ لیکن اس میں مولانا محمد علی کی شخصیت انہی تمام خصوصیات کے جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اور حقیقت میں سوانح عمری کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ صاحب سوانح کی زندگی کے اصل خدو خال سامنے آئیں۔ اور مولانا عبدالماجد کی کتاب اس مقصد کو پورا کرتی ہے۔

کامیاب سوانح نگار وہی ہوتا ہے جس کو اپنے ہیرو کے ساتھ دلچسپی بھی ہو اور ہمدردی بھی ہو۔ وہ اس کی نفسیات کو بخوبی سمجھتا ہو۔ یہ بات اس وقت ممکن ہوتی ہے جب لکھنے والے کو ہیرو کی قربت اور رفاقت میسر حاصل بھی ہو اور اس کے حرکات و سکنات کا اس نے بنظر غائر مطالعہ کیا ہو۔ اس کے خلوت و جلوت کے مشاغل اس کی نگاہ کے سامنے رہے ہوں۔ مولانا عبدالماجد کو برسوں مولانا محمد علی کی رفاقت حاصل رہی۔ ان کے رفیق کار بھی رہے اس لئے بلاشبہ ان سے بہتر مولانا محمد علی کی زندگی پر روشنی ڈالنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ پھر ان کے مخصوص و منفرد انداز تحریر نے حالات و واقعات کے بیان میں جان ڈال دی اور حد درجہ دلچسپ ہونے کے ساتھ عبرت ناک اور سبق آموز بھی۔

مولانا عبدالماجد کی پہلی ملاقات مولانا محمد علی سے ۱۹۱۲ء میں ہوئی ملاقات تو سرسری تھی لیکن اس کو جس انداز سے مولانا عبدالماجد نے بیان کیا ہے وہ انہی کا حصّہ ہے۔ اور اس سے ان کی فن سوانح نگاری میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے مولانا محمد علی لکھنؤ آئے تھے راجہ محمود آباد کی کوٹھی میں۔ اس کے وسیع ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ عبدالماجد صاحب نے ان کی جو قلمی تصویر کھینچی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔

" علی محمد خاں وسیع ڈرائنگ روم کے صدر میں تشریف فرما۔ سامنے ایک بڑی طلبی میز۔ دور دور کرسیوں کی قطار۔ میز کی ایک سمت میں ایک جوان رعنا سوٹ میں ملبوس بیٹھا ہوا۔ ڈاڑھی تازی منڈھی ہوئی۔ مونچھیں ذرا گھنی اور نوکیلی۔ ذہانت بشرہ سے جھلکتی ہوئی شوخی و ذکاوت چہرہ سے برستی ہوئی

مہروں میں ایک سے ایک قابل فاضل اس سے بڑے اور مخدوم بھی۔ لیکن نظریں بار بار اسی کی طرف اٹھ رہی ہیں۔ اور کان اس کی آواز پر لگے ہوئے ہیں۔ وہ بولا تو سب سننے لگے۔ وہ اٹھا تو کوئی ہنسا اور کوئی بگڑا۔ مگر متوجہ سبھی ہو گئے"۔

یہ تھا کامریڈ کا شہرہ آفاق ایڈیٹر محمد علی۔ رام پور کا باشندہ اور علی گڈھ آکسفورڈ کا گریجویٹ۔ جس کی جادو نگاری اور انگریزی انشا پردازی کا سکہ اس وقت بھی لوگوں کے دلوں پر بیٹھ چکا تھا۔ حالانکہ کامریڈ کو نکلے ہوئے ابھی ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا۔ اور اردو روزنامہ "ہمدرد" کا ابھی وجود بھی نہ تھا"۔

ایک اور موقع پر مولانا محمد علی کی وضع قطع لباس اور بعض عادات پر اختصار کے ساتھ اس طرح روشنی ڈالی ہے۔ کہ جس سے ان کے ذاتی حالات کے بہت سے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اور ان کی سوانح عمری کے کئی پہلو نظر آتے ہیں۔

" جوانی میں بڑے خوش رو۔ وجیہہ تندرست و توانا کلہ ٹھلہ کے تھے۔ اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی سے تو بہرحال کم لیکن پھر بھی اچھے خاصے تنومند چہرہ ہشاش بشاش بشرہ سے ذہانت ٹپکتی ہوئی۔ آنکھیں بڑی چمکدار۔ بڑے خوش وضع بڑے خوش لباس۔ پوشاک زیادہ تر انگریزی سوٹ لیکن کبھی کبھی ٹھیٹھ ہندوستانی اور مشرقی بھی۔ ڈاڑھی منڈھی ہوئی۔ مونچھیں کسی قدر چڑھی ہوئی۔ جنگ بلقان ۱۹۱۲ء اور پھر انجمن خدام کعبہ ۱۹۱۳ء کے زمانے سے وضع ولباس سب میں تبدیلی شروع ہوئی۔ عین اس وقت ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۵ء ہوگا مونچھیں کتری گئیں۔ ڈاڑھی رکھائی گئی اور پھر بڑھائی گئی۔ لباس رفتہ رفتہ سادہ اور خالص مسلمانوں کا سا ہوگیا۔ جاڑوں میں سیاہ رنگ کی بالدار اور گرمیوں میں سفید کھدر کی اونچی کشتی نما ٹوپی جس کا نام محمد علی کیپ مشہور ہوگیا۔ گاندھی کیپ کی دگنی۔ کھدر کا سادہ جیب دار کرتہ اور پاجامہ اور اوپر سے ڈھیلی ڈھالی رنگین عبا۔ یہی وہ سادہ لباس تھا جس پر پنڈت مدن موہن لال مالوی نے دانستہ

وناداستہ پھبتی "بیگم صاحبہ پھوہاں کے لباس" کہی تھی) بلا کے جامہ زیب تھے۔ جو کپڑا کبھی پہن لیا بس وہی پھب گیا۔ آخر میں عینک کی بھی مستقل حاجت ہو گئی تھی۔ بال بہت جلد سفید ہونے لگے۔ سر کے بال بڑے اور پٹوں کی شکل میں تھے۔ ذیابطیس اور فکروں سے گھل گھل کر دبلے ہو جانے کے باوجود بھی چہرے کی وہ پھبن آخری دم تک قائم۔ تقویٰ اور عبادت الٰہی سے چہرہ پر جو خاص قسم کی نورانیت پائی جاتی وہ اس کے علاوہ بلند آواز جس محفل میں ہوتے سب پر چھا جاتے۔ حد درجہ بذلہ سنج۔ حاضر جوابی میں اپنا جواب آپ۔ ہنسنے ہنسانے میں برق۔ ساتھ ہی رونے رلانے میں بھی فرد۔ ہنسی اور آنسو دونوں معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھ باندھے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔ محبت کی آنکھ اندھی ہی کیوں نہ کہی جائے بہرحال اپنا حال تو یہ تھا کہ صورت بھی محبوبیت میں سیرت سے کچھ کم نہ تھی۔

ترک من ایں مہ غلام روئے تو جملہ ترکان جہاں ہندوے تو

مولانا عبدالماجد کی یہ کتاب مکمل اور مسلسل سوانح عمری نہیں ہے جیسا کہ تحریر کیا جا چکا ہے لیکن انھوں نے اپنی یادداشتوں کو اس خوبی کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ اس کتاب کے اندر ہمیں مولانا محمد علی کی ساری زندگی کا پورا عکس نظر آتا ہے۔ کتاب میں بیشتر حالات اور واقعات سیاسی اور نیم مذہبی نوعیت کے ہیں۔ جن کا تعلق محمد علی مرحوم کی زندگی سے ہے۔ اس میں ہندوستان کی سیاست۔ ہندوستانی لیڈروں کے پوست کندہ حالات بھی ضمناً آ گئے ہیں اور اس میں جا بجا سوانح نگاروں کے دلکش مرقعے بھی نظر آتے ہیں۔ عبدالماجد نے عام حالات کے ساتھ اپنے ہیرو کی زندگی کے بیشتر نجی و ذاتی حالات کو بھی بڑی خوبی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ ایک اور اقتباس پیش نظر ہے۔

"قیدی جب جیل سے چھوٹتے ہیں تو سیدھے اپنے گھر کی راہ لیتے ہیں اور غریب سے غریب کوئی نہ کوئی اپنی جھونپڑی رکھتا ہی ہے۔ محمد علی غریب کا گھر اب کہاں تھا۔ رامپور وطن تھا۔ وہاں ان کی پختہ حویلیاں تھیں

وہاں ان کا بچپن گزرا تھا۔ لڑکپن گزرا تھا جوانی کا ایک حصّہ گزرا تھا گھر کے یہ صحن یہ دوڑے تھے کھیلے کودے تھے گھر کے مکتب میں یہ پڑھنے بیٹھے تھے۔ وہیں شادی بیاہ ہوا تھا۔ دعوتیں۔ ضیافتیں۔ جیسے سب انھیں کمروں میں ہوئے تھے۔ رامپور کے جیسے چپے سے گلی گلی سے محمد علی کا دل اٹکا ہوا تھا اب وہاں قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ اسلامی ریاست کے فرمانروا ہزہائی نس نواب حامد علی خاں بہادر والی رامپور کا فرماں قضا توام یہی تھا محمد علی ہی کے درد انگیز لفظوں میں

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے ہم نہ تھے ان کے آستانے کے

گھر والوں پر کچھ بھی گزر جائے۔ بیویاں بچیاں۔ ماں بہن کوئی بھی بستر مرض پر کیا معنی بستر مرگ پر بھی ہو مجال نہ تھی کہ محمد علی اور شوکت علی رامپور اسٹیشن سے آگے شہر کی طرف قدم اٹھا سکیں۔ بے چاروں کو جس طرح بن پڑا لادپھاند کر شہر سے اسٹیشن کے ویٹنگ روم تک لے آئے۔ اللہ کے گھر کی خدمت کا عزم و حوصلہ رکھنے والے کو سزا اس دنیا میں یہ خوب ملی کہ خود اس کو بے گھر و بے در کر دیا گیا۔

بیمار مدقوق لڑکی جب اسی نومبر ہی کے مہینے میں پہاڑ سے حالت یاس میں لائی گئی تو یہی سوال اپنی مہیب صورت کے ساتھ منہ کھولے۔ آنکھیں پھاڑے کھڑا تھا کہ اس دکھیارے قافلے کو لے کر آخر کہاں جایا جائے۔ ناظرین آگے پڑھنے سے قبل ذرا اس صورت حال کا تصور وضاحت کے ساتھ اپنے ذہن کے سامنے لے آئیں، سر خدا نخواستہ اگر اس طرح کا کوئی واقعہ ہم کو پیش آجائے تو کیا گزر کرے۔ اللہ کی شان کہ سات کروڑ مسلمانوں کا مقبول ترین اور محبوب ترین لیڈر اور خود ملک ہندوستان کا بھی نامور لیڈر، اور کانگریس کا صدر اس کے اوپر وطن کی سرزمین یوں تنگ۔ خبر جوں توں علی گڑھ پہنچے۔ جامعہ ملیہ ابھی تک علی گڑھ ہی میں تھی۔ دہلی منتقل نہیں ہوئی تھی۔ اس کے احاطہ میں ایک بنگلہ لے کر رہنے لگے ان خانہ بدوشی میں یہی ان کا وطن تھا۔ معاش کا سہارا بھی کہیں سے نہ تھا۔ نور نظر کی مہلک

حالات سب پر مستزاد۔ بے چارے کو قومی اور ملی مصروفیتوں سے مہلت اتنی بھی نہ ملتی کہ تیمارداری جی بھر کر کر سکیں۔ کہا کرتے تھے کہ قومی و ملی مصائب نے میرے ذاتی مصائب کو اس طرح نگل لیا ہے جس طرح موسیٰ کا عصا، ساحروں کے سانپوں کو نگل گیا تھا۔

اچھے سوانح نگاروں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہیرو کے اخلاق، وعادات اور اس کی گھریلو زندگی کے صحیح حالات سے پوری طرح واقف ہو تاکہ ان کی روشنی میں اس کی شخصیت کا جائزہ لے سکیں۔ وہ اس کی سیرت کے اچھے برے پہلو سامنے آ سکیں جس کے بغیر کسی شخصیت کو صحیح طور پر سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔

مولانا محمد علی (ذاتی ڈائری) کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبدالماجد پورے طور سے محمد علی کی نجی زندگی سے بھی واقف تھے۔ اور انھوں نے کتاب میں موقعہ بموقعہ ہر قسم کے حالات کو ضمناً پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ذاتی ڈائری حالات کے سلسلہ میں ایک موقع پر کتنی معلومات نہایت دلآویز پیرایہ میں پیش کی ہے ...

"بیگم محمد علی رہیں ہمیشہ برقع میں اور پورے شرم و لحاظ کے ساتھ چہرہ نقاب سے چھپا ہوا۔ لیکن رہیں ہر جلسہ میں۔ ہر سفر میں۔ ہر مجموعہ میں۔ خلافت کانفرنس میں۔ برابر ساتھ ساتھ۔ جلسوں کی کارروائیوں میں بھی تھوڑا بہت حصہ لیا کرتیں۔ عورتوں کے مجمع میں بھی کبھی کبھی تقریریں کر دیتیں۔ اور ایک دوبار مردوں کے جلسہ میں بھی یوں ہی۔ انتقال غالباً ۱۹۴۲ء میں فرمایا۔ تجدد کی رو میں بہی بیوی، روشن خیال بیویاں کاش بی اماں مرحومہ (مولانا محمد علی کی والدہ) اور ان کی اہلیہ امجدی بیگم صاحبہ کی مثالوں سے سبق لیتیں کہ قومی کاموں کے لئے بے حیائی کیا معنی۔ بے پردگی بھی ہرگز ضروری نہیں۔ آئین حجاب کی پابندیوں کے ساتھ بھی سارے قومی کام بے تکلف انجام پاتے رہے۔ محمد علی کی مہمان داری بھی قابل دید تھی۔ میں جب کبھی مہمان ہوتا خاطر داری کو حد اسراف تک پہنچا دیتے۔ خاطر ضرورت سے زیادہ بھی کرتے۔ میری حیثیت

سے بھی زائد اور ان کی جیب کی گنجائش سے بھی زائد حق گوئی وحق نگاری ہیں تو یوں بھی محمد علی اپنی نظیر آپ تھے ہی مہمان نواز اور سیر چشم بھی اس درجہ کے کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ کھانا اکیلے میں کھانا جانتے ہی نہ تھے۔ پھر کھانا بھی نان جویں اور نمک طعام نہیں۔ دسترخوان اچھا خاصا چھوٹے موٹے رئیس کا معلوم ہوتا تھا۔ اچھے سے اچھا سالن۔ قورمہ۔ قیمہ۔ کباب کی متعدد پلیٹیں۔ طرح طرح کے لذیذ اور پرتکلف نمکین اور میٹھے کھانے۔ کبھی مرغ۔ کبھی مچھلی۔ خشک میوے۔ تازے پھل۔ خود کھاتے اور دوسروں کو زبردستی کرکے کھلاتے،،

اس کتاب کی نوعیت بھی لگ بھگ حکیم الامت سے ملتی جلتی ہے۔ اور دونوں کو جدید فن سوانح نگاری کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ مولانا عبدالماجد جہاں اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز تھے وہ فن سوانح نگاری کی ٹکنک اور اس کے حسن و قبح سے پوری طرح واقف تھے۔ انھوں نے اردو سوانح نگاری کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔

اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں مولانا عبدالماجد نے اردو کے باکمال شاعر اکبرالہ آبادی پر متفرق مضامین لکھے ہیں۔ یہ ان کا مجموعہ ہے۔ اکبر کو ظرافت اور طنز پر شاعری میں جو شہرت حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نہ ہو سکی۔ وہ اپنے رنگ میں یکتا تھے۔ اور ان کے بعد کوئی ان کی تقلید نہ کر سکا۔

اکبرنامہ سوانح نہیں ہے۔ مگر اس میں جا بجا ایسے سوانحی خاکے موجود ہیں جن کی مدد سے اکبر کی زندگی اور ان کے فن سے خاص واقفیت حاصل ہو جاتی ہے اکبر کا تعارف مولانا عبدالماجد ان الفاظ میں کراتے ہیں۔

لسان العصر حضرت اکبر مغفور زمانۂ حال کے ان چند بزرگوں میں سے تھے۔ جن کی نظیر مدتوں میں جاکر پیدا ہوتی ہے۔ ان کی ذات ایک طرف شوخی اور زندہ دلی دوسری طرف حکمت اور روحانیت کا ایک حیرت انگیز مجموعہ تھی۔ یا یوں کہئے کہ معجون تھی۔ آخر میں نہ ان کی شاعری شاعری رہی تھی نہ ان کا فلسفہ فلسفہ۔

ان کا سب کچھ بلکہ خود ان کا وجود حکمت و معرفت کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔ ان کی گفتگو کو جامع تھی۔ ادب، اور حکمت و ظرافت کی۔ روز مرہ کے معمولی فقروں میں وہ نکتے بیان کر جاتے کہ دوسروں کو غور و فکر کے بعد بھی نہ سوجھتے۔ اور باتوں کے چٹکلوں میں ان مسائل کی گرہ کشائی کر جاتے جو سالہا سال کے مطالعہ سے بھی حل نہ ہو پاتے،

ایک اور مقام جہاں اکبر کی شاعری پر تنقید و تبصرہ کیا ہے وہاں ضمناً محض

بخی حالات کا مرقع اس طرح پیش کرتے ہیں۔

" آخر زمانے میں حالت ٹھیک اس کے برعکس ہوگئی تھی۔ پہلے چہیتی بیوی نے داغ مفارقت دیا۔ پھر نوجوان محبوب بیٹا ہاشم رخصت ہوا۔ جج صاحب کی پنشن ہو چکی تھی۔ آنکھیں خراب ہوئیں۔ عام صحت نے جواب دیا۔ بڑے صاحبزادے پردیس میں ملازم۔ مکان سنسان۔ باہر باغ ویران۔ سامان آرائش غائب۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہو کا عالم ایک حضرت اکبر خود یا ادھیڑ مرد ملازم ایک بوڑھی ماما بس کل اتنی آبادی "، اس طرح ان متفرق مضامین میں جابجا اکبر کی سیرت کے بہت سے پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ تاہم یہ ان کی سوانح عمری نہیں۔ لیکن مولانا عبدالماجد کے انداز سوانح نگاری کو سمجھنے کے لئے مدد ضرور ملتی ہے۔

قرآنی سیرت نبوی : پیغمبر اسلام حضرت محمد صلعم کی سوانح عمری قرآن کی آیات کی مدد سے مولانا عبدالماجد نے بڑی محنت سے مرتب کی ہے اور اردو میں سوانح نگاری کے فن کو ایک نئے طرز سے واقف کیا ہے۔ قرآن کی مدد سے سیرت نبوی کی ترتیب قرون وسطی کے عرب عالموں کی ایجاد ہے۔ اور اس سلسلہ میں فضیل ابن عیاض کی کتاب "الشفاء" بہت مشہور ہے۔ جس میں آنحضرت کی سیرت کو بڑی تفصیل کے ساتھ قرآن کی مدد سے پیش کیا ہے اس لئے مولانا عبدالماجد کے سامنے اس طرز کے کافی نمونے عربی زبان میں موجود تھے۔ اور اردو میں بعض کتابوں کے ترجمے بھی ہو چکے تھے۔ تاہم مولانا اس طرز کو اردو میں اپنے مخصوص انداز و اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اس لئے ان کی یہ کوشش اردو میں

فن سوانح نگاری کو ترقی دینے کی طرف ایک کامیاب قدم ہے۔
سیرت نبوی قرآنی میں مولانا نے جو حالات و واقعات پیش کئے ہیں ان کا انداز بے حد دلکش اور متاثر کرنے والا ہے۔ اور ان کے طرز سوانح نگاری کا ایک نہایت حسین مرقع کہا جا سکتا ہے۔ اور عام سوانح نگاری کی رہنمائی کے لئے ایک نمونہ ہے لیکن اس پر بھی مکمل سوانح نگاری کا اطلاق نہیں ہوتا۔
مولانا عبد الماجد بحیثیت سوانح نگار کس حد تک فنی نقطۂ نظر سے کامیاب رہے ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ تحریر بالا سے ہو جاتا ہے۔ تاہم ان کے فن اور معیار کو کامیاب عالمی سوانح نگاری کے اصولوں کی روشنی میں بھی جانچنا اور پرکھنا ضروری ہے۔ مولانا عبد الماجد نے محمد علی اور مولانا اشرف علی تھانوی کے حالات کو جس انداز سے پیش کیا ہے۔ اس پر ایک اعتراض یہ وارد ہو سکتا ہے۔ کہ انھوں نے ان دونوں کی ولادت سے وفات تک کے حالات۔ جائے پیدائش۔ خاندان وغیرہ کا کہیں باقاعدہ ذکر نہیں کیا جو عام طور پر سوانح نگاری کے لازمی اجزا ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ اعتراض درست نہیں کہا جا سکتا۔ جدید نقطۂ نظر سے یہ ضروری نہیں کہ اس انداز کی سوانح لکھی جائے۔ جس طریقے پر آزاد نے "آب حیات" شعراء کے حالات لکھے ہیں۔ اور پھر حالی نے "یادگار غالب"، اور "حیات جاوید" لکھنے میں اختیار کیا ہے۔ اس دور میں ایسی سوانح نگاری زیادہ کامیاب نہیں جس کی بنیاد صرف خاندانی اور رخی حالات پر ہو۔ اس سلسلے میں قاضی عبد الغفار کی یہ رائے قابل ذکر ہے۔
" میں خود ایسی سوانح نگاری کا قائل نہیں جس کا احساس زندگی کے صرف ایسے واقعات ہوں کہ کب پیدا ہوئے۔ اور کس کے بیٹے تھے۔ کہاں تعلیم پائی" --- در حقیقت سوانح نگاری کی کامیابی کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ وہ نفسیاتی وجود کا سراغ لگانے کی کوشش کرے جب ہم اس نقطۂ نظر سے حکیم الامت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبد الماجد

کا نقطۂ نظر بھی یہی رہا اور وہ بڑی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے
یہ بات جا بجا مترشح ہوتی ہے کہ مولانا کا جوش محبت و عقیدت اپنے مرشد کے
ساتھ کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہونے
لگتا ہے کہ وہ اپنے ہیرو کو عام و خاص انسانوں کی سطح سے بہت اونچا اٹھانے کی
کوشش میں لگے ہیں۔ مگر جب ہم دوسرے مقامات پر دیکھتے ہیں کہ وہ مولانا
اشرف علی تھانوی کو ایک عام سادہ زندگی بسر کرنے والا بزرگ سمجھتے ہیں اور
ان کی طرف سے دل میں شکوک و شبہات کو بھی جگہ دیتے ہیں تو اس وقت ان
کا جوش و جذبہ محبت غیر معمولی نظر آتا ہے۔ حکیم الامت میں مولانا موصوف نے
مولانا تھانوی کے گھریلو حالات اور ذاتی حالات پر بھی حسب موقع روشنی ڈالی ہے
ان کو سوانح نگاری کا سلیقہ تھا۔ انھوں نے مولانا تھانوی کو صرف ایک مصلح قوم
مذہبی رہنما اور مجدد ملت کی حیثیت سے نہیں دیکھا ہے بلکہ ان کے انسانی مشاغل
اور فضائل پر بھی نظر رکھی ہے۔ اور ان کو اس بات کا احساس ہے کہ کسی شخصیت
کی تعمیر میں اس کے گھریلو ماحول، عادات و نجی مشاغل کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔
حکیم الامت میں مولانا عبد الماجد نے اس دور کے اسلامی، تاریخی
اور سیاسی پس منظر کو بیشتر نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ اس پس منظر کا تفصیلی
جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ جس میں کسی ہیرو کی شخصیت اور کردار کی تشکیل و
تعمیر عمل میں آئی ہو۔ یہ سیرت کا اہم پہلو ہے لیکن متفرق طور پر بعض مقامات
پر اس عہد کے پس منظر کی جھلک کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے لیکن اس میں جو ربط
ہونا چاہیے وہ نہیں ہے۔ بخلاف اس کے مولانا محمد علی کے حالات میں ایسا نہیں
ہے بلکہ ان کی سیرت اور کردار کی تعمیر و تشکیل کے مراحل اور ان کا پس منظر دونوں
موجود ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ یکجا اور مربوط نہیں ہیں۔
سوانح نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اپنے ہیرو کے ساتھ
اس کو طبعی مناسبت بھی کسی حد تک ہو تاکہ سوانح میں فنکارانہ محاسن اجاگر ہو سکیں۔

مولانا عبدالماجد کو طبعاً اور عقائد کے اعتبار سے مولانا تھانوی سے خاص مناسبت رہی ہے اس لئے اس پہلو سے وہ کامیاب گزرے ہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا عبدالماجد کے لئے حکیم الامت لکھتے وقت ایک مشکل یہ بھی کہ وہ اپنے مرشد کی سوانح عمری لکھ رہے تھے جس سے ان کو بے پناہ محبت وعقیدت تھی۔ اس لئے انھوں نے اپنے موضوع کو اس زاویہ سے دیکھا جس سے ان کو کام لینا تھا۔

سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ ٹھوس اور جانے بوجھے حقائق کو سلیقہ سے اس انداز سے پیش کرے کہ ہیرو کی زندگی میں دلکشی اور انوکھا پن پیدا ہو جائے اس اصول پر جو سوانح عمری لکھی جائے گی وہ کامیاب اور مفید ہوگی۔ مولانا عبدالماجد نے سوانح نگاری کے اس اصول کو نظرانداز نہیں ہونے دیا۔ ان کے ہیرو کی شخصیت نے ایک خاص نقطۂ نظر سے یوں بھی دلکشی اور انوکھا پن پایا جاتا تھا۔ مگر عبدالماجد کی طرز تحریر اور مواد پیش کرنے کے سلیقے نے اس اصول کو کم وبیش سامنے رکھا۔ اور توقع سے زیادہ دلکشی اور ندرت پیدا کردی۔

مولانا عبدالماجد کا تعلق سوانح نگاری کے شبلی اسکول سے ہے لیکن انھوں نے سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی وغیرہ کا طرز نہیں اختیار کیا۔ شبلی اور ان کے تلامذہ میں مؤرخانہ انداز بھی پایا جاتا ہے۔ کیونکہ شبلی نعمانی ایک بلند پایہ مؤرخ بھی تھے اور سوانح نگار بھی۔ مولانا عبدالماجد کی راہ بالکل الگ ہوگئی۔ انھوں نے مؤرخانہ انداز بالکل اختیار نہیں کیا ان کا طرز ایسا ہے کہ جس سے ایک مؤرخ اور سوانح نگار کا فرق خودبخود واضح ہوجاتا ہے۔ ایک سوانح نگار اور مؤرخ میں جو فرق ہوتا ہے اس کو بعض لوگوں نے اس طرح بیان کیا کہ دونوں کا فرق پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر اور آپریشن کرنے والے سرجن کا سا ہے۔ اول الذکر بے دردی اور بے رحمی سے کاٹ چھانٹ کرتا ہے اور موخر الذکر احتیاط اور نرمی سے نازک رگوں کو چھیڑتا ہے۔ اور پورے

جذبۂ ہمدردی سے کام لیتا ہے۔

مولانا عبدالماجد نے مؤرخانہ انداز اختیار نہیں کیا نہ وہ مؤرخ تھے۔ وہ سیرت نگار تھے۔ اور جدید سیرت نگاری کے بیشتر اصولوں کو اپنانے کے علاوہ ان کا اپنا ایک الگ رنگ ڈھنگ تھا۔ جس کا اندازہ پڑھنے والے کو خود بخود ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی جو لوگ مولانا کے طرز تحریر سے واقف ہیں اور ان کی کتابوں اور متفرق تحریروں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ ان کو اگر بغیر نام بتائے مولانا کی کوئی تحریر دے دی جائے تو عموماً پہچان لیں گے۔ اس سے بڑھ کر انفرادیت کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

خطوط کی مدد سے سوانح نگاری سوانح نگاری کے سلسلے میں خطوط کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ خطوط ادبی و علمی شخصیت کے انکشاف کا بہترین ذریعہ ہے۔ خطوط کے ذریعہ سوانح نگاری میں مدد لینے کا سلسلہ یورپ والوں نے شروع کیا۔ ۱۷۷۴ء میں ڈالٹن نے سوانح نگاری کے سلسلے میں خطوط سے مدد لی۔ اس نے واضح کیا کہ بے تکلف دوستوں کے نجی خطوط سوانح نگاری میں بہت مدد دیتے ہیں۔ انگریزی میں اس اصول پر لکھی گئی کتابیں "لائف آف جانسن" بہت اہم ہے یہ کتاب ۱۷۹۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا مصنف "باسول" ہے۔ یہ سوانح عمری بہت مقبول ہوئی اور یورپین سوانح نگاروں نے اس کو نمونہ بنایا۔ بعد میں کارلائل نے اس پر نکتہ چینی کی اور کچھ نئے رجحانات کا اضافہ بھی کیا جس کا تعلق علم نفسی سے تھا۔ اس اضافہ نے اس فن کو اور پختہ کر دیا۔ اور یورپ میں اٹھارہویں صدی کے اندر سوانح نگاری میں خطوط اور آپ بیتی کی اہمیت مسلّم اور مستحکم ہو گئی۔

ہمارے یہاں اردو میں مرزا غالب کے خطوط کو سوانح نگاری

میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے خطوط سے اس حقیقت کی بھی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ کہ سوانح نگاری میں خطوط کی کیا اہمیت ہے۔ مرزا غالب کی سوانح حیات جو آج ہمارے سامنے ہے۔ ان کے خطوط ہی کی مدد سے مرتب ہوتی ہے۔ غالب کے فکر و فن اور رجحانات طبع کے متعلق ساری معلومات ان کے مکاتیب ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ غالب کے بعد خطوط نویسی نے ایک نیا رُخ پایا۔ اور ان کے طرز سے اردو میں خطوط نویسی کے فن کو بلند کر دیا۔ سوانح نگاری میں خطوط کی اہمیت و افادیت بڑھنے لگی اور اسی سے کام بھی لیا جانے لگا۔

اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد نے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط کام کیا۔ انھوں نے خطوط کو اردو میں سوانح نگاری کا اہم جزء بنا دیا۔ "حکیم الامت" اور "محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق" دونوں کتابوں میں سوانح نگاری کے جو کرشمے نظر آتے ہیں وہ سب مکاتیب کی بدولت ہیں۔ مولانا عبدالماجد نے مولانا اشرف علی تھانوی کو جو خطوط لکھے اور ان کے جوابات جو ان کو موصول ہوئے ان کو "حکیم الامت" میں بڑے سلیقہ سے شامل کر دیا۔ بلکہ اس کتاب کا بڑا حصہ دونوں کے خطوط پر مشتمل ہے۔ اور خطوط کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اس میں صاحب سوانح کے حالات معمولات زندگی مقاصد حیات۔ نجی واقعات و حالات پورے طور پر روشنی میں آجاتے ہیں۔ یہ مولانا کا بڑا کمال ہے حالانکہ اردو میں سوانح نگاری کے سلسلے میں یہ عام طور پر رواج نہیں ہوا ہے۔ کچھ غیر مربوط کوششیں ضرور ہوئی ہیں۔ اردو سوانح نگاری مغرب سے متاثر ہوئی اگرچہ دیگر اصناف کی طرح اس نے ابھی زیادہ ترقی نہیں کی ہے۔ لیکن مولانا عبدالماجد نے روش عام سے ہٹ کر جدید و قدیم اصولوں کا ایک ایسا سنگم بنایا جو بعض جزوی نقائص سے قطع نظر قابل تحسین و تقلید ہے۔

مولانا محمد علی کے حالات اپنی یادداشت کی مدد سے مولانا

عبدالماجد نے مرتب کئے ہیں۔ اس لئے اس کا نام بھی ذاتی ڈائری رکھا ہے۔ لیکن اس میں بھی سوانح نگاری کے کمالات خطوط کے سہارے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایسے خطوط جو مؤلف کتاب اور محمد علی نے جو ایک دوسرے کو لکھے یا ان سے متعلق اس عہد کے بعض اکابرین نے مؤلف کے نام لکھے ان کی مدد سے محمد علی کے حالات۔ کارنامے اور اس عہد کا علمی۔ ادبی۔ خصوصاً سیاسی پس منظر نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور اس کو سوانح نگاری کا کمال کہا جا سکتا ہے۔ مولانا عبدالماجد کی ان دو کتابوں کو سیرت نگاری کا اچھا نمونہ قرار دینا بجا طور پر درست ہوگا۔ لیکن یہ بھی امر حقیقت ہے کہ دونوں کتابوں میں مولانا موصوف نے اپنی دو اہم شخصیتوں سے صرف اپنی ذاتی وابستگی زیادہ دکھائی۔ اور سارے مضامین جس محور پر گھومتے ہیں اس میں مولانا عبدالماجد نمایاں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے دونوں ہیروؤں کے سہارے اپنی شخصیت کو بھی ابھارنے کی کامیاب کوشش کی۔ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں سے وابستگی خصوصی تھی۔ اس لئے ایسا ہوا لیکن یہ کس طرح سمجھا جا سکتا کہ مولانا اشرف علی تھانوی؟؟ اور مولانا محمد علی جوہر کو جس نظر سے مولانا عبدالماجد دیکھتے تھے اور جس طرح وہ دونوں کو سمجھتے تھے بعینہ اسی طرح دوسرے بھی سمجھتے ہوں گے۔ جب تک دوسروں کے مکاتیب اور روایات سے مدد نہ لی گئی ہو۔ سوانح نگاری کا پورا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک عام خامی ہے جسے نظرانداز نہیں کیا سکتا۔

ان دو اہم کتابوں کے علاوہ مولانا عبدالماجد نے سیرت نبوی قرآنی" لکھی ہے۔ جو ان کی وسعت علم اور اعلیٰ انشاء پردازی کا ثبوت ہے۔ لیکن اس کو فن سوانح نگاری کے اصولوں میں عرض نقد و نظر بنانا مناسب نہیں۔ اکبر الہ آبادی کے حالات میں مولانا کے متفرق مضامین اور ان میں اچھے سوانحی خاکے موجود ہیں۔ ان میں وہ خصوصیات بھی ملتی ہیں جن میں مولانا کا انفرادی رنگ بخوبی جھلکتا ہے۔

مولانا عبدالماجد بحیثیت مفسر قرآن

مولانا عبدالماجد نے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں اور دنیا کے غیر مسلم لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لئے قرآن شریف کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور تفسیر بھی لکھی یہ ان کا عظیم کارنامہ ہے۔ مولانا عبدالماجد نے اصلاحی تحریک میں سارا زور قلم قرآن حکیم کی تعلیمات کو پھیلانے اور ان کی دلنشیں پیرایہ میں تشریح و تعبیر میں صرف کیا۔

اس کے بعد احادیث اور سیرت صحابہ کو نئے رنگ ڈھنگ سے اس طرح پیش کیا کہ تعلیم یافتہ دل و دماغ نے ان کے اثرات کو خوشگواری کے ساتھ قبول کیا۔ آیات قرآنی کے نکات سمجھانے اور احادیث نبوی کی حکمتوں کو واضح کرنے میں مولانا نے سارا زور قلم صَرف کر دیا ہے۔ اپنی عمر کی چالیس پینتالیس سال کا بہترین حصہ قرآن کے مطالعہ اور اس کے مطالب پر غور و فکر کرنے میں صرف کیا۔ یہی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ انھیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ وہ جانتے تھے کہ انگریزی اس وقت دنیا کی سب سے بڑی زبان ہے۔ اور اس کو بین الاقوامی حیثیت مکمل طور پر حاصل ہے۔ اس لئے انھوں نے از راہ مصلحت و سودمندی انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا اور تفسیر بھی لکھی۔ انگریزی میں قرآن مجید کے ترجمے پہلے ہی سے موجود تھے۔ لیکن جدید علوم کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ جو نئے نئے مسائل اور الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کے پیش نظر قرآن مجید کی تعلیمات کی تشریح عصر حاضر کی بڑی اہم ضرورت تھی۔ اس کو مولانا عبدالماجد نے پورا کیا۔ ان کی یہ خدمت تجدید اور اصلاح کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اردو زبان میں بھی قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو "تفسیر ماجدی" کے نام سے شائع ہو کر مقبول عام ہوئی۔ ویسے تو مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو میں نئے انداز سے تفسیر "ترجمان القرآن" لکھی یہ اپنے اعتبار سے بہترین تفسیر ہے۔

اس کے علاوہ خالص مذہبی مسائل کو سامنے رکھ کر جو تفسیریں لکھی گئی ہیں ان کی تعداد بہت ہے۔ لیکن ان میں مولانا اشرف علی تھانوی کا بیان القرآن اور مولانا امیر علی ملیح آبادی کی تفسیر "مواہب الرحمٰن" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ مولانا مودودی کی تفہیم القرآن ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان تمام تفاسیر کی موجودگی میں مولانا عبدالماجد جیسا ذہین صاحب علم و فراست، فلسفی و مفکر، قرآن کی تفسیر اس وقت لکھنے پر آمادہ ہوا ہوگا جب اس کی بھی ضرورت شدید طور پر محسوس کی ہوگی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ مولانا کی تفسیر مختلف اعتبار سے اپنے رنگ میں منفرد ہے۔

مولانا نے اسلامیات کے سلسلے میں جتنی بھی تحریریں لکھی ہیں۔ ان کے ایک ایک لفظ سے اسلامی شان نمایاں ہیں۔ اسلامیات و قرآنیات سے متعلق مولانا موصوف نے جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں ترجمہ و تفسیر کو بڑی خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے قرآن کریم کے ترجمے اور تفسیر کو ہندو پاک کے علمی طبقہ میں بڑی قدر و منزلت نصیب ہوئی ہے۔ اپنی یادگار تفسیر ماجدی کے پہلے حصے میں آپ نے ایک دیباچہ سپرد قلم کیا ہے اس میں قرآن کی تاریخی حیثیت پر جس خوبصورتی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے وہ یقیناً ان کی معاملہ فہمی اور دوراندیشی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ قرآن کے متعلق ان کے بیانات بڑے ہی واضح اور معلومات افزا ہیں۔ تفسیر ماجدی کے دیباچہ میں مولانا نے چار مختلف عناصر پر بطور خاص بحث کی ہے جو قرآن کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ اور جن پر قرآن کی صداقت کا راز مضمر ہے۔ یہ دیباچہ حسب ذیل ہے فرماتے ہیں۔۔

(۱) قرآن حکیم ایک نہایت درجہ مرتب اور منظم کتاب ہے۔

(۲) قرآن مجید ایک زندہ صحیفہ بھی ہے اور ماضی کی کتاب بھی۔ یعنی ایک طرف تو اس کے مخاطب عرب قوم تھی جو اس کے نزول کے وقت موجود تھی۔ بلکہ ساری قوم کیوں کہیئے زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہیئے کہ مکہ اور مضافات مکہ اور

مدینہ و حوالی مدینہ کے باشندے تھے۔ اور دوسری طرف اس کے مخالف روس جاپان۔ چین اور ہندوستان۔ آسٹریلیا۔ امریکہ کل روئے زمین کے باشندے قیامت تک کے لئے ہیں۔ اس کی یہ دونوں حیثیتیں نہ صرف موجود ہیں بلکہ برابر ساتھ چلتی ہیں۔ اور تربیت زمانی کے لحاظ سے پہلی حیثیت اہم و مقدم ہے۔ جنت کی نعمتوں۔ دوزخ کے عذابوں۔ آسمان کی ساخت۔ زمین کی حرکت و سکون ستاروں کی گردش وغیرہ سے متعلق کوئی ایسی بات اگر بیان کر دیتا جو اس کے مخاطبین اول یعنی چھٹی صدی عیسوی کے اہل حجاز مسلمات کے خلاف باتوں کی فہم سے بالاتر ہوتی تو وہ لوگ خواہ مخواہ ایک نئے الجھاؤ میں پڑ جاتے اور اس سے ان کے دماغ وحشت کھا کر قرآن کے بنیادی عقائد توحید۔ رسالت۔ حشر و نشر وغیرہ کی تکذیب پر آمادہ ہو جاتے۔ اس لئے قرآن نے نہایت حکیمانہ اسلوب یہ اختیار کیا کہ صراحتیں تو تمام تر مذاق عرب کے مطابق ہی تھیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اشارے بھی ایسے رکھے کہ بعد کی نسلیں اور ہر دور کے مخاطبین اپنی اپنی فہم و استعداد کے ماتحت اس سے روشنی حاصل کریں۔

(۳) قرآن حکیم اپنے نفس مضمون یعنی مطالب کے لحاظ سے ساری کائنات انسانی کو مخاطب کئے ہوئے ہے۔ سب کے ذہنوں اور عقلوں کو سامنے رکھے ہوئے ہے۔

(۴) قرآن مجید کی دنیا۔ حکمت و اخلاق۔ روحانیت و ربانیت کی گہری کی دنیا ہے۔ اس کی فضا تحقیق و طلب کی فضا ہے۔ اس کا ماحول تقویٰ و طہارت کا ماحول ہے۔ اور اس کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے تقویٰ کسی درجہ میں تو بہر حال لازمی ہے۔ طہارت قلب و طہارت جسم کا مطلق اہتمام کئے بغیر محض زبان دانی کے بھروسے پر قرآن سمجھ لینے کی کوشش ایک سعی لاحاصل ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں قرآن کے متعلق جن حقائق کی طرف اشارے

کئے گئے ہیں ان قرآنیات پو عائد کئے جانے والے بہت سے اعتراضات کے جوابات مل جاتے ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو مولانا عبدالماجد صاحب کا یہ کارنامہ مغرب زدہ طبقہ کے لئے آب حیات کا درجہ رکھتا ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ مغرب کے پیدا کردہ تمام تر فکری امراض جن سے ذہن انسانی مسموم اور مفلوج ہوتا ہے اس کا کلی وشافی علاج ہے۔ ان اوصاف کی روشنی میں عبدالماجد صاحب کی تفسیر قرآن دوسری تفاسیر کے مقابلہ میں فخر ومباہات کی چیز ہے۔ اور اس کے مساوی رتبہ کی تفسیر مشکل سے نظر آئے گی۔

مولانا عبدالماجد صاحب کے مذہبی۔ ادبی کارناموں کے آغاز وارتقا کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب فرماتے ہیں کہ

• اب وہ وقت آیا کہ مجھے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درس قرآن اور تفسیر کی خدمت سپرد ہوئی۔ مولانا نے اپنی انگریزی تفسیر کی تالیف کا سلسلہ شروع فرمادیا تھا۔ اور اس سلسلے میں ان کے مطالعہ کا اصل میدان اور تفسیروں میں ان کی تفسیر کا اصل امتیاز صحف سماوی اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ اور ان شخصیتوں مقامات اور تاریخی ادوار کی جدید جغرافیائی و تاریخی معلومات کی روشنی میں تحقیق اور قرآن مجید کے مشکل مقامات کا حل پیش کرنا تھا۔ ان کے بارے میں جدید علوم مستشرقین کے اعتراضات اور جدید مطبوعات نے مختلف سوالات کھڑے کر دئے ہیں۔ میں اپنے درس میں سورہ بقرہ میں ہاروت ماروت کے قصّے "وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا" کی آیت پر پہنچا تو مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ مولانا کی تحقیقات و مطالعہ سے استفادہ کروں۔ غالباً سبق روک کر میں پہلی مرتبہ دریاباد اس مقصد سے گیا۔ مولانا نے قرآن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے بڑی شفقت فرمائی"

مولانا عبدالماجد کی تصانیف پر ہم جب ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ تو معلوم ہوجاتا ہے کہ مولانا کی شگفتگی ایک طرف سے تو

مذہبیات سے تھی۔ اور دوسری طرف ادبیات سے ۔ مذہبی خدمات میں سب سے افضل آپ کا وہ ترجمہ وتفسیر قرآن پاک ہے جو تفسیر ماجدی کے نام سے شائع ہوا ۔ اس کے بعد دوسرے ایڈیشن کی دو جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں ۔ قرآن پاک کے ترجمے بہت سے حضرات نے کئے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ اسی وقت قابل قدر ہو سکتا ہے ۔ جب مترجم دونوں زبانوں کا ماہر اور ان کے صرفی ونحوی نکات پر اسے عبور حاصل ہو ۔ اردو ایک کم عمر زبان ہے ۔ ہر پچیس تیس ۲۵ سال بعد اس کے محاورات و روز مرّہ میں موجودہ روزافزوں علمی وادبی ترقیوں کے باعث نمایاں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ۔ مولانا موصوف اردو زبان (خصوصاً مستند لکھنوی دبستان کی) کے ماہر تھے ۔ اس کی نوک پلک سے بخوبی واقف تھے ۔ اس لئے بلا وصف اس کے کہ قرآن پاک کے کئی اچھے اچھے ترجمے ماضی قریب اور بعد میں ہو چکے ہیں ۔ لیکن تفسیر ماجدی زبان وبیان کے اعتبار سے فی زمانہ آخری ترقی یافتہ شکل کہی جا سکتی ہے ۔ آپ نے اس کائنات کی بہترین کتاب وجامع کتاب اور اس کی تعلیمات کو عوام تک پہنچانے اور ان کے دلوں میں اتارنے کہ اس کی افادیت واہمیت کا خیال اتارنے کے لئے تاحیات کوشش کی ۔ آپ کا ایک ایک لمحہ نشر واشاعت قرآن کے لئے وقف رہا اس سلسلہ میں اولین درجہ بلاشک وشبہ قرآن مجید کے انگریزی و اردو ترجموں کو حاصل ہے ۔ جن کے ساتھ تشریحی وتفسیری حواشی تحریر کئے گئے ہیں ۔ ذیل میں تفسیر ماجدی کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جس کے تشریحی وتوضیحی حواشی سے زبان وبیان کی خوبیاں واضح ہو جاتی ہیں ۔

ان تولوا وجوھکم قبل المشرق کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لیا **والمغرب ولکن البر من آمن** کرو ۔ بلکہ طاعت یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ **باللہ والیوم الآخر والملئکۃ** اور فرشتوں او کتاب اور پیغمبروں پر **والکتاب والنبیین ۝** ایمان لائے ۔

ظہور اسلام سے قبل دنیا کی بے شمار گمراہیوں میں سے ایک اہم گمراہی سمت پرستی تھی۔ یعنی بے جان دیویوں۔ دیوتاؤں۔ مورتیوں۔ پتھروں، درختوں پہاڑوں دریاؤں کے علاوہ خود سمتوں یا جہتوں کی بھی پرستش جاری ہوگئی تھی۔ اور مختلف جاہلی قوموں نے یہ اعتقاد جمالیا تھا کہ فلاں مخصوص سمت مثلاً مشرق، مقدس ہے۔ اور فلاں متعین جہت مثلاً مغرب قابل پرستش ہے۔ قرآن مجید یہاں شرک کی اسی صورت خاص کی تردید کر رہا ہے۔ اور ارشاد کر رہا ہے کہ کسی جہت میں کیا تقدس رکھا ہوا ہے اور کوئی سمت بہ حیثیت سمت ہرگز قابل تقدیس نہیں۔ طاعت (البر) سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں ہمارے حضرات مفسرین کو اس آیت میں جو اشکال نظر آیا وہ محض اس لئے کہ ان کی نظر مذاہب غیر کی اس گمراہی پر نہ تھی۔

اسلام نے ظاہر ہے کہ نماز کے لئے کوئی سمت بہ حیثیت سمت ہرگز متعین نہیں کی ہے۔ اس نے نہ صرف ایک متعین مکان یعنی خانہ کعبہ کو ایک مرکزی حیثیت دی ہے۔ اور اسے قبلہ توجہ ٹھہرایا ہے۔ خواہ وہ کسی سمت میں پڑ جائے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ کعبہ مصر و طرابلس و حبشہ سے مشرق میں پڑتا ہے۔ ہندوستان۔ افغانستان۔ اور چین سے مغرب میں پڑتا ہے شام و فلسطین و مدینہ سے جنوب میں۔ اور یمن اور بحر قلزم کے جنوبی ساحلوں سے شمال میں۔ اور بہت سے مقامات سے ان مختلف سمتوں کے مختلف گوشوں میں۔

المشرق سورج دیوتا دنیائے شرک کا معبود اعظم رہا ہے مشرک قوموں نے اس کی پرستش بڑی کثرت سے کی ہے اور یہ چونکہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے اس لئے عموماً جاہلی قوموں نے مشرق کو بھی مقدس سمجھ لیا اور عبادت کے لئے مشرقی رخ اختیار کرلی۔ حضرت مسیح کے چند ہی سال بعد جب مسیحیوں میں ایک شخص

پولوس نامی اٹھا جسے آج دنیا سینٹ پال کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اور اس نے مسیحیت کا رخ بجائے تجدید موسویت کے ایک مستقل تثلیثی شرک کی طرف پھیر دیا۔ رومی اس وقت حاکم قوم تھی۔ اور جیسے آج ہندوستان کے ہر شعبۂ زندگی میں "انگریزیت" اور مغربیت کا بول بالا ہے اس وقت بھی محکوموں کے دلوں پر رومی مشرکوں ہی کے علوم و فنون۔ تہذیب و معاشرت۔ دین و عقائد کا تسلط چھایا ہوا تھا۔ رومی مذہب کا ایک جزء آفتاب پرستی بھی تھا۔ پولوسی مسیحیوں نے جہاں اور بہت سے مشرکانہ مراسم رومیوں سے دھڑا دھڑ اخذ کر لئے وہیں اس مشرق پرستی کو بھی ان سے لے لیا۔ اور عبادت مشرق کی طرف رخ کر کے کرنے لگے۔ چنانچہ مسیحیوں کے گرجے آج تک شرق رویہ چلے آتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس مشرق رخی پر زبردست ضرب لگائی اور بتا دیا کہ یہ سمت وار تقدیس تو کسی درجہ میں بھی اطاعت و عبادت نہیں ــ بلکہ طاعتیں وہ ہیں جن کی تفصیل آگے آیت کر رہی ہے۔۔۔۔

المغرب مشرق پرستی سے تو بہرحال کم اور بہت کم۔ لیکن پھر بھی بہت کچھ عام اور وسیع وبا مغرب پرستی کی بھی شرک کی دنیا میں رہ چکی ہے۔ آفتاب کے طلوع و غروب پر قیاس کر کے مشرک ذہنیت نے یہ نتیجہ نکالا کہ مصدر حیات جس طرح سمت مشرق ہے اسی طرح مستقر موت و اجل سمت مغرب ہے اور یہ بھی مستحق تعظیم و تقدیس ہے۔۔۔ نیز ملاحظہ ہوں حواشی ۵۱؍۲ و ۵۲؍۲

المشرق والمغرب یہ دو نام صراحت کے ساتھ صرف مثال کے طور پر لئے گئے مقصود تمام سمتوں کی تعمیم ہے۔ انھیں دو سمتوں کی تحدید یا تخصیص نہیں۔ والمراد من ذکر المشرق والمغرب التعمیم لا التعیین السمتین۔ مشرکانہ ذہنیت کی تردید کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اصلی طاعت یہ ہے جس کا بیان اب ہو رہا ہے۔ آیت کی اس فرو میں عقائد کی تصحیح آ گئی۔

ولکن البر من کا تقدیر کلام یوں ہے ۔ ولکن البر من۔
طاعت تو اس کی ہے جو اللہ پر ایمان لایا۔ الخ
والتقدیر لکن البر من، (قرطبی) فحذف المضاف وھو کثیر فی الکلام
وھذہ القراءۃ الزجاج وقطرب (کبیر)
۴ من بادللہ اس میں دہریت والحاد کی جلی وخفی ہر صورت کی تردید آگئی۔
ایمان وطاعت میں داخلے کا یہی دروازہ ہے۔ کوئی ایسا نظام یا مسلک خواہ
اس کی بنیادیں نقلی ہوں یا اخلاقی یا معاشی یا سیاسی، جس میں اللہ کی
آیات وصفات پر ایمان کامل داخل نہ ہو۔ طاعت سے کوئی علاقہ ہی نہیں رکھتا
مادیت۔ عقلیت (ریشنلزم) (ایگناسٹی سزم) بالشویت
وغیرہ سب اسی کے تحت میں آجاتی ہیں۔ اور بدھ مذہب اور جین مت بھی، اگر
ان کی بابت یہ بیان صحیح ہے کہ ان میں توحید باری موجود نہیں۔
والیوم الآخر اس میں تردید ان تمام گمراہ قوموں کی آگئی جو وجود
باری کی تو قائل تھیں لیکن اس عقیدے سے خالی ہیں کہ ایک عالم آخرت
بھی ہے جہاں ایک روز روز جزا کا سامنا کرنا اور زندگی کے ایک ایک
معاملے کا حساب دینا ہے۔ اور تو اور یہود نے اپنی زبردست توحید کے باوجود
عالم آخرت سے اپنا تعلق نہایت درجہ ضعیف کر رکھا تھا۔ جزا وسزا اسی
اسی دنیا میں سمجھا خواہ قومی (اجتماعی عروج وزوال سے۔ خواہ بہ قاعدہ
نتائج مختلف قالبوں میں روح کے الٹ پھیر سے) یہ سب آخرت ہی کی
شکلیں ہیں۔
والملٰئکۃ فرشتوں پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ ان نورانی
اور مجرد مخلوقات کا وجود اللہ کے بندوں اور کارساز مطلق کے قاصدوں
خادموں اور کارندوں کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ نہ یہ کہ خود انھیں
کو مستقل قوتوں کی طرح فاعل۔ عامل۔ متصرف مان کر ان سے دعائیں مانگی جائیں

اور انھیں کو ایک چھوٹے پیمانہ پر حاجت روا قرار دے لیا جائے۔ اس ایمان بالملٹکۃ سے یونان۔ روما۔ ہندوستان۔ ایران کی ان تمام مشرک قوموں کی تردید ہوگئی جنھوں نے فرشتوں ہی کے تخیل کا مسخ کرکے کائنات کے مختلف شعبوں کے لئے دیویاں اور دیوتے تجویز کر لئے ہیں۔

والکتاب کتاب یہاں بطور اسم جنس آیا ہے۔ اور اس کا اطلاق صحیفۂ آسمانی کے نفس تخیل پر ہوگا۔

کتاب آسمانی کا عقیدہ بھی ایک تمام تر اسلامی عقیدہ ہے۔ مشرک قومیں تو خیر اس تخیل سے نا آشنا ہیں۔ کہ اللہ کے ہاں سے کوئی کتاب کسی بندے پر نازل ہوتی ہے۔ خود اہل کتاب تک اب اسلامی اصطلاح کے مطابق کسی "کتاب الہٰی" کے قائل نہیں۔ ان کے ہاں کتاب کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ خدا نے ہدایت کے لئے اشخاص کو چن لیا۔ اور ان کے قلوب میں کچھ مضامین بطور الہام القا کر دیئے۔ اور ایسا الہام ہر عارف کو ہو سکتا ہے۔ نبوت اس کی کوئی لازمی شرط نہیں۔ پھر بعد کو ان بزرگوں اور عارفوں نے انھیں مضامین و معانی کو اپنے لفظ و عبارت میں مرتب کرکے اپنے شاگردوں اور مریدوں کو سنا دیا۔ پھر ان سامعین نے انھیں اپنے طور پر لکھ لکھا لیا (بجز توریت کی ابتدائی پانچ سورتوں کے کہ وہ یہودی عقیدے کے مطابق خود حضرت موسیٰ کی نوشتہ ہیں) گویا ان الہامی کتابوں کی حیثیت کل وہ ہے جو ہمارے ہاں بزرگوں کے جمع کئے ہوئے ملفوظات ہوتے ہیں۔

کہاں یہ تخیل، اور کہاں مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف تک وحی شدہ جس میں غلط اور خلط کا امکان ہی نہیں!

اور مسیحی تو جب حضرت مسیح کی رسالت و نبوت ہی کے سرے سے قائل ہی نہیں بلکہ ان کی الوہیت کے مدعی ہیں۔ تو حضرت مسیح کا

صاحب کتاب رسول ہونا ان کے ہاں کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ کوئی آپ اپنے اوپر بھی بھلا کتاب نازل کیا ہوا ہے۔

والنبیین یعنی عقیدہ یہ ہو کہ اللہ انسانوں کو پیغمبر بنا کر بھیجتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ خود حق تعالیٰ جسم ہو کر اس دنیا میں آجاتا ہے۔ یا کسی قالب میں حلول کر آتا ہے۔ اسی عقیدہ میں صاف تردید ہو گئی اوتار پرستی کی۔ مجسم باری تعالیٰ کی۔ مظہر پرستی کی حلول کی۔ "اوتار" ٹھیک ضد ہے اور مقابل ہے۔ پیغمبر کے۔ اوتار کا یہ مفہوم ہے کہ خالق کائنات خود کوئی مادی پیکر اختیار کر کے دنیا میں آجاتا ہے۔ اور یہ بھی ضرور نہیں کہ وہ قالب انسان ہی کا ہو۔ شیوجی یا بشن جی جس طرح رام چندر جی بن کر، یا سری کرشن جی بن کر آسکتے ہیں۔ اسی طرح سانپ بن کر شیر بن کر یا مچھلی بن کر یا کچھوے کے قالب اختیار کر کے آسکتے ہیں۔ غرض یہ کہ اوتار معنی و حقیقت کے اعتبار سے خدا ہوتا ہے اور صورت اور ظاہر کے اعتبار سے انسان یا جانور۔ پیمبر اس کے برعکس صرف بشر ہوتا ہے۔ اور ہمیشہ بشر ہی۔ نہ کبھی فوق البشر نہ کبھی تحت البشر، اور بجز اس کے کہ صاحب وحی ہوتا ہے (اور اس لئے اخلاق کی پاکیزگی میں بے نظیر اور جرم و عصیان سے پاک) اور کسی حیثیت سے شکل و صورت میں چلتے پھرتے ہیں۔ بولتے چالتے ہیں۔ بھوک پیاس میں غموں و مسرت میں صفات البشری میں ممتاز نہیں ہوتا۔

آیت کے اتنے سے جز میں قرآن مجید نے اپنی معجزانہ بلاغت و ایجاز سے تمام اعتقادی گمراہیوں کی جڑ کاٹ دی۔ اور سارے مذاہب باطلہ کی تردید کردی۔ اعتقادی گمراہی جب کبھی بھی انسان کو گھیرے گی ہمیشہ ایمان باللہ ایمان بالآخرت ایمان بالملئکۃ ایمان بالکتب اور ایمان بالانبیاء ہی کی کسی نہ کسی غلطی یا غلط فہمی کی راہ

سے آئے گی۔ نمونہ تفسیر ۲

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ۔

جائز کر دیا گیا ہے تمہارے لئے روزوں کی رات میں اپنی بیویوں سے مشغول[۱] ہونا وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو اللہ کو خبر ہو گئی کہ تم اپنے کو خیانت میں مبتلا کرتے رہتے تھے پس اس نے تم کو رحمت سے توجہ فرمائی اور تم سے درگذر کر دیا سو اب تم ان سے ملو ملاؤ۔

لبلبۂ صدق ۲۵۔ سورہ بقرہ رکوع ۲۴

[۱] یہ اجازت شروع میں نہ تھی ابتداءً روزہ کی حالت میں رات میں بھی دن کی طرح بیویوں سے علیحدگی کا حکم تھا۔

شریعت اسلامی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات رسالت میں بتدریج نازل ہوئی کہیں تو ایسا ہوا کہ احکام شروع میں نرم تھے رفتہ رفتہ سخت کئے گئے مثلاً شراب نوشی کہ پہلے صرف ناپسند کی گئی اور پھر ہوتے ہوتے اس کی حرمت کا حکم آ گیا۔ اور کہیں اس کے برعکس ہوا ہے یعنی ابتداءً قانون سخت تھا رفتہ رفتہ اس میں سہولتیں اور رعایتیں زیادہ ہوتی گئیں۔ چنانچہ یہی روزہ کا معاملہ ہے کہ پہلے صحبت رات میں بھی حرام تھی بعد کو جائز کر دی گئی۔

رَفَثَ کے معنی لفظی شہوت انگیز کلام کے ہیں لیکن جب صیغۂ متعدی میں اسے لایا جاتا ہے تو اس سے مراد صحبت یا مباشرت ہوتی ہے چنانچہ یہاں الرَّفَثُ اِلیٰ نِسَائِکُمْ ہے۔

عدّاہ بالیٰ لانہ فی معنی الافضاء (لسان) جعل کنایۃ عن الجماع وعدّی بالیٰ لتضمنہ معنی الافضاء (راغب) ھکمنیٌ بہ عن الجماع (کشاف) والمراد بہ

ھنا المباشرۃ (ابن العربی)

یہیں سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ بیوی کی طرف میل و رغبت ذرا بھی کمال روحانیت و تزکیۂ نفس کے منافی نہیں۔ جیسا کہ بہت سے مشرکانہ اور جاہلی مذہبوں نے سمجھ لیا ہے اور ماہ صیام کی طاعت و عبادت اور بیوی سے خلوت و صحبت کے درمیان منافات ذرا بھی نہیں۔ جیسا کہ مذہب کے جوگیانہ اور راہبانہ تخیل نے دلوں میں بٹھا دیا ہے۔ شریعت اسلامی نے جس چیز پر سخت پہرہ بٹھا رکھا ہے۔ وہ شہوت حرام اور اس کے مبادی و مقدمات ہیں۔ نہ کہ نفس شہوت۔ بھوک، پیاس نیند کی طرح جنسی بھوک بھی اگر اپنے حدود کے اندر ہے تو ایک طبعی اور بے ضرر خواہش ہے۔ قصداً اور بلا ضرورت شرعی روزۂ رمضان توڑ دینا اس کی سزا شریعت نے دو مہینے یعنی ساٹھ دن کے مسلسل روزے اور شوہر و بیوی اگر اپنے مشترک عمل سے روزہ توڑ دیں تو دونوں کی یہی سزا ہے لیکن بیوی اگر رضامند نہ ہو اور شوہر ایسے دن میں ہمبستری پر مجبور کرے تو بیوی پر گناہ نہیں۔ اس کے لئے صرف ایک روزہ کی قضا کافی ہوگی۔ کفارہ کی بنیاد مقصد و تعمّد پر ہے۔

۱۶۹ (قرب و اتصال کے لحاظ سے یا ایک دوسرے کے پردہ دار اور موجب تسکین ہونے کے لحاظ سے) گویا اردو محاورے میں "دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے"، وہ ان کے حق میں اوڑھنا بچھونا ہیں اور یہ ان کے حق میں۔

یہ لباس کی تشبیہ کس اعتبار سے ہے؟ مختلف زبانوں سے اس کے مختلف جوابات ملتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ ایک دوسرے کے محتاج ہونے کی بنا پر۔ کسی نے کہا کہ اجسام کی ملابست اور ملامست کی بنا پر۔ وقس علی ھذا۔

لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسان کے حق میں ان کا وصف امتیازی اس کی پردہ پوشی ہے لباس جسم کے عیبوں کو چھپاتا ہے اس کے حسن و خوبی کو ابھارتا ہے۔ تشبیہ سے خاص اشارہ اسی وصف کی جانب معلوم ہوتا ہے گویا ہر اسلامی خاندان میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا پردہ پوش ہونا چاہیئے

اور ایک دوسرے کی زینت کو بڑھانے والا۔ جو انتہائی گہرا رشتہ اور تعلق میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے اس کی بنا پر ظاہر ہے کہ جتنا موقع ایک کو دوسرے کے جسمانی۔ اخلاقی روحانی عیبوں ۔۔۔ اور کمزوریوں پر مطلع ہونے کا ملتا ہے اتنا نہ کسی دوست کو مل سکتا ہے نہ کسی عزیز کو۔ اور نہ ایک کا کوئی راز دوسرے سے باقی رہ سکتا ہے۔ اس صورت حال میں عورت کے اخلاق کا کمال یہی ہے کہ شوہر کی ہر کمزوری کو چھپائے۔ اس پر صبر کرے۔ اسے بہتر سے بہتر صورت میں ظاہر کرے اور ...

ناخوش و تو خوش چو بر جان من

کا ثبوت قدم قدم پر پیش کرے۔ علیٰ ہذا مرد کے بھی کمال اخلاق کی یہی معراج ہے دونوں کی اخلاقی تکمیل کا یہ مؤثر ترین نسخہ اسلام نے باتوں باتوں میں بغیر کسی شدید اور پُرتعب مجاہدہ میں ڈالے ہوئے۔ روزمرہ کے لطیف و سہل مجاہدات کے ذریعہ بتادیا!

یہ اس مذہب کی تعلیم ہے جو "فرنگی تحقیق" کی نظر میں پست اس لئے ہے کہ اس میں عورت کی تحقیر کی گئی ہے۔

ع کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہوگیا

کون جھوٹ اس سے بڑھ کر سخت کون اتہام اس سے بڑھ کر صریح ہوگا۔

منوکرتی والے ہندو مذہب کا ذکر نہیں، عہد عتیق، جدید والے یہودی و نصرانی مذہبوں سے سوال ہے کہ ان کے سارے دفتر کتب و اسفار میں کون سی تعلیم زن و شوہر کے باہمی، محبت اعتماد کے باب میں اس درجہ کی ہے؟

مولانا عبدالماجد کے تفسیری کارناموں کی روشنی میں ان کی عارفانہ و واعظانہ نگاری، تبصرہ کی بصیرت افروزی اور حق آموزی کا صدق دل سے اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس مفسر قرآن نے اپنے مخصوص انداز بیان۔ اسلوب تحریر اور طرز ادا کے ذریعہ نکات قرآنی کو بڑی خوبی

کے ساتھ واضح فرمایا ہے۔

مولانا عبدالماجد کی آیات قرآنی کی تفسیر پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے اور حدیث نبوی کی تشریح یا حکایات و واقعات عالم کی تفصیل پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کا محبوب مقصود نگارش پند و نصیحت ہے یا تفہیم رموز شریعت۔

ان کی لکھی ہوئی کسی کی سوانح حیات پڑھیے یا تاریخ کے واقعات پڑھیے۔ یا کسی مشہور عالم دین شاعر کے شعر کی شرح پڑھیے یا کسی خبر کی سرخی پڑھیے یا کسی کے قول و فعل پر ان کی بے لاگ تنقید پڑھیے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ کا وقت ضائع نہیں ہوا۔ دل ان کی شگفتہ بیانی سے صرف بہلتا ہی نہیں، ان کے فلسفیانہ دلائل سے صرف تسکین ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ دولت گویا مل جاتی ہے جو صرف ہوش مند قاریوں کے حصہ میں آتی ہے۔

مولانا کی نگارشات کی خوبیوں کی تفصیل پیش کرنے کی یہاں گنجائش نہیں صرف بطور نمونہ از خروارے چند نمونے ان کی تفسیر قرآن اور اخبار صدق جدید سے نقل کئے جاتے ہیں۔

عام طور سے دور جدید کے سائنس داں منکرین خالق کون و مکاں ہیں کہتے ہیں کہ دیکھیے سائنس کے زور سے ہم لوگوں نے چاند پر قدم جما لیا۔ مریخ ستارہ بھی اب ہماری دسترس کے اندر ہے۔ کوہ و دریا کو تو ہم پہلے ہی مسخر کر چکے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر غور سے دیکھیے تو بڑے سے بڑا متاع۔ سائنس داں کا کمال بزبان مولانا "کمال بجز اس کے کیا ہے کہ اس نے نظام تکوینی کے ضابطوں اور قاعدوں کی مزاج شناسی میں کمال پیدا کر لیا ہے"۔

"سائنس دانوں کا کمال بڑے سے بڑے ماہرین سائنس میں یہ کس کے امکان میں ہے کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی فضائے کائنات سے باہر ایک گز ایک منٹ ایک انچ جگہ اپنے لئے تلاش کر سکے یہ کون ایسا ہے کہ اللہ نے زمان و مکان کی جو حدیں مقرر کر دی ہیں ان سے قدم باہر نکال سکے۔ کون ایسا ہے جو اس کے خلق کئے ہوئے قانون حرارت۔ برودت۔ رطوبت سے بے نیاز رہ سکے۔ کون ہے جو اس کے باندھے ہوئے قانون کشش اجسام سے بغاوت کر سکے۔ عدد۔ وزن۔ مقدار کے جو ضابطے خدا نے مقرر کر رکھے ہیں۔ کسی میں اتنی ہمت ہے کہ جنبش بھی ان سے عدول و انحراف کی پا سکے"۔

اغیار سے ربط و رشتہ کے ضوابط غیر مسلموں۔ کافروں، مشرکوں۔ ملحدوں اور منکرین خدا سے روابط و رشتہ کسی حد تک روا ہے۔ اس عہد اسلام فروشی اور خدا فراموشی میں جاننے اور سمجھنے کی سخت ضرورت ہے۔

مولانا عبدالماجد عارف کلام ربانی سورہ ہود کی آیت ۱۱۳ کے نوٹ نمبر ۱۵۰ میں تحریر فرماتے ہیں کہ . . .

علمائے محققین کی حسب تصریح بلا ضرورت کفار کی وضع اختیار کرنا باوجود قدرت ان پر نکیر نہ کرنا۔ ان کی تعظیم و توقیر کرنا۔ بلا ضرورت شرعی ان کے ساتھ مصاحبت و مجالست کرنا یہ سب مثالیں رکون الی الکفار کی ہیں"۔ یاد رکھیے کہ ارشاد خداوندی عام مسلمانوں کے لئے یہ ہے کہ وہ کافروں کی طرف مائل نہ ہوں۔ ان کے احوال و اعمال میں شرکت سے بچیں اور ان کی محبت و دوستی کو حدود ضروری و شرعی تک محدود رکھیں اور غیر مسلموں۔ منکروں اور غیر شرعی افعال و اعمال پر مصلحت وقت، مروت، صلح پسندی، آشتی و رواداری جیسے الفاظ کا پردہ ہفت رنگ نہ ڈالیں۔

سورۂ فاتحہ کی آخری آیت کی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ (جس طرح مجوبین و مقربین کے طور طریقوں کی اتباع ہے اسی طرح ممنوع و ناجائز منکروں اور نافرمانوں کی ہم مسلکی ہے) ۱۵۱

رواداری کا مفہوم رواداری کا وہ مفہوم جو سیاست دانوں اور جاہ طلبوں اور حکومت پرستوں نے خود سمجھا ہے اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں بالکل غلط ہی نہیں بلکہ سراسر خلاف مصلحت و دانش بھی ہے۔

سورۂ توبہ کی آیت ۲۳ کی شرح کے سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی عارف رموز قرآنی نے جو کچھ اپنے خاص انداز میں لکھا ہے۔ اسے بغور اور بار بار پڑھنے کی آج کل بہت زیادہ ضرورت ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

آج کل کے دور دجل و تلبیس میں لفظ رواداری جس معنی میں چلا ہوا ہے اسلام تو اس کا قائل نہیں۔ وہ دشمنان حق سے اس برتاؤ کا حکم دیتا ہے جس کے وہ مستحق ہوں۔

اور دشمنان حق سے اس سلوک کا جس کے وہ لائق ہیں ،،

اس سلسلے میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ ..

" انسان بعض جانوروں کو کھلاتا ہے پالتا ہے حفاظت پہنچاتا ہے اور بعض کو بلا تامل مار ڈالتا ہے۔ عقل کی تعلیم ہرگز یہ نہیں کہ جانور جانور سب برابر ہیں اور یکساں۔ رواداری سے سب کے ساتھ پیش آنا چاہیئے۔

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

طاعت و اطاعت بھی سبب راحت دنیوی ہے قرآن پاک کی مختلف آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ طاعت کو راحت دنیوی میں بھی دخل ہے، ورمشاہدہ بھی ہے کہ طاعت اور حسن عمل کا پھل اس دنیا میں برکتوں ۔ فائدوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ۔ گو اصل دار الجزاء عالم آخرت ہی ہے ..،

" جس طرح اطاعتِ خداوندی اور فرماں برداری سے دنیوی راحت ملتی ہے اسی طرح یا اس کے مقابل میں ارتکاب عصیاں اور اصرار گناہ کی سزا دنیا میں بھی ہو جاتی ہے۔ آخرت میں تو ہوئے گی ہی "

فرعون اور قوم فرعون کی غرقابی کے ذکر قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ ...

" عصیان و طغیان کی سزا دنیا میں مل جاتی ہے، آخرت میں طغونیت کا ظہور کامل ترین صورت میں ہوئے گا ۔ دنیا میں بھی قہر و غضب کے ساتھ غرق ہوتے ہوئے سب نے دیکھلیا ،،

گمراہی کی منزلیں سورۂ یونس کی آیت ۷ کا ترجمہ اور مولانا عبد الماجد کی ہوئی تفسیر سے گمراہی کی چار منزلیں نگاہ میں آجاتی ہیں اور مغربی تہذیب کی بھی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے ۔ مولانا فرماتے ہیں ۔

" یورپی تہذیب کا جز و اعظم یہی تو ہے کہ جنت و دوزخ کا خیال کبھی دل میں آنے ہی نہیں ۔ ذکر و فکر آخرت کی طرف بالکل بے اعتنائی تہذیب جدید کی روح ہے اور دنیوی ساز و سامان اور مادی علوم و فنون و صنائع کی طرف یکطرفہ انہماک و شدت

التفات تہذیب فرنگی کا جزوِ اعظم ہے۔ بھلا اعلیٰ سوسائٹی اور مہذب محفلوں میں حشر و نشر، سزا و جزائے اعمال، دوزخ و برزخ وغیرہ کا ذکر کوئی کرکے تو دیکھے کیسا لگو بنتا ہے"

سورۂ ھود کی آیت ۱۵ اور ۱۶ میں ایک بہت تلخ مگر گہری حقیقت کا اعلان ہے آیت کا ترجمہ ہے . . .

دنیا طلبوں کا اجر جو کوئی دنیا ہی کی زندگی اور اس کی رونق کو مدنظر رکھتا ہے تو ہم ان لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا اسی دنیا میں پوری طرح دیتے ہیں اور ان کے لئے اس میں ذرا کمی نہیں ہوتی۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں کچھ بھی نہیں بجز آگ کے۔ اور جو کچھ انھوں نے کیا کرایا ہے آخرت میں ناکارہ نکل جائے گا۔ اور بے اثر "

اس آیت کی تفسیر یوں کی گئی ہے • جو لوگ یا قومیں سراسر دنیاوی ترقیوں کو اپنا منتہائے نظر اور نصب العین بنائے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی ساری سرگرمیوں کا مرکز اسی کو قرار دئے ہوئے ہیں وہ گھبرائیں نہیں انھیں مایوسی نہیں ہوگی۔ انھیں اپنی ساری جد و جہد کا صلہ یہیں اور ابھی ملا جاتا ہے۔ وہ دولت چاہتے ہیں ان میں ایک ایک فرد قارون وقت ہوکر رہے گا۔ انھیں حکومت کی ہوس ہے دنیا کے سارے ملک انھیں کے درمیان تقسیم ہوکر رہیں گے۔ انھیں عزت۔ ناموری اور فتحمندی کی چاٹ ہے تو انجام دل کھول کر وہ اپنے دل کا ارمان نکال لیں"

حقیقت آشنا و حقیقت نگار مولانا عبد الماجد اس موقع پر لکھتے ہیں کہ

• حیات اور زینت حیات سے الفت تو ایک امر طبعی ہے اور انسان بڑے سے بڑا متقی انسان بھی کسی درجہ میں اس کا آرزومند ضرور رہتا ہے۔ البتہ حیات دنیوی کو آخرت کی طرف سے آنکھیں بند کرکے اپنا مقصود بنا لینا۔ اور اپنے وقت اور قوت کو اسی میں خرچ کئے جانا۔ یہ ایک بالکل دوسری چیز ہے

خوش حالوں کی بدحالی وہ لوگ جن کو عرف عام میں خوش حال کہتے ہیں اور جن کو عام طور سے لوگ خوش حال سمجھتے ہیں ان کے متعلق سورہ یونس کی آیت ۵۵ کے ٹکڑے جزء کی تفسیر لکھتے ہوئے حقیقت بین مولانا عبد الماجد تحریر فرماتے ہیں کہ . . .

متاعُ الحیٰوۃ الدنیا کہہ کر منکر و مکذب قوموں کی صحیح تصویر کھینچ دی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو... روس اور امریکہ اور بڑی بڑی مہذب اور ترقی یافتہ اقبال مند قوموں کا حال۔ اس کے آپس کے رشک و حسد کا حال۔ ان کی حرام کاری کا حال۔ ان کی شراب نوشیوں کا حال۔ ان کی سود خوریوں کا حال۔ ان کے جرائم کا حال۔ ان کے ہاں کے امراض خبیثہ کا حال۔ ان کے ہاں کی ہڑتالوں کا حال۔ ان کے ہاں کے کثرت طلاق اور کثرت فواحش کا حال۔ اور پھر فیصلہ کیجئے کہ متاع دنیا کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ رکھنے کے بعد بھی ان منکرین حق کو باوجود اپنی انتہائی ترقیوں کے فلاح کسی معنی میں بھی حاصل ہے؟ آج جو کج فہم ہمدردان قوم و ملت کو انہی ترقی یافتہ قوموں کی روش پر چلانا چاہتے ہیں وہ ملت کو فلاح کی جنت کی طرف لئے جا رہے ہیں یا دنیا ہی میں دوزخ کے عذاب کی طرف۔

قرآن مجید تو ہر جگہ اور بار بار یہی بتا رہا ہے اور ہمارے مشاہدے سے اس کی تصدیق کر رہا ہے کہ جو قومیں ایمان صحیح اور تقوی سے عاری ہیں وہ عیش ابدی سے تو خیر محروم ہی ہیں دنیا میں بھی ان کا تنعم محض ظاہری اور سطحی ہوتا ہے اندر سے بالکل کھوکھلا۔

لفظ فلاح کا مفہوم فلاح کا مفہوم ہے آخری حقیقی اور مستقل کامیابی۔ فوری فانی اور عارضی کامیابی تو بس ذرا دیر کے لئے گرمئ محفل ضرور پیدا کر دیتی ہے مگر آخر کار!!! یاد رکھیئے کہ معصیتوں کا صدور نقصان فلاح کا باعث ہوتا ہے۔

مال و دولت میں عدم مساوات فطری اور طبعی ہے آج کل ہر طرف ہر جگہ ایک تحریک چل رہی ہے کہ دولت کی تقسیم مساوی ہونی چاہیئے یہ نہ ہو کہ کوئی تخت طلائی پر آرام کرے اور کوئی زمین سخت پر لیٹ بھی نہ سکے۔ کوئی چوبیس گھنٹوں میں جب جی چاہے جی بھر کے لذیذ غذائیں کھا سکے۔ اور کسی کو محنت و مشقت کے باوجود سوکھی روٹی اور نمک بھی پیٹ بھر کر کھانے کو ہر وقت نہ مل سکے۔ بیشک ایسا نہ ہونا چاہیئے۔ اسی لئے تو قرآن کریم میں زکواۃ۔ صدقات۔ خیرات۔ حسن سلوک۔ یتیم پروری۔ مفلس نوازی۔ غربا پروری وغیرہ وغیرہ

کی تعلیم دی گئی ہے۔ تلقین کی گئی ہے۔ ترغیب دی گئی ہے۔ تدبیر بتائی گئی ہے۔
اور تقسیم دولت سے منافع دنیوی و اخروی کی تفصیل سمجھائی گئی ہے۔
اگر اسلامی اصول و احکام۔ زکوٰۃ و صدقات پر عمل کیا جائے تو جائز شکایات کا موقع کم سے کم نظر آئے گا۔ رہا یہ تصور کہ ہر شخص کے پاس مساوی دولت ہو خلاف فطرت ہے۔ خلاف حقیقت ہے۔ اور تجربہ شاہد ہے ناقابل عمل ہے۔
سورہ نحل کی آیت ۷۱ کا ترجمہ یوں ہے... "اور اللہ نے تم سے کسی کو کسی پر رزق میں فضیلت دے رکھی ہے سو جن لوگوں کو فضیلت دی گئی ہے وہ اپنے حصہ کا مال اپنے غلاموں کو کبھی اس طرح دینے والے بنیں کر وہ سب اس میں برابر ہو جائیں"
آیت مذکورہ سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مصلحت خداوندی یہی ہے کہ دنیا میں کوئی امیر ہو کوئی فقیر۔ کوئی دولت مند ہو کوئی غریب۔ مولانا عبدالماجد فرماتے ہیں کہ...
آیت مرقومہ صدر سے اس حقیقت پر روشنی پڑ گئی کہ مال و دولت میں عدم مساوات فطری و طبعی ہے اور تقسیم دولت میں مساوات کا دعویٰ بجائے خود بے بنیاد اور خلاف فطرت ہے۔ آیت مرقومہ بالا نے جڑ کاٹ دی ہے اہل باطل کے اس نظام معاشی کی جس کا پرانا نام مزدکیت تھا اور جدید نام سوشلزم یا انتہائی صورتوں میں کمیونزم ہے
تفسیر ماجدی صفحہ ۵۶۳
مولانا عبدالماجد کو بحیثیت مفسر قرآن ہمیشہ قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ انھوں نے قرآن کریم کے نکات بڑے دل پذیر انداز میں بیان کئے ہیں۔ اس تفسیر والے مشاغل اور اس کی تکمیل کے بارے میں وہ یوں رقمطراز ہیں کہ...
" دھن رفتہ رفتہ خدمت قرآن کی سمائی اور بخت و نصیب کی خوبی اس درجہ تک جیبیس سال کے لئے لے آئی۔ پچھلی تعلیموں پر نظر جاتی ہے تو کبھی تو ہنسی آتی ہے اور کبھی کبھی اپنے پر شدید نفس ملامت ابھر آتی ہے۔ اس دور میں کبھی اس کا تصور بھی نہیں آسکتا تھا کہ کبھی رازی۔ زمخشری۔ قرطبی اور آلوسی کی جوتیوں میں جگہ نصیب ہوگی۔ اب دعا لکھتے بیٹھتے ہوتے جاتے اگر ہے تو یہی کہ جتنی گھڑیاں بھی حیات ناپائیدار کی باقی ہیں۔

سب اسی خدمت میں گزریں اور وقت موعود جب آئے تو بندہ کو اس کی بندگی میں مصروف پائے۔

اشاریہ تفسیر ماجدی

تفسیر ماجدی کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی ممکنہ کوششیں کی گئیں لیکن اس کے چھپنے کے لالے ہی پڑے رہے۔ آخر میں بڑے انتظار کے بعد مجبوراً صدق ہی میں اسے قسط وار چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوئے ۲۸ سال کی مدت گزر گئی یہ اب بھی پاکستان میں دستیاب ہو سکتا ہے۔ مولوی نذر احمد صاحب (نگینوی ثم پاکستانی) مدیر صدق کے بڑے کرم فرما و مخلص تھے۔ آپ صاحب فہم اور نکتہ رس عالم بھی ہیں۔ انھوں نے اس پہلے ایڈیشن کا مفصل اشاریہ کتابی شکل میں مرتب کر کے چند سال ہوئے شائع فرمایا ہے۔ اشاریے عام طور سے مجمل ہوتے ہیں۔ مگر نذر صاحب نے جدت طبع سے کام لے کر ۲۸۴ صفحات کا ایک مفصل اشاریہ تیار کیا ہے۔

ایک سطر میں لفظ دے کر اس کے مقابل آیت۔ سورہ اور حاشیۂ تفسیر کا نمبر دیدیا گیا ہے۔

مثلاً یاجوج۔ سورہ کہف آیت ۹۴۔ حاشیۂ تفسیر ۱۲۳۔

اس اشاریہ کی مدد سے تفسیر ماجدی کے ذریعہ قرآنی نکات و تلمیحات کھینے میں کمالی آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

۱ مولانا عبدالماجد بحیثیت نثری نعت نگار

۲ 〃 〃 〃 〃 مرثیہ نگار

۳ 〃 〃 〃 〃 ادیب منفرد

مولانا بحیثیت نثری نعت نگار یا سیرتی مقالہ نگار

اُردو اور فارسی میں بڑے بڑے نعت گو شعرا گزر چکے ہیں اور ماشاء اللہ اس دور میں بھی موجود ہیں۔ لیکن شاعری کی بجائے نثر میں نعت نبوی کے موضوع پر کارادب کا نمونہ پیش کرنے والے گنتی کے چند ہی ملیں گے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس موضوع پر "الہلال" میں متعدد سحر انگیز مقالے مخصوص رنگ میں تحریر فرمائے تھے۔ اس کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے اس موضوع پر سنجیدہ علمی رنگ میں جو خطبات مدراس میں پڑھے وہ بعد میں خطبات مدراس کے نام سے شائع ہو کر ملک کے طول و عرض میں انتہائی مقبول ہوئے۔ ان ہی کے معاصر اور ہم صوبہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے باغ و بہار قلم سے "اَلنَّبِیُّ الخَاتِم" ایک اچھوتے البیلے انداز کی سیرت طیبہ نبوی پر شائع ہوئی تھی۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے جب فلسفہ و حکمت کے بجائے مذہب کی خدمت کے لئے اپنا زور قلم وقف فرمایا تو اس موضوع پر یعنی "سیرت نبوی" پر خصوصی توجہ فرمائی۔ ان کے ہفتہ وار "سچ" لکھنؤ (جس نے بعد میں "صدق" اور "صدق جدید" کے قالب اختیار کئے) میں اس سیرتی موضوع پر بہت سے مقالے اور شذرے نکلتے رہے جو ہر اعتبار سے اردو کی نثری نعت کے شہ پارے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ان مضامین اور شذرات کے علاوہ ایک مستقل کتاب بھی اس سیرت کے موضوع پر خطبات ماجدی یا سیرت نبوی قرآنی کے نام سے چھپ کر مدراس اور لکھنؤ دونوں مقامات سے شائع ہو چکی ہے یہ ان کے پانچ چھ خطبات کا مجموعہ ہے جو مدراس میں پڑھے گئے تھے۔ اردو میں اپنے موضوع پر یہ جامع ترین

مترادف کہی جاسکتی ہے۔ لیکن ان خطبات اور اس کے قبل کے زمانے کے سیرتی مقالات و مضامین میں ادب و انشاء کا بڑا فرق نظر آتا ہے۔ پچھلے مضامین میں ذوق و شوق کا غلبہ ملتا ہے۔ نئے نئے حسین و جمیل تشبیہات و استعارات نظر آتے ہیں ان کے پڑھنے اور سننے سے طبیعت میں وجد و حال کی کیفیت طاری ہو کر رہتی ہے۔ خطبات کی زبان اس کے برعکس انتہائی سادہ و سلیس ہے۔ ان نعتیہ مضامین کا مجموعہ ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد دکن کی طرف سے "مردوں کی مسیحائی" کے نام سے ۱۹۴۳ء میں آغاز میں شائع ہوا تھا اور اب نایاب ہے۔ اس میں جو مضامین شامل ہیں وہ مولانا کے کمالِ فن کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

یہ مجموعہ، اس سلسلہ کے ایک اہم مضمون "مردوں کی مسیحائی" (جس میں سورہ فرقان کے رکوع آخر "وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ" کی تشریح و تفسیر ایک البیلے انداز میں کی گئی ہے۔) جو بلاشبہ اس مجموعہ مضامین میں شامل کئے جانے کے قابل ہے کے عنوان سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ مضمون نہ صرف نعت رسول کے موضوع پر بے بہا اور لاجواب ہے بلکہ منقبت صحابہ کے سلسلہ میں بھی حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے اس کا ایک آخری ٹکڑا درج ہے۔

"صحابہ کرام کی زندگی نہ اس وقت راز تھی نہ آج راز ہے۔ ابولہب، ابوجہل اور ان کے سارے ہم نشینوں نے اس وقت دیکھا کہ بدبودار اور پر عفونت کھاد گلیوں میں پڑی اور ان کی آنکھوں کے سامنے شاداب و خوش رنگ گلاب کے مہکتے ہوئے پھول میں تبدیل ہوگئی۔ حق کے دفعتہً بر تردید اور تغلیط کے خطرے سے بے پرواہ۔ زندہ معبود کے زندہ معجزے کا جواب نہ اس وقت بن پڑا اور نہ آج۔ حق کے جھٹلانے والوں محمدؐ کے دشمنوں اور ابولہب اور ابوجہل کے موجودہ جانشینوں میں سے کس کے بس کی بات ہے"

اللہ مراتب بلند کرے اکبر الہ آبادی کا کہ سارے مضامین النعت کا عطر ایک شعر میں کھینچ دیا ہے۔

؎ خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے ❊ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

دوسرا مضمون "یتیم کا راج" "جو سورہ اَلَمْ نَشْرَحْ کی تفسیر پر مشتمل ہے۔
اس کے تمہیدی حصے سے مولانا کے زور بیان۔ جدّت ادا۔ اور شدّت تاثیر کا
اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"کچھ کم چودہ سو برس کا زمانہ گزرتا ہے کہ تمدن کی نمائش گاہوں سے
کوسوں دور، تہذیب کے سبزہ زاروں سے الگ۔ ایک ویران و بے رونق بستی
میں۔ چلچلاتی دھوپ والے آسمان کے نیچے۔ خشک پتھریلی زمین کے اوپر ایک شریف
لیکن ان پڑھ اور بے زر خاندان میں ایک بچہ کا سر آب و گل میں آنکھ کھولتا ہے۔
شفیق باپ کا سایہ پہلے ہی اٹھ چکا ہے۔ ماں بھی کچھ روز بعد سفر آخرت اختیار
کر لیتی ہیں۔ تربیت کے جو ظاہری قدرت کے ذریعہ ہیں وہ یوں گم ہو جاتے ہیں۔
بوڑھے دادا اپنی آغوش تربیت میں لے لیتے ہیں۔ لیکن بچے کا بچپن ابھی ختم نہیں
ہو پاتا کہ وہ بھی ہمیشہ کی نیند سو جاتے ہیں۔ گھر میں نقد ہے نہ جائداد۔ نہ حکومت ہے
نہ ریاست۔ خانہ ویرانی کا یہ عالم ہے کہ نہ ماں ہے نہ باپ۔ نہ دادا ہیں نہ دادی
نہ بھائی ہیں نہ بہن۔ تن تنہا۔ بے ساز و سامان بے یار و مددگار۔ ایک نو عمر اللہ
بندہ ہے جسے سہارا ہے تو اس نظروں سے اوجھل مولا کا۔ اور آسرا ہے تو اس نگاہوں کا
غائب مالک کا۔

ملک کی حالت یہ کہ شرک کی گھٹائیں ہر طرف چھائی ہوئی ساری قوم مخلوق پرستی
میں ڈوبی ہوئی۔ بدکاری فیشن میں داخل۔ انسانی ہمدردی کے مفہوم سے دماغ ناآسنا۔
ہر قسم کے فسق و فجور کی گرم بازاری۔ بات بات پر لڑنا۔ اور پشتہا پشت تک لڑتے رہنا۔
یتیموں کی حق تلفی۔ غریبوں کے ساتھ بے دردی۔ اخلاقی وبائیں اور روحانی بیماریاں
گھر گھر مسلط۔

تیسرا مضمون "یتیم کی جیت" سورہ "اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ" کی تشریح اور
تفسیر پر مشتمل ہے۔ اس میں ادیبانہ رنگ اور چوکھا ہو گیا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

" یہ خبیث طعنہ زن ہیں کہ تیری نسل ختم ہو رہی ہے۔ تیرا سلسلہ منقطع ہو رہا ہے۔

تیری نسل بھی کبھی ختم ہونے والی۔ اور تیرا سلسلہ کبھی قطع ہونے والا ہے۔ یہ بد باطن دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہیں گے۔ لیکن ان کے جانشین دیکھیں گے۔ زمین و آسمان دیکھیں گے۔ جن و بشر دیکھیں گے۔ آفتاب و ماہتاب دیکھیں گے کہ تیری نسل قائم اور تیرا سلسلہ دائم ہے۔ بادشاہتیں بنیں گی اور بگڑیں گی۔ حکومتیں قائم ہوں گی اور مٹیں گی۔ شہر بسیں گے اور اجڑیں گے۔ قوم ابھرے گی اور فنا ہوگی۔ لیکن تیرا نام پائندہ اور تیرا کام پائندہ۔ قیامت تک قائم اور قیامت کے بعد بھی قائم۔ دنیا میں تیرے نام کی وہ عزت ہوگی جو نہ آج تک کسی بندہ کی ہوئی نہ آئندہ ہوگی۔ اونچے اونچے میناروں سے تیرا نام ہمارے نام کے ساتھ پکارا جاتا رہے گا۔ دشت و جبل۔ صحرا و دریا بحر و بر۔ شہروں اور دیہاتوں۔ آبادیوں اور ویرانوں۔ سمندروں اور پہاڑوں، وادیوں اور گھاٹیوں میں سب کہیں تیرے نام کی منادی ہوگی۔ حجاز و عراق یمن و شام حبش و مصر ایران و توران۔ بخارا و ہندوستان۔ چین و جاپان۔ روس و افغانستان۔ جرمن و انگلستان۔ فرانس و امریکہ۔ دنیا کا گوشہ گوشہ اور ہماری وسیع زمین کا چپہ چپہ تیرے نام سے گونجے گا ذرہ ذرہ تیرے نام کی گواہی دے گا تیرا نام ان کانوں تک پہنچے گا جو سوا تیرے بدبلی کے نام سے نا آشنا ہوں گے۔ آج تو ان کور بصروں کی نگاہ میں حقیر ہے کل تو ہی بلند کیا جائے گا۔ کل تیری ہی عزت ہوگی اس وقت ہوگی جب سب کی عزتیں پامال اور سب کے شہرتیں خاک میں مل چکی ہوں گی جو اپنی شامت اعمال سے تجھے مانیں گے نہیں۔ وہ بھی کم از کم جان ضرور لیں گے۔"

اور اسی مضمون کے خاتمے کا ٹکڑا بھی پیش خدمت ہے

"ہر ملک اور ہر دور کی تاریخ دیکھ ڈالئے محمد ﷺ سے جس نے دشمنی کی اس کا کیا انجام ہوا۔ کس کی قسمت میں عزت و ناموری آئی۔ جس کی مدح و ثنا اللہ نے کی۔ جسے اللہ نے مدح کیا گیا کہہ کر پکارا۔ اس کی ہجو کو جو بھی اٹھا لڑکھڑا کر گر پڑا۔ جو اس سے ٹکرایا پاش پاش ہو گیا۔ جس نے اس سے گستاخی کی جرأت کی اسے پامال کر دیا گیا۔ جسے لاولدی کی بنا پر گمنامی و بے نشانی کا طعنہ دیا گیا تھا دنیا دیکھ رہی ہے اور ہزار ڈیڑھ ہزار سال سے دیکھتی چلی آ رہی ہے کہ سب سے زیادہ وسیع العیال اور کثیر الاولاد ہے۔

جس کی بے کسی دگمنامی پر ہنسی اڑائی گئی تھی وہی ناموروں کا سردار۔ شہرت والوں کا سرتاج ہے اس کے نام کو مردود سمجھ لیا گیا تھا اس کے نام پر درود بھیجے جا رہے ہیں۔ اسی کا توسل باعث نجات ہے۔ اسی کا نام اللہ کے نام کے ساتھ بلند و ممتاز ہے "

ع تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد "

چوتھا مضمون " دو راستے " کے عنوان سے ہے جس میں دو چھوٹی سورتیں سورۂ نصر اور سورۂ لہب کی تشریح ایک انوکھے پیرائے اور نرالے اسلوب سے کی گئی ہے۔ اس کی تمہید (متعلق سورۂ نصر کی تشریح سے ہے) کا ایک اقتباس یہ ہے

" مہینوں کی تپش و تابش۔ لو اور لپیٹ کے۔ تڑاکے اور چلاپے کی لو۔ جب برسات کی ہوائیں چلتی ہیں تو کالے کالے بادل امڈ امڈ کر آتے ہیں اور جل تھل بھر جاتے ہیں۔ سالہا سال کی سختیوں اور آزمائشوں کے بعد جب مشیت مطلقہ کا اس مشیت کو جس کے اوپر کوئی مشیت نہیں منظور ہوا کہ مُردوں میں جان پڑ جائے اور سوکھی ہوئی کھیتی لہلہانے لگے تو ہنستوں کے رخ پلٹ دیے اور دلوں کے اقلیم میں انقلاب پیدا کر دیا۔ جو گردنیں اکڑی تھیں وہ جھکیں جو زبانیں انکار پر اڑی ہوئی تھیں وہ اقرار کا کلمہ پڑھنے لگیں۔ جو قلوب اپنی سختی و قساوت سے پتھر کو شرماتے تھے۔ وہ پانی پانی ہو گئے۔ اور جو جہنم کے شعلوں کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ وہ جنت کی ٹکٹ کی خریداری کو لپک لپک کر بڑھے۔ مکہ کی سرزمین جو توحید کی منادی کرنے والوں پر تنگ ہو چکی تھی۔ اب اسی بے بس و بیکس یتیم کے جاہ و جلال فتح و اقبال کے سامنے اپنی ساری وسعتوں اور پہنائیوں کے ساتھ بچھی جاتی اور خانۂ کعبہ کا دروازہ اس ہجرت کو جانے والے پردیسی کے ہاتھوں نہیں آکر اس کے خادموں اور خدمت گاروں کے ہاتھوں کھل رہا۔ جس اللہ کا نام زبان پر لانا منع تھا اب اسی کی بڑائی کی پکار عرب کے گوشہ گوشہ میں گونجی۔ اور اس کے جس بندہ کو مکہ نے فقیر جانا اور طائف نے جس پر تمسخر کیا تھا۔ اس کی سچائی اور عظمت کی شہادت دینے کو اب مکہ اور طائف۔ نجد و حجاز۔ یمن و عمان۔ دشت و جبل یک پیر و جوان۔ زن و مرد غول کے غول جتھے کے جتھے جھپٹ جھپٹ کر آگے بڑھنے لگے۔ "

اس کے مضمون "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" کے عنوان سے ہے جس کا اختتامی پیراگراف حسب ذیل ہے۔

"حشر کے دن عند اللہ اس بندے کا جو مرتبہ ہوگا وہ تو ہوگا ہی۔ اس سے قطع نظر کر کے ذرا صرف اس مرتبہ کا تصور کیجئے جو محض اس بلندی کے ذکر کی خاطر سے اس روز حاصل ہوگا۔ فوج کی فوج انبوہ در انبوہ۔ ادھر سے ملوک و سلاطین چلے آرہے ہیں۔ ادھر بڑے بڑے نامور جنرل اور سپہ سالار۔ ایک طرف سے محدثین کرام جوق در جوق چلے آرہے ہیں۔ دوسری طرف سے مفسرین عظام۔ اہل فقہ۔ اہل اصول۔ اہل کلام۔ اہل تصوف۔ اہل لغت۔ اہل سیف۔ اہل رجال۔ اہل معنی۔ اہل بیان۔ اہل نحو۔ اہل منطق۔ اہل اخلاق جس فن کو بھی لیجئے اس کے ماہرین ادب سے آنکھیں نیچی کئے ہاتھ باندھے ہوئے۔ خادمانہ انداز سے گرد و پیش حلقہ کئے ہوئے ہیں۔ ایک اسی انعام کی پوری وسعت کا تصور کس کے بس کی بات ہے۔

اس مجموعہ کے ایک اور مضمون "محبوب سے خطاب" میں اسی انداز میں سورہ والضحیٰ کی تفسیر کی گئی ہے۔ اس کا ایک درمیانی ٹکڑا حسب ذیل ہے۔

"وَالضُّحٰی۔ دن نکل آیا۔ ہدایت و نورانیت کا آفتاب طلوع ہو چکا بشارت ہو کر آفتاب کی کرنیں پھوٹ چکیں۔ اس کا اجالا گھر گھر پھیل چکا۔ وہ رب رحیم جو عالم کے جسمانی نشو و نما و حیات مادی کے تکمیل کے لیے روزانہ آفتاب کو چمکاتا رہتا ہے۔ کیا انسان کی ربوبیت روحانی کے لیے آفتاب ہدایت کی روشنی نہ پھیلاتا۔ پس ہر روز آفتاب کے اجالے کا ظہور خود تیرے منبع نور و ہدایت ہونے پر۔ تیری صداقت پر اور تیری رسالت پر گواہ ہے۔ محض شعاعوں والا دن ہی نہیں بلکہ سکون والی رات۔ وہ رات جس کا کام (واللیل اذا سجیٰ) سکون دینا ہوتا ہے۔ وقت کا وہ تاریک حصہ جس میں ساری جاندار مخلوق سکون و آرام لیتی ہے۔ وہ بھی تیری ہی سچائی کی ایک نشان ہے۔ حکیم مطلق جو جانداروں کے آرام و سکون کا اہتمام کرنے کے لیے یہ وقت نکالتا ہے۔ وہ انسانوں کی ابدی راحت روحانی سکون کا سامان نہ کرے گا۔

قرآن کے اس مفسر نکتہ داں نے سیرت نبوی کے تعلق سے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اس ضمن میں ان کی تمام تحریریں نہایت درجہ بلیغ اور ایمان افروز ہیں۔ ان سدا بہار مچولوں کا ایک بصیرت افروز گلدستہ "مردوں کی مسیحائی" کے نام سے ہاتھوں ہاتھ پہنچایا گیا ہے۔
زندگی کا حقیقی جوہر حسن سیرت ہے۔ سیرت فطرت انسانی کے لوازم کا ایک اخلاقی نظام ہے جس کا اعلیٰ نمونہ "سیرت محمدی" میں ملتا ہے۔ اس لئے آنحضرت صلعم کا اسوۂ حسنہ انسانیت کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ قیمتی متاع قرار دیا گیا ہے۔ جس کی اطاعت اور اتباع کے بغیر صحیح انسانی تربیت ممکن نہیں۔

کی محمدؐ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

سیرت نگاری اور بحر "خلق عظیم" کی سیرت نگاری ایک اہم ذمہ داری ہے۔ توفیق الٰہی کی بدولت حضرت مولانا عبد الماجد دریا بادی اسی سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ ایک سچے سیرت نگار کی طرح آپ کا مطالعہ سیرت نبوی پر بڑا گہرا تھا۔ صاحب سیرت کے ظاہر و باطن کے مشاہدہ اور احساس میں آپ نے کمال حاصل کرلیا تھا۔ اسی لئے سیرت مبارک کے جن پہلوؤں پر آپ نے قلم اٹھایا ہے۔ ان سے آپ کی دقت نظر در فکر عمیق کے باعث تلاش و تحقیق کا کمال صاف ظاہر ہے۔
آپ نے سیرت نبوی کے اہم خد و خال بڑی خوش اسلوبی سے پیش کئے ہیں۔ مولانا محترم کے اکثر مضامین سیرت قرآن پاک کی بعض سورتوں کی تفسیر ہیں۔ قرآن اور سیرت نبوی کا ربط دین کی معرفت کا انتہائی مقام ہے۔ اور یہ مقام مولانا عبد الماجد کے حصہ میں آیا ہے۔
آپ نے اپنے مقالات سیرت میں بڑی خوبی سے اس ہمہ گیر انقلاب کی تشریح کی ہے۔ جو رسول اسلام کی نظر کیمیا اثر کی بدولت ظہور میں آیا۔ جس عظیم الشان انقلاب سے نفع پانے والوں کی کایا پلٹ گردی گئی۔ جس انقلاب کا یہ اثر ہوا کہ مشرک توحید الٰہی کے داعی بن گئے۔ جو بت پرستی کے دل دادہ تھے۔ وہ دنیا میں مذمت شراب کے علمبردار

بن گئے جو چور اور اچکے تھے ان کا احساس دیانت اتنا نازک ہو گیا کہ دشمنوں کے گھر کھانے میں بھی ان کو تامل تھا۔ جو لٹیرے تھے وہ اس درجہ متدین ہو گئے کہ ان کے معمولی سپاہی ہزاروں اور لاکھوں کا مال غنیمت کمال دیانت داری سے اپنے اپنے سپہ سالاروں کے یہاں پہنچا دیتے تھے۔ لوٹ کھسوٹ پر بسر کرنے والے سود کو حرام اور زکوٰۃ و صدقات کے نظام کو قائم کرنے والے بن گئے۔ زر پرست سرمایہ داری کو اس طرح مٹانے لگے کہ لوگ زکوٰۃ لے کر پھرتے تھے اور لینے والا نہ ملتا تھا۔ وہ جن کی نظر میں انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی وہ اپنی بیٹیوں تک کو زندہ دفن کرتے تھے۔ جان کا ایسا احترام کرنے لگے کہ کسی مرغ کا بھی بغیر حق قتل ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ ظلم جن کی افتاد طبیعت تھی اپنے جان و مال کے دشمنوں تک کے ساتھ عدل کا لحاظ کرتے تھے۔"

اس حیرت انگیز انقلاب کی تفسیر کی بدولت مولانا کی اس کتاب سیرت کا نام "مردوں کی مسیحائی" تجویز ہوا۔ جو اس کے اولین مقالہ کا عنوان بھی ہے درحقیقت یہ اسم بامسمّیٰ ہے۔

اس کتاب میں کچھ مقالات نکاح و طلاق کے بارے میں بھی ہیں۔

جو سیرت نبوی کے درحقیقت متعلقہ پہلوؤں اور اس ہمہ گیر انقلاب کے ان اقدار کو واضح کرتے ہیں جو بظاہر حیات ازدواج میں نمودار ہوئے۔ ایک مضمون مستشرقین کی ان دقیق تلبیسات اور خفی و جلی کید کو بے نقاب کرتا ہے۔ جو سیرت نگاری کے سلسلہ میں وہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ تصنیف سیرت کے مطالعہ میں ایک رہنما ہے۔ آپ نے نمایاں واقعات کے ساتھ سیرت پاک کے کئی ایسے اشاروں کو بھی الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ جن کی روح پرور کشش کا بھلانا ناممکن ہے۔ اس کے بغیر بے شمار خفیف اشارے اور جلوے ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتے۔ اس کی اہمیت اور دلکشی آپ کی بصیرت کی آدم شناسی اور مہارت نفسیات کا اظہار کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صاحب سیرت کے اصلی اور بنیادی اجزا ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہے ہیں۔

جن کے باعث دیگر اجزائے سیرت کا اصلی محل و مقام پہچاننے میں **حقیقی رہبری** حاصل ہو جاتی ہے۔ سیرت کے اس مرقع پر مولانا کو بے اختیار زبانی داد دینے لگتی ہے۔ معنوی محاسن کے علاوہ ادبی نقطۂ نظر سے یہ مقالات انشا اور حسن بیان کے بلند پایہ ہوتے ہیں۔ ان میں جگہ جگہ آداب نبوت کی **شایان شان تعبیر** کے انداز۔ مصنف کی تہذیب باطن۔ **لطافت ذوق۔ ادب شناسی** اور خوش بیانی کے کمالات کے آئینہ دار ہیں۔ سیرت نگاری کا یہ کمال اپنی **صداقت** سے پڑھنے والوں کے یقین و ایمان کو بڑھاتا ہے۔ اور مضبوط کرتا ہے۔

درحقیقت مولانا کا یہ نثری نعتیہ کارنامہ ان کے حسن عقیدت۔ **کمال تحقیق اور** حسن تعبیر کا بہترین ثبوت ہے۔ اور اس سے اردو کے سیرت و ادب کے ذخیرہ میں نہایت گراں قدر اضافہ کیا جائے تو ہر طرح بجا ہے۔ دراصل یہ **مجموعہ مقالات** مولانا کی سیرت نگاری کے انسانی ممکنات و کمالات کا **آئینہ دار ہے۔ وگر**

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ است

مولانا عبدالماجد بحیثیت نثری مرثیہ نگار

اُردو نظم میں مرثیہ گوئی کا رواج زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے دکن اور شمالی ہند کے کئی مرثیہ گو حضرات نے اس فن کو بلند کرنے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ابتدا میں یہ مرثیے مذہبی قسم کے ہوتے تھے جس میں شہادت حسینؓ اور واقعات کربلا کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا جاتا تھا۔ بعد میں مذہبی مرثیوں کے علاوہ اردو نظم میں شخصی مرثیے بھی لکھے گئے۔ مثلاً غالبؔ کا مرثیۂ عارف۔ اور حالیؔ کا مرثیۂ غالبؔ۔ یہ دونوں مرثیے فکر و فن کے اعتبار سے بہت بلند پایہ ہیں۔ شخصی مرثیوں کو بہت زیادہ ترقی چکبستؔ نے دی ہے۔ اور بڑے پُردرد مرثیے لکھے ہیں۔

اردو نظم میں مختلف انداز کے مرثیے تو موجود ہیں مگر اردو نثر اس صنف سے تقریباً عاری رہی ہے۔

مولانا عبدالماجد نے اس خلاء کو ہر طرح سے پر کر دیا ہے۔ "انشائے ماجد" حصہ دوم میں "چند مرثیے" کے عنوان سے ان کے پندرہ مرثیے شامل ہیں۔ جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔

(۱) عبدالرحمٰن کی موت (۲) محمد علی (۳) راجہ علی محمد خاں (۴) ہم نام نامور (۵) خوش النصیب گول کیپر (۶) شوکت علی (۷) طبیب کی موت (۸) ماں کے قدموں پر (۹) سر سکندر حیات (۱۰) نبی تولی (۱۱) قائد ملت (۱۲) ہمشیرہ کی رخصتی (۱۳) ایک قوال (۱۴) جشن نوشابہ (۱۵) یادِ غم۔

مولانا عبدالماجد کے مرثیے مختلف نوعیت کے حامل ہیں۔ چنانچہ چار مرثیے انھوں نے اپنے قریبی عزیزوں پر لکھے ہیں۔ "ماں کے قدموں پر" مرثیہ اپنی والدہ

کی وفات پر ۱۹۴۱ء میں لکھا تھا۔ اور "یادِ غم" مرثیہ میں اپنی والدہ کی یاد میں آنسو بہائے ہیں۔ یہ مضمون ۱۹۴۶ء میں لکھا تھا۔ "ہمشیر کی رخصتی" مرثیہ میں انھوں نے اپنی بڑی بہن کا واقعہ بیان کیا ہے جن کا انتقال ۱۹۴۵ء میں ہوا تھا۔ "نئی نویلی" مرثیہ اپنی قریبی رشتہ کی بھتیجی پر لکھا تھا جس کی شادی کے دس گیارہ مہینے کے بعد وفات ہو گئی تھی۔

مولانا نے آٹھ مرثیے قومی لیڈروں پر لکھے ہیں اس زمرہ میں مولانا محمد علی عبدالرحمٰن بلگرامی۔ راجہ علی محمد علی خاں۔ مولانا عبدالماجد بدایونی۔ تصدق احمد خاں شیروانی مولانا شوکت علی۔ سر سکندر حیات اور بہادر خاں حیدر آبادی شامل ہیں۔

دو مرثیے اپنے دوستوں پر تحریر فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک مرثیہ شفاء الملک حکیم عبدالحمید لکھنوی پر ہے اور دوسرا مرثیہ افضل حسین قوال پر ہے۔ جن سے ان کے چوبیس پچیس سال سے تعلقات سے تھے۔ ایک مرتبہ ایک پڑوسی کی لڑکی پر لکھا ہے جس کا عنوان "جشنِ نوشابہ" ہے جو عبدالرؤف عباسی مدیر "نور" کی دختر تھی۔ یہ سارے مرثیے غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور پڑھنے والے کے دل کو ہلا دیتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے مرثیے مختلف خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان سے خود مولانا کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے "ماں کے قدموں پر" جو مرثیہ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی والدہ مرحومہ کس قدر پاکیزہ اور مقدس ہستی تھیں۔ ان کے بارے میں وہ لکھتے ہیں . . .

"نماز کی پابندی کا تھیں نماز کے ساتھ عشق کا یہ عالم تھا کہ اس دور میں اکابرین میں بھی بس چند ہی، مثالیں ایسی ملیں گی۔ اشراق۔ چاشت۔ تہجد کا تو وہ اہتمام کہ ہم جیسوں کو تو فرض کے لئے بھی شاید ہی نصیب ہو۔ یہ سن و سال اور تہجد کا یہ التزام کہ کسی موقع میں بھی ناغہ نہ ہونے پائے۔ گرمیوں کی مختصر راتیں

کہ فجر تک بھی نیند پوری ہونی مشکل ۔ یہ ابھی لیٹی نہیں کہ ابھی تہجد کے لئے اٹھ بیٹھیں ۔ جلے کے جاڑے پڑ رہے ہیں ۔ صبح ہونے پر لحاف سے نکلنا دشوار ہے اور یہ رات کے ایک بجے دو بجے اور تین بجے تہجد کے لئے وضو کر رہی ہیں ۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا موصوف کی والدہ ماجدہ کس قدر مذہب کی پابند تھیں ۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مولانا صاحب نے نہایت مقدس ۔ پاکیزہ اور مذہبی ماحول میں پرورش پائی تھی ۔ جس کا اثر ان پر تا حیات قائم رہا ۔

یہ مرثیئے مولانا کی اپنی شخصیت پر ایک ... سے روشنی ڈالتے ہیں ۔ انھوں نے جن لوگوں کا ان مرثیوں میں ذکر کیا ہے ۔ وہ سب کے سب نمازی ۔ پرہیز گار ۔ نیک اور صالح ہیں ۔ ان سب کے دلوں میں اسلام کی محبت جاگزیں ہے ۔ یہاں تک کہ افضل حسین قوال کے بارے میں لکھا ہے کہ اپنی جوانی کے بارے میں قوالی میں بہت شہرت حاصل کی تھی ۔ آواز میں درد و اثر موجود تھا ۔ مگر پیری میں نماز اور تلاوت کے شدت سے پابند تھے ۔ جن لوگوں کا ذکر مولانا موصوف نے اپنے مرثیوں میں کیا ہے یہ سارے کے سارے خدا اور رسول کے پرستار تھے ۔ ان لوگوں کے ذکر سے خود مولانا عبدالماجد کے رجحان پر روشنی پڑتی ہے ۔ یعنی چونکہ وہ خود ایک مذہبی انسان تھے اس لئے اپنے مرثیوں کے لئے ایسے اشخاص کو منتخب کیا ہے جو انہی کی طرح مذہبی تھے ۔

ان مرثیوں سے مولانا عبدالماجد کی ایک اور خوبی پر روشنی پڑتی ہے ۔ وہ ایک عالم و فاضل ۔ مشہور و معروف اور مذہبی انسان ہوتے ہوئے بھی منکسر مزاج تھے ۔ اس کی انکساری کا ثبوت یہ ہے کہ وہ افضل حسین قوال سے بھی ربط و ضبط رکھتے تھے ۔ وہ لکھتے ہیں ۔

" قوال کا ذکر اور وہ بھی صدق کے صفحات میں " جی ہاں ۔ صدقے عالموں اور زاہدوں عابدوں کا پرچہ کب ہے ۔ نامۂ سیاہ صدق نویس خود ہی ایک عاصی اور عاصی ہے ۔ اپنے ہم جنسوں کا ذکر چن چن کر کرتا ہے "

اس عبارت سے مولانا کا انکسار واضح ہو جاتا ہے۔ قوال سے ان کو انتہا اُنس تھا۔ جب وہ عالم نزع میں تھا تو انھوں نے اس کو آب زمزم پلایا اور جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی میت میں شرکت کی اور اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ یہ مرثیے مولانا کی ایک اور خوبی کو منکشف کرتے ہیں۔ مولانا ایک سنی مسلمان تھے۔ مگر وہ نہایت منصف مزاج تھے۔ اگر ان کو شیعہ حضرات میں بھی خوبیاں نظر آتی تھیں تو ان کا ذکر وہ نہایت فراخدلی سے کرتے تھے۔ انھوں نے راجہ علی محمد خاں والی ریاست محمود آباد کی بہت سی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ جو مذہباً شیعہ تھے۔ مولانا نے ان کی ایک یہ خوبی بیان کی کہ ان کے ذہن میں شیعہ سنی کا کوئی تفرقہ نہ تھا۔ انھوں نے ثبوت میں ایک واقعہ پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ . . .

" کوئی سنی مسلمان حج کرنے جا رہا تھا چلتے وقت اس نے اپنے لڑکے کو راجہ صاحب کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اس کی خبر گیری کریں۔ وہ لڑکا ایک کالج میں زیر تعلیم تھا ظاہر ہے کہ اس کی تعلیم کے اخراجات کے ضامن اب راجہ صاحب ہو گئے۔ انھوں نے اس فرض کو نہایت ہی وسعت قلب کے ساتھ ادا کیا اور اس لڑکے کے نام بینک میں آٹھ سو روپیے اخراجات کے لئے جمع کر دیئے۔ "

مولانا عبد الماجد ایک تنگ نظر سنی مسلمان ہوتے تو اس طرح ایک شیعہ رئیس کی تعریف نہ کرتے۔ مولانا صاحب نے انھیں راجہ صاحب کے غیر متعصب رویہ کی ایک اور جگہ تعریف کی ہے ان کا قول ہے کہ لکھنؤ کی کسی اہل سنت بیوہ کی ایک جوان لڑکی تھی۔ جس کی شادی کا وقت قریب تھا اس لئے وہ بیوہ بہت پریشان تھی۔ راجہ صاحب کو کسی کے ذریعہ خبر ہو گئی انھوں نے ایک معتمد خاص کے ذریعہ ایک معقول رقم چپ چاپ اس بیوہ کو بھجوا دی اور اس طرح اس کی مشکل آسان کر دی۔

مولانا عبدالماجد صاحب نے نہایت کشادہ دلی کے ساتھ راجہ علی محمد خان کی تعریف کی ہے۔

مولانا عبدالماجد کے مرثیے ایک طرف تو خود ان کی سیرت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور دوسری طرف دیگر حضرات کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں انھوں نے ان مرثیوں میں مختلف لیڈروں اور معروف ہستیوں کا ذکر کشادہ دلی کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ بہادر یار جنگ کی سیرت پر مندرجہ ذیل سطور میں روشنی ڈالی ہے۔

"قائد ملت جس کسی نے اسے کہا اس نے کوئی شاعری نہیں کی۔ ادبی صنعت گری لفظی شعبدہ بازی سے کام نہیں لیا ایک حقیقت بیان کردی۔ تاریخ کی طرح خشک۔ سائنس کی طرح بے لوث۔ ریاضی کے اعداد کی طرح کھری۔ قائد ملت (اور آج یہ لفظ پہلی بار صدق استعمال کر رہا ہے) کاش بجائے دکن کے انگریزی ھند کو نصیب ہوا ہوتا تو محمد علی کی جانشینی کا سوال لاینحل نہ رہا ہوتا۔ ہندوستان نے دوسرا محمد علی اگر کوئی پیدا کیا تھا تو وہ یہی تھا۔ وہی اخلاص۔ وہی دینی جوش۔ وہی تڑپ۔ وہی سوجھ بوجھ۔ وہی نبض شناسی۔ وہی ہمت وعزم۔ غرض محمد علی کی انگریزی انشاپردازی کے اور سب کچھ وہی"۔

مولانا عبدالماجد نے راجہ علی محمد خان کی بھی تعریف کی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"دسترخوان کی وسعت ہر مسلمان کے استقبال کو موجود۔ خزانے کی تھیلیاں ہر کلمہ گو کے لئے کھلی ہوئی۔ دولت کی تمنا تھی تو مسلمانوں پر زر پاشی کے لئے۔ اعزاز کی طلب تھی تو مسلمانوں کی نفع رسانی کی غرض سے۔ ایک فیض کا سر چشمہ تھا قوم کی سیرابی کے لئے۔ ایک کرم کا دریا تھا افراد قوم کی آب یاری کے لئے ایک جود وعطا کا بادل تھا جو اٹھا امڈ کر برسا کر اپنے رقبۂ حدود میں

تشنہ لب نہ قوم کو چھوڑا نہ افرادِ قوم کو ۔"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ راجہ صاحب نہایت فیاض سخی اور مسلمان دوست انسان تھے ۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا عبدالرحمٰن کے بارے میں لکھتے ہیں وہ صحیح معنوں میں درویش تھے گو کبھی اپنی درویشی کی نمائش نہیں کی ۔ صبر و ضبط فطرت ثانیہ بن گئے تھے ۔ ماسوا سے بے تعلقی و بے نیازی زندگی کا جزو تھی ۔ بڑی سے بڑی ترغیب نے بھی پایۂ ثبات میں لغزش نہیں پیدا کی ۔ بارہا بڑے بڑے کٹھن وقت پڑے ۔ اس کا پتہ خاص خاص دوستوں تک کو نہ چلنے دیا ۔ کلکتہ کے زمانۂ قیام میں ایک مدت تک معاش کی حسرت تھی کہ گویا نیم فاقہ کشی تھی یہ سارا زمانہ ہنسی خوشی گزار دیا ۔"

یہ سطور نہایت وضاحت کے ساتھ عبدالرحمٰن کے صبر و استقلال پر روشنی ڈالتی ہیں ۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا عبدالماجد کو سیرت نگاری اور خاکہ نگاری پر کس قدر عبور حاصل تھا ۔ دراصل انھوں نے ہمارے سامنے سیرت نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے ۔

مولانا عبدالماجد کو مرقع نگاری میں بھی کمال حاصل تھا ۔ انھوں نے مختلف لوگوں کی شکل و صورت اس انداز سے بیان کی ہے کہ ان کا صحیح نقشہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گوشت پوست کے انسان ہمارے سامنے موجود ہیں ۔ وہ تصدق احمد خاں شیروانی کی شکل و شباہت یوں بیان کرتے ہیں ۔۔۔

" علیگڑھ کے کھلنڈرے ایک سے بڑھ کر ایک لیکن تماشائیوں کی نظر میں بس علی گڈھ کے گول کیپر پر جمی ہوئیں ۔ ایک سرخ و سپید ۔ قوی و تنومند و خوش رو جوان ۔ پہاڑ کی طرح اٹل ۔ اور چٹان کی طرح مضبوط ۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ گول کیپری ہی کے فرائض کے لئے خلق ہوا ہے ۔ لکھنؤ کی ٹیم بے طرح جوش و ولولہ کے ساتھ بپھر بپھر کر

کیسے کیسے حملے کرتی اور ہر حملہ اس گوں کیسر کے تصدق میں ناکام ۔ بس یوں سمجھیے کہ سمندر کی غضبناک موجیں اپنی سطح سے اچھل اچھل کر حملہ آور ہوتیں، اور پتھر کی چٹان سے ٹکرا کر واپس چلی جاتیں ۔ یہ تھا علی گڑھ کالج کا ہونہار نوجوان اور شیروانی خاندان کا چشم و چراغ تصدق "

اس بیان سے تصدق احمد خاں ہماری نظروں کے سامنے اپنے خط و خال کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے موجود ہو جاتے ہیں ۔

مولانا موصوف نے اسی طرح کی مرقع نگاری مولانا عبدالماجد بدایونی کے سلسلے میں پیش کی ہے ۔ ان کی عبارت ملاحظہ ہو ۔ ۔ ۔

" تقریر اور مؤثر تقریر ہر موضوع پر کر سکتے تھے ۔ سیاسی اور عام مذہبی عنوانات پر بھی دلوں کو ہلا دیتے اور مجلس کو لٹا دیتے تھے ۔ لیکن اصلی ذوق اور فطری شوق کی چیز محفل میلاد تھی ۔ حبیب رب العالمین کا ذکر کرنے کو اٹھتے تو آپے میں نہ رہتے ۔ کھڑے ہو کر بلبل کی طرح بولتے اور چہکتے اور شاخ گل کی طرح جھومتے اور لچکتے ۔ فقرے بصری پیکریت کی حسین مثالیں ہیں

مولانا صاحب نے بدایونی صاحب کی گفتار کو بلبل سے اور ان کی حرکات کو شاخ گل سے تشبیہ دی ہے ۔ اس تشبیہ نے مرقع نگاری کو مکمل کر دیا ہے ۔

مولانا عبدالماجد جذبات نگاری میں ید طولیٰ رکھتے تھے ۔ وہ جذبات نگاری میں اس وجہ سے بھی کامیاب ہیں ۔ کیونکہ وہ مرنے والوں کے عزیز و اقارب کے جذبات کی عکاسی کرتے تھے ۔ جو بذات خود غم و اندوہ کا جنازہ بنے ہوئے ہوتے تھے ۔ چنانچہ جب مرشد آباد (بہار ۹) کی کم سن لڑکی تو شابہ کا انتقال ہوا تو اس کی ماں کا حال زار مولانا نے یوں بیان فرمایا ۔ ۔ ۔

" اور پردہ نشیں غم زدہ ماں ۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ رو بھی نہیں رہی ہے ۔ محض سکتے کا عالم طاری ہے ۔ بیشک آنسو سلب ہو گئے ہوں گے ۔ لیکن کلیجے کی کھرچن کو کیا کر رہی ہوں گی ۔ ہر لمحہ جو زبردست ہوک سینہ میں اٹھتی ہو گی اس کا کیا

علاج ہے پتھر کی نہیں آخر گوشت پوست کی بنی ہوئی مخلوق ہیں، تو ان مخلوق ہیں
آرزوؤں اور تمناؤں کے ہرے بھرے باغ کو سٹتے ہوئے دیکھ کر۔"

غمزدہ انسان کے دل کے اندر اندوہ ملال کی موجیں اٹھ رہی ہیں ان کی صحیح
مصوری مولانا عبدالماجد کے قلم نے کردی ہے۔ ان کا یہ بیان جذبۂ غم کی مکمل تصویر ہے

مولانا عبدالماجد صاحب کے یہ مرثیے گوناگوں اور بوقلموں خصوصیات کے
حامل ہیں۔ ان مرثیوں میں فلسفۂ حیات بھی مضمر ہے۔ مولانا کو حیات و کائنات کا وسیع
تجربہ حاصل تھا۔ چونکہ وہ ذکی الذہن واقع ہوئے تھے اس لئے سطح گیتی کے واقعات
سے صحیح نتائج اخذ کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ انھوں نے "دغم" میں ایک زبردست
فلسفۂ حیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی والدہ ماجدہ کا انتقال ۱۹۴۱ء میں
ہوا تھا۔ اس وقت وہ بے حد غمگین تھے۔ مگر جوں جوں وقت کے جھونکے آگے بڑھتے
گئے غم کی موجوں کو دور فضاؤں میں بکھراتے گئے۔ رفتہ رفتہ مولانا صاحب کا غم
گھٹ گیا۔ اب وہ ۱۹۴۶ء میں " یادِ غم " عنوان کے تحت لکھتے ہیں . . .

"پہلے محض مٹی کے ڈھیر کا نظارہ دل کو بے قرار کر دیتا تھا۔ اب آنسو تر ت
جو تھی خشک ہو چکے۔ غفلت انسان پر کس درجہ مسلط رہتی ہے۔ عبرت پذیری کی
عمر کتنی مختصر ہوتی ہے۔ بڑے بڑے حادثے گزر جانے کے بعد یوں معلوم ہوتے ہیں۔
جیسے کبھی گزرے ہی نہ تھے۔ مرنا جینا اوروں ہی کے لئے مقدر تھا۔ اور اپنے لئے تو
سدا جیتے رہنا اور اسی طرح چلنا پھرنا۔ کھانا پینا۔ ہنسنا اور کھیلنا ہے"

حقیقت یہ ہے کہ وقت غم کو بھلا دیتا ہے۔ اور دل کے زخموں کو مندمل کر
دیتا ہے۔

مولانا عبدالماجد صاحب نے فلسفۂ موت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ کیونکہ ان
مرثیوں کا تعلق موت ہی سے ہے۔ اس لئے فلسفہ موت کے رموز و نکات کی وضاحت
ضروری بھی ہے۔ مولانا صاحب سر سکندر حیات کی موت کے بارے میں لکھتے ہیں۔۔۔

"جاہ و حشم کی خوش تدبیری۔ طبیبوں کی حذاقت۔ تیمارداروں کی دردمندی

اگر کہیں سپر بن سکتی ہے تو ماضی میں سکندر یونانی اور حال میں اسکندر پنجابی یقیناً موت کی گرفت سے باہر رہے ہوتے ،،

حقیقت یہ ہے کہ موت سے کسی کو نجات نہیں ہے۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ کی صداقت سے کون انکار کرسکتا ہے۔

مولانا ماجد نے حکیم عبدالحمید لکھنوی کی وفات کے سلسلے میں بھی فلسفۂ موت پر لوسا روشنی ڈالی ہے ۔۔۔

مریضوں کے پھیرے روز ہی گلی میں لگتے رہتے تھے ۔ اور یہی وقت بھی ہوتا تھا ۔ آج کے مجمع کا رنگ سب دنوں سے الگ تھا ۔ آج قدم اٹھ رہے تھے ۔ افسردگی سے ۔ اور دل پگھل رہے تھے عبرت کی گرمیوں سے آج نبض دکھانی نہ تھی ۔ نسخہ لکھنا نہ تھا ۔ خود حکیم صاحب کا جنازہ پڑھنا تھا ۔ قبر میں اتارنا تھا ۔ اور وہ جو دوسرے کے جسم کا محافظ سمجھا جاتا تھا خود اس کے جسم کو گہرے گڑھے میں دفن کرنا تھا ۔ تربت پر فاتحہ پڑھنا ۔ طبیب موت کے پنجے میں ۔ چارہ گر قضا کے شکنجے میں ۔ تقدیر سے تدبیر کی شکست ۔ بے شمار مثالوں میں ۔ لاتعداد نظیروں میں ۔ ایک اور اضافہ ،،

اس عبارت کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ اور عبرت حاصل ہوتی ہے ۔ وہ حکیم جو دوسروں کی زندگی کا ضامن تھا ۔ آج خود اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے ۔

مولانا ماجد کے وہ بیانات بہت مؤثر ہیں جن میں انھوں نے مریض کی جانکنی کا عالم دکھایا ہے ۔ مولانا صاحب کی ہمشیرہ کا انتقال ہوگیا ۔ جوان سے عمر میں چار پانچ سال بڑی تھیں ۔ مولانا صاحب نے ان کے انتقال کا ذکر نہایت دردانگیز لہجہ میں کیا ہے ۔ انھوں نے ان کے انتقال پر جو مضمون لکھا ہے اس کا عنوان "ہمشیر کی رخصتی" ہے ۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں :

" دوپہر کے وقت تقدیر کا نوشتہ پورا ہوا ۔ اور جو صابر و شاکر بندی

شاہد جنت ہی کے لئے بنی ہو گی جنت کے سفر پر روانہ ہو گئی۔ غم نصیب ناکارہ سورۂ لیسین سنا رہا تھا۔ اور ایک جوان صالح منہ میں آب زمزم ٹپکا رہا تھا گزرنے والے کی پیشانی پر پسینے کے قطرے دیکھے گئے۔ اور کمرہ رونے کی بے اختیار آوازوں اور سسکیوں کے ساتھ کلمۂ شہادت کی صداؤں سے گونج اٹھا۔،،

جان کنی کے عالم کی یہ مکمل اور مؤثر تصویر ہے۔ اس قسم کی ایک اور تصویر ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا صاحب کی قریبی رشتہ کی بھتیجی کا انتقال ہو گیا ہے جس کی شادی کو صرف دس گیارہ مہینے گزرے ہیں۔ اس کا عالم نزع انھوں نے ''نئی نویلی'' مضمون میں پیش کیا ہے۔۔۔

''موت کا وقت عجیب پر اثر اور پر درد تھا۔ لکھنؤ کے ایک بڑے حاذق طبیب بورڈ آف میڈیسن کے پرانے ممبر، شفاء الملک کے خطاب سے سرفراز جو اتفاق سے عزیز قریب بھی تھے۔ ابھی نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں ابھی جواہر مہرہ حلق سے اتارنے کی ناکام کوششیں کر رہے ہیں۔ ابھی آنکھوں کی پتلیوں کا معائنہ کر رہے ہیں کہ زندگی کے کچھ آثار ابھی باقی ہیں۔ جسم رنجور۔ روح مسرور۔ اب کوئی نہیں پہچان پڑتا! مرنے والی نے ہراس و اضطراب سے نہیں۔ سکون و اطمینان سے کہا۔ سکرات شروع ہو چکا تھا۔ بصارت اپنا فعل چھوڑ چکی تھی۔ اور معاً زبان بھی بند ہو گئی۔ ہونٹ دوبارہ اللہ اللہ کہنے کے لئے ہلے اور ایمان والی کی روح راضیۃ مرضیۃ کی بشارت پر دوڑتی ہوئی روانہ ہو گئی۔،،

عالم نزع کی یہ تصویر کشی بھی نہایت جگر پاش ہے مولانا نے جان کنی کی مکمل تصویر اس عبارت میں پیش کر دی ہے۔

عبدالماجد کے مرثیوں سے ایک اور نکتہ پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ ایک بیدار مغز انسان معلوم ہوتے ہیں۔ جو حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اگرچہ وہ کوئی سیاسی لیڈر نہیں تھے۔ اس کے باوجود عالمی سیاست سے آگاہ

تھے۔ دنیا کے اندر جو انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ مولانا کی نظریں ان کا جائزہ لیتی رہتی ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد علی پر انھوں نے جو مرثیہ لکھا ہے اس کے ایک ایک پیراگراف سارے عالم کی سیاست ملفوف ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔۔۔

"پچھلے زمانے میں پندرہ بیس سال کے اندر مسلمانوں پر کیا کیا نہیں گزری کیسے کیسے اکابر اٹھا لئے گئے۔ ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر کیا کچھ جھیلنا پڑا۔ انگریزوں نے رگیدا۔ ہندوؤں نے دبایا۔ ترکوں پر اتحادیوں کا نرغہ ہوا۔ شریف نے بغاوت کی۔ مدینہ کی بستی تباہ ہوئی۔ مکہ لٹا۔ خلافت مٹی۔ افغانستان تہ و بالا ہوا۔ عراق میں خاک اڑی۔ مصر کا سر دار اٹھ گیا۔ شام پر آسمان اور فلسطین پر زمین تھرائی"

اس مختصر پیراگراف کے کوزہ میں ایک وسیع و بسیط سمندر بند ہے۔ اس دور میں جتنے تغیرات پندرہ بیس سال کے اندر ہوئے۔۔ مولانا صاحب نے ان کا احاطہ کر لیا ہے۔ چونکہ مولانا ماجد کو فلسفہ سے شغف تھا۔ اور اس موضوع پر وہ مکمل طور پر حاوی تھے۔ اس لئے ان کی تحریر میں جا بجا منطقی دلائل بھی نظر آتے ہیں۔ جو ان کے بیانات کو مضبوط اور مستحکم بناتے ہیں۔ مثلاً وہ مولانا محمد علی کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں۔۔

" بیشک محمد علی بہت بڑا ہندوستانی تھا۔ اسے اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر تھا۔ لیکن اس کی ہندوستانیت بھی ماتحت تھی اس کی اسلامیت کے وہ "خدا" اور "وطن" دونوں کا قائل نہ تھا۔ قائل صرف خدا کا تھا۔ اور چونکہ خدا ہی نے وطن والوں کی خدمت بھی بتائی ہے۔ اس لئے وہ وطن کا خادم تھا"

اس عبارت میں مولانا صاحب نے ایک منطقی انداز میں مذہب و سیاست کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ چونکہ مولانا محمد علی خدا کے قائل تھے اس لئے خدا کی مخلوق کی خدمت ان پر فرض تھی۔ اور چونکہ ہندوستان میں بھی خدا کی مخلوق آباد تھی۔ اس لئے ہندوستانیوں کی خدمت بھی ان کے

فرائض میں داخل تھی۔ یہ منطقی استدلال صرف مولانا عبدالماجد ہی کا حصہ تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے مرثیے نہ صرف موضوعات کے اعتبار سے اہم ہیں۔ بلکہ اسلوب کے اعتبار سے بھی وہ اعلیٰ درجے کے ہیں۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں موثر اسلوب اختیار کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مرثیوں میں اثر نہ ہوگا تو وہ قارئین کے دل کو کس طرح پگھلائیں گے۔

مولانا صاحب نے اپنے مرثیوں میں تاثیر کی بجلیاں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہیں۔ وہ اپنے مرثیوں میں اثر پیدا کرنے کے لئے بعض وقت تخاطبی پہلو اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً مولانا شوکت علی کی موت پر ان کو یوں مخاطب کرتے ہیں۔

"دیکھ اے شوکت ملت کہ آج کتنی بیوائیں تیرے فراق میں بلک بلک کر رو رہی ہیں۔ کتنے بچے تیری یاد میں تڑپ رہے ہیں۔ کتنے سفید ریش بیرمرد خود اپنے آپ کو یتیم سمجھ رہے ہیں۔ کتنے جوان صالح روتے پیٹتے تیرا جنازہ کاندھے پر اٹھائے میلوں پیدل چل رہے ہیں۔ ہزار ہا ہزار کے اس مجموعہ سے دور ملک کے گوشہ گوشہ میں۔ شہر میں۔ قصبوں میں۔ دیہات میں جہاں کہیں بھی ایک اللہ کے ماننے والے آباد ہیں۔ گھر گھر تیرا ماتم کس اخلاص و دردمندی کے ساتھ بپا ہے۔ کروڑوں کی آبادی کس درد دل کے ساتھ تیرا سوگ منا رہی ہے۔ کتنے ایسے جنھوں نے تیری شکل نہیں دیکھی تھی۔ آج بھی اپنی جگہ یہ محسوس کر رہے ہیں۔ کہ گویا انہی کا گھر بے چراغ ہوگیا ہے۔

اس بیان میں زور تخاطبی لہجہ سے پیدا ہوگیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] کا ایک سیلاب ہے جو چٹانوں کو توڑ کر آگے بڑھ رہا ہے۔

اس قسم کا تخاطبی انداز انھوں نے عبدالرحمٰن کے مرثیوں میں بھی اختیار کیا ہے اس بیان کو پڑھ کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو چھلک اٹھتے ہیں۔

"جس شخص کو تمہارے خلوص۔ تمہاری برگزیدگی۔ تمہارے ایمان پر اس درجہ اعتماد تھا۔ کیا خبر تھی کہ تم اس قدر جلد اس کو شکست کر دوگے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس

بدنصیب کو۔ آہ۔ تمہارے ماتم وتعزیت میں اشکبار ہونا پڑے گا۔ بیوہ اور مصیبت زدہ ماں کے اکلوتے فرزند عبدالرحمٰن جس ماں نے اپنی بیوگی اور بے کسی کی بوگی تمہیں دیکھ دیکھ کر پار کردی۔ اور جس نے اپنی ساری خوشیوں اور آرزوؤں۔ حوصلوں اور ارمانوں کا مرکز تمہارے ٹکڑے کو رکھا۔ آج اس دکھیاری کے کلیجے کے ٹکڑے کس طرح کٹ کٹ کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے ہیں۔ کیا یہ حسرت وہ اپنے ساتھ قبر ہی میں لے جائے گی۔ کہ تم ایک بار آ پنے ہاتھ سے آنسو آکر پونچھ دو۔ نوجوانی میں ایک عصمت مآب پردہ نشیں کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی کر دینے والے عبدالرحمٰن۔ جس ڈلارکی پالی کو تم اس کے وطن سے بے وطن کرکے اس کے ماں باپ سے چھڑا کر۔ اس کی بچپن کی سہیلیوں سے جدا کرکے اس کا ڈولا بڑے شوق وارمان سے اپنے یہاں لائے تھے جس کا لباس عروسی ابھی میلا نہیں ہونے پایا تھا۔ اور جس حسرت نصیب کو آخری وقت میں تمہاری خدمت کا موقعہ بھی نہ مل سکا آیا آج اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

اس عبارت کا ایک ایک لفظ تیر وخدنگ کی طرح دل میں چبھ رہا ہے۔ اس انداز میں تلوار کی کاٹ موجود ہے جس سے دل کے ہزاروں ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں۔ یہ سچ ایک دل کو جھنجوڑ نے والا مرثیہ ہے۔

تاثیر وخلوص پیدا کرنے کے لئے مولانا عبدالماجد نے تخاطبی لہجہ کے علاوہ استفہامیہ لہجہ بھی کہیں کہیں اختیار کیا ہے۔ جس کی بنا پر ان کے بیان میں بجلی کی تڑپ سما گئی ہے۔ وہ تصدق احمد خاں شیروانی کی موت پر لکھتے ہیں۔۔۔

"مرنے والا مرچکا۔ جینے والے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر جانیں کتنے ایسے ہیں جو ایسے امتحانوں میں ثابت قدم نکلیں گے۔ ماں باپ نے تعلیم کے لئے ہزاروں روپیہ بے دریغ اس دن کے واسطے اٹھائے تھے۔ کالج میں یہی ارمان دل میں تھے۔۔ ولایت اس خاطر گئے تھے۔ کیا اس غریب کی قسمت میں یہی دن کاٹنے تھے۔ اور یوں ہی ساری عمر بسر کر دینی تھی؟"

یہاں سوالیہ انداز نے عبارت میں۔ جوش۔ زور اور اثر پیدا کر دیا ہے۔ اصل میں تاثیر پیدا کرنے کے گر سے مولانا بخوبی واقف تھے۔

مولانا عبدالماجد نے اپنی تحریر میں تاثر پیدا کرنے کا ایک اور ذریعہ استعمال کیا ہے انھوں نے کبھی کبھی تضاد سے بھی کام لیا ہے۔ جس طرح میرانیس نے اپنے مرثیوں میں تضاد سے کام لے کر تاثر پیدا کیا ہے۔ اسی طرح مولانا نے بھی تضاد کے ذریعہ اپنے بیان میں اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً وہ مولانا محمد علی کی موت کے ساتھ یہ لکھتے ہیں...

" شب برأت ایک خیر و برکت والی رات ہے۔ کسے خبر تھی کہ یہ شب شب قیامت بھی بن سکتی ہے۔ مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزارتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس رات کو ان کا نصیبہ سلا دیا جائے گا۔ زندگی مانگتے ہیں۔ صحتوں کے لئے گڑگڑاتے ہیں۔ کسے خیال تھا کہ عین اس وقت اٹھا لیا جائے گا۔ جس کے وجود سے ملت اسلامیہ کا وجود تھا۔"

مولانا نے اس عبارت میں تضاد سے خوب کام لیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ شب برأت کے موقع پر لوگ جاگتے ہیں۔ مگر اس مبارک رات میں مولانا محمد علی سو گئے۔

مولانا ماجد نے تضاد کے ساتھ ہی مقابلہ کا حربہ بھی استعمال کیا ہے اور اپنی عبارت میں زور پیدا کیا ہے۔ مولانا محمد علی کے مرثیے میں آپ نے ایک جگہ مقابلہ کی صنعت کا استعمال کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں...

" اے کمزوروں اور ناتوانوں کے دلوں کی خبر رکھنے والے مالک! انصاف کر کہ تیرے حبیب اور محبوب کو اس عالم ناسوت سے کوچ کرتے دیکھ کر جب فاروق پر جلالت کا قلب تاب نہ لاسکا تو تیرے حبیب پاک کے ہم نام غلام کے غم مفارقت میں اگر ہم کم طریقوں کی زبانیں لڑکھڑانے لگیں۔ ہماری فطرت سے کچھ بعید ہے۔"

مولانا نے اپنے مرثیے میں انشاء پردازی کے بھی اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے زیادہ تر مذہبی ادب کی تخلیق کی ہے جس میں انشاء پردازی کی گنجائش ہے۔ مگر جہاں انھوں نے دنیوی ادب پر قلم اٹھایا ہے۔ وہاں انشاء پردازی کے خوب جوہر دکھلائے ہیں۔ وہ عبدالرحمٰن کا مرثیہ اس عبارت سے شروع کرتے ہیں...

پہاڑوں اور پہاڑوں ۔ شاروں میں پتھر کے ٹکڑوں اور سنگریزوں کی تعداد حد شمار سے خارج پڑی ہوئی ہے۔ جنھیں انسان اور جانور ہمیشہ پامال کرتے رہتے ہیں۔ لیکن انھیں میں کوئی سنگریزہ لعل و یاقوت بن کر نکلتا ہے۔ جس کی قیمت پوری ایک سلطنت کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے۔ اس کو اگر کوئی توڑ ڈالے تو کیا گزر جائے گی۔ سمندر میں بارش کے بے شمار قطرے ہر سال گرتے رہتے ہیں۔ جو کسی حساب میں نہیں آتے لیکن انھیں میں سے چند قطرے وہ بھی ہوتے ہیں جو آغوش صدف میں پل کر موتی بنا کر نکلتے ہیں۔ اور تاج سلطانی کا زیور بنتے ہیں۔ ان کو اگر کوئی سمندر میں پھینک دے تو دل کو کیونکر صبر آئے گا۔ جنگل میں نو درد پھول اور پتے، درخت اور پودے، بوٹیاں اور پتیاں ہزاروں قسم کی ہوتی ہیں۔ جو جانوروں کی غذا کا کام دیتی ہیں۔ لیکن گلاب کی تازہ اور شاداب کلی بزم ہستی کو معطر کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ یہ کلی اگر پھول بننے کے ساتھ ہی خزاں کی دست برد کی نذر ہو جائے تو دل کو کیا کہہ کر سمجھایا اور قابو میں رکھا جائے۔،،

اس عبارت میں حسن و جمال کی موجیں رقصاں نظر آتی ہیں۔ اس کو پڑھنے سے ہم پر سرور و انبساط کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ انشاء پردازی کے لحاظ سے مولانا عبدالماجد کی یہ عبارت مولانا ابوالکلام کی سرحد میں داخل ہو جاتی ہے۔

مولانا عبدالماجد کے مرثیوں میں کہیں کہیں منظر نگاری کے بھی اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے " یادِ غم " میں ایک جگہ منظر کشی سے کام لیا ہے۔ اس منظر کشی میں صداقت و اصلیت موجود ہے۔ کیونکہ اس منظر کا انحصار ان کے مشاہدے پر ہے۔ ان کی عبارت ملاحظہ ہو۔

" مزار کے پائینتی ایک نیم کا درخت ہے۔ ہر سال اپنے موسم میں نئے پھول لاتا ہے۔ نئے سرے سے سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے۔ اب کی بھی اس پر بہار ہے۔ ابھی کل تک کیسا سوکھا بے رونق۔ کھونٹ سا کھڑا تھا۔ آج کیسا گلزار

ہے کیسا مہک رہا ہے۔ نرم نرم ہلکی ہلکی پتیاں کیسی آنکھوں میں کھبی جا رہی ہیں سفید سفید پھول کیسے خوشنما کھلے ہوئے ہیں۔"

نیم کے درخت کی بہار ادا اس کی ہری اور نرم و نازک پتیوں کی شادابی کا ایک حسین منظر ہے۔ جو ایک ادبی مصوّر کے قلم کا رہین منت ہے۔

مولانا عبدالماجد کے مرثیوں میں تلمیحات کا بھی استعمال ہوا ہے۔

"تلمیحات میں ادیب اشاروں میں کام لیتا ہے۔ اور مبہم انداز میں گذشتہ مشہور واقعات کا ذکر کرتا ہے۔ مولانا صاحب نے مولانا محمد علی کے مرثیہ میں تلمیحات کا خوبی استعمال کیا ہے۔ فرماتے ہیں . . .

"جس نے دعویٰ محبت کا کیا۔ اس کا امتحان بھی ہو کر رہا۔ کسی کو صلیب پر چڑھنا پڑا۔ کسی کو آرے سے چروا یا گیا۔ کسی کو دہکتی ہوئی آگ میں کودنا پڑا۔ کسی سے اولاد کی قربانی مانگی گئی۔ کسی کے خاک وخون میں لوٹنے کا اور تڑپنے کا تماشہ دکھایا گیا۔ کسی کو جلا وطنی نصیب ہوئی۔ کسی کا جسم کوڑوں سے لہولہان کر دیا گیا۔"

ان لطیف اشاروں سے ان کی عبارت کا حسن بہت بڑھ گیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ان کی اصل بیانی میں زور بھی پیدا ہو گیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اہل محبت کو ہمیشہ امتحان کی منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس لئے مولانا محمد علی کو بھی امتحان کا مرحلہ پیش آیا۔

مولانا عبدالماجد نے اپنی عبارت میں زور و تائید پیدا کرنے کے لئے مصرعوں اور شعروں کا استعمال بھی کیا ہے۔ مگر ان کے اشعار اور ان کی عبارت میں کسی قسم کا خلا، واقع نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ عبارت شعر سے چسپاں نظر آتی ہے۔ اس وجہ سے اصل عبارت کا حسن اور بڑھ جاتا ہے۔

مہر سکندر حیات کے مرثیے میں لکھتے ہیں . . .

"روح عرفانی لطافتوں کے [illegible] پانی سے دھل کر اور نکھر کر ان آلائشوں سے پاک ہوئی۔ اور ان قیدوں سے آزاد۔ ایمان کے بازوؤں

سے بڑھی اور یقین واعتقاد کے پروں سے عالم بالا کی سمت بلند ہوئی۔ ہزارہا دل والوں کی دلی دعاؤں کے ساتھ ہزار ہا آنکھوں سے بہے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ''

ع تاپنداری کہ تنہا می روی ''

شیخ سعدی کا یہ مصرعہ اوپر کی عبارت سے کس قدر چسپاں ہے۔ سر سکندر حیات تنہا عالم بالا کی طرف نہیں جارہے ہیں۔ بلکہ ان کے ساتھ دعائیں اور آنسو بھی تھے۔

اسی طرح مولانا شوکت علی کے مرثیے میں انھوں نے ایک مصرعہ نہایت برجستگی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

''محض جیل جانے والے بلکہ تختہ' دار پر چڑھ جانے والے ابھی یقیناً بہت سے پیدا ہوتے رہیں گے۔ لیکن ملت اسلامیہ کے فروغ و برتری کے لیے۔ دین الہی کی نصرت کے لئے، اپنا کاروبار مٹا دینے والا، اپنے جاہ ومال دونوں کو ذبح کر دینے والا۔ اپنے سینہ کو گولیاں کھانے کے لئے پیش کر دینے والا اب کون اٹھےگا۔

ع وہ بات کو ہکن کی گئی کوہکن کے ساتھ

عبدالرحمٰن کی موت کے سلسلہ میں لکھا ہے

'' سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ ہم سب اسی کے ہیں۔ اور سب اسی کی طرف واپس لوٹ جانے والے ہیں۔

صورت از بے صورتی آمد بروں باز شد انا الیہ راجعون

بہرحال مولانا ماجد نے مصرعوں اور شعروں کا استعمال بہت ہی برمحل ان امور کی وجہ سے ان کی نثر کا حسن دوبالا ہوگیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جابجا عربی کے فقرے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ عربی زبان وادب کے فاضل ہیں۔ س لیے عربی کے فقروں کا استعمال ان کے لئے فطری ہے

مگر یہ عربی کے فقرے اردو کی عبارت میں بوجھل نہیں ثابت ہوتے۔ بلکہ مفہوم کی وضاحت میں مدد دیتے ہیں۔ وہ تصدق احمد خاں کے مرثیہ میں لکھتے ہیں۔

"قوم کے سرداروں کا حکم ہوا کہ پریکٹس چھوڑ دو۔ بڑھتی ہوئی آمدنی سے سوالات ترک کر جو اس حکم کے آگے سب سے پہلے جھکے۔ ان "اَلسَّابِقُوْنَ الاَوَّلُوْنَ،، میں ایک یہ بھی تھے"

اسی طرح عبدالرحمٰن کے مرثیہ میں لکھتے ہیں ۔۔

"اس کی عظمت کبریائی کا صدقہ کہ لَهُمْ مَا يَشَاؤُنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ کے مرتبہ پر فائز ہو کر راضیہ مرضیہ کی خلعت سے سرفراز ہو کر اور لَهُمْ مَا يَشَاؤُنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْد کے انعامات سے مالا مال ہو کر اپنے گنہگار اور بدنصیب بھائیوں کو بھول نہ جانا۔

ناجیہ محمد علی خان کی موت پر تحریر فرماتے ہیں ...

" انھیں حکمت کاملہ نے عالم کے سردار اور سردار کو مخاطب کر کے " اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ " کی منادی کر دی۔ اس کی مشیت کے آگے ظاہر ہے محمد علی کی ہستی اور محمد علی کی بساط ہی کیا ہو سکتی تھی۔"

ان عربی کے فقروں سے اردو عبارت میں بلا کا زور پیدا ہو گیا ہے۔ اور مفہوم کی وضاحت میں مدد بھی ملی ہے۔

مولانا عبدالماجد کا اسلوب بعض مقامات پر بالکل بے تکلفی اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے موقع پر وہ قواعد یا الفاظ کی ترتیب کا خیال نہیں رکھتے ہیں۔ بلکہ بڑی حد تک تعقیب روتما ہو جاتے اس کے باوجود عبارت میں نقص نہیں پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ وہ بے تکلف انداز کلام معلوم ہوتا ہے۔

خوش نصیب "گول گپا" کا مرثیہ یوں شروع ہوتا ہے۔ "تاریخ اور مہینہ تو بھلا کسے یاد"۔ جی نہیں کہ اس فقرے میں الفاظ بے ترتیب ہیں بلکہ اس میں فعل ناقص بھی نہیں ہے مگر بے ترتیبی اور بے ربطی اس موقع پر حسن

پیدا کر رہی ہے۔ مولانا کے تکلفی کے انداز میں لفظ تو بار بار آتا ہے جو عبارت میں لطف پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ایک قوال کے مرثیہ میں لکھتے ہیں۔ "کل دن میں جا کر نزع کی حالت میں آب زمزم بھی تو پلایا تھا۔" اسی طرح وہ " ننی نویلی" مرثیہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ " شادی کو پورا سال بھی نہیں گزرا۔ دس گیارہ مہینے تو ہوئے" یہاں تو کا لفظ لطف دے رہا ہے۔

غرض یہ کہ مولانا کے مرثیے مختلف خصوصیات کے حامل ہیں ان میں انشا بھی ہے اور صنعتیں بھی۔ نیز ان میں ایک خاص کیفیات رقائی کیفیات بھرپور طریقے سے موجود ہیں۔ اور یہی عناصر ان مرثیوں کی کامیابی کے ضامن ہیں۔ یہ مرثیے اردو کے ادب العالیہ میں اعلیٰ مقام کے مستحق ہیں۔

مولانا عبدالماجد بحیثیت ادیب منفرد

ادب زندگی اور دور زمانے کا ترجمان ہوتا ہے۔ ادب عالیہ کا خالق اپنے ملک کی تاریخ ادب میں ایک غیر فانی مقام حاصل کرتا ہے۔ اس کی تخلیقات نہ صرف حسن خیال اور حسن ادا کی حامل ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی روح کی تابانی اور اس کی ذات کی آرائش و نکھار کی بھی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ وہ اپنی غیر معمولی قوت مشاہدہ۔ ذوق جمال اور حسن کردار کے باعث اپنے عصری رجحانات کو دیکھتا پرکھتا ہے۔ فکر و تفکر اور واقعات زمانہ سے سبق حاصل کرتا ہے۔ اور اپنے تاثرات قلبی و احساسات دلی کو شیریں الفاظ و دلکش انداز سے اس طرح بیان کرتا ہے۔ کہ اس کی تحریر لذت سے قارئین کے دلی جذبات کی ترجمان ہو جاتی ہے۔

اردو ادب کے ارتقاء کی داستان زیادہ پرانی نہیں۔ اور محمد حسین۔ حالی۔ شبلی اور سرسید و نذیر احمد نے اردو کو اخلاقی۔ معاشرتی اور تاریخی ادب عطا کیا ہے۔

ان کے بعد صاحب طرز ادیبوں میں تین حضرات نمایاں ہوئے جن میں نیاز فتحپوری۔ مولانا ابوالکلام۔ مولانا عبدالماجد دریابادی سرفہرست ہیں۔ مولانا نے فن خطابت کا حق ادا کر دیا۔ نیاز نے اردو میں شعریت اور ادب لطیف کی چاشنی گھول دی۔ مگر مولانا نے تراجم تنقید انشاء، سوانح اور تفسیر میں اپنے جوہر طبع کا کمال دکھایا۔ ان کی تصانیف علم و ادب کا وہ گنجینہ ہیں۔ جن سے پوری ایک نسل بہرہ یاب ہوتی ہے۔ ان کے قلم نے چھوٹے چھوٹے جملوں، سبک فقروں اور لطیف اشاروں سے اردو ادب کی دنیا میں شاہکار کارنامے پیش کئے ہیں۔ ادب کی شاید کوئی ایسی صنف نہیں ہے جسے انھوں نے نہ اپنایا ہو۔ آپ نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اسے اس طرح سنوار کر نکھار کر نک سک سے درست کر کے پیش کیا۔ کہ جس سے ان کے بے پناہ سلیقہ زبان و بیان پر عقل حیران اور قوت ادراک دنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔

مولانا ماجد نے تقریباً پچاس ساٹھ سال تک ادب کی انتھک خدمت کی پڑھنا لکھنا ان کی زندگی کا مقصد رہا۔ اس دنیا کو اگر انھوں نے دیدۂ عبرت نگاہ بخشنے کی کوشش کی تو دوسری طرف حیات اخروی کے لئے، تفسیر قرآن کریم۔ سوانح عمری حکیم الامت اور سیرت نبوی پر مضامین لکھ کر نہ خود اپنی ذات کو مجلّیٰ کیا بلکہ ہزارہا نفوس کے قلوب سے بے یقینی اور بے مقصدی کے زنگ کو دور کر کے ان پر اس طرح صیقل کر دی کہ کردار چمک اٹھے۔ اور چہرے نور ایمانی سے فروزاں ہو گئے۔

ان کی تحریروں میں عصر حاضر کی ہنگامہ خیز۔ حشر بپا اور مضطرب زندگی کا پورا نقشہ ملتا ہے۔ اس پورے دور میں اردو زبان و بیان کا ارتقاء منزل بہ منزل کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ایک صدی پیشتر تو اردو کا اسلوب بیان فارسی اور عربی طرز نگارش سے متاثر رہا۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم اور مغربی علوم نے خاک ہند پر قدم رکھا اس نے نا نوس خیال میں نئی شمع فروزاں کی۔ نئی روشنی نے بہتوں کو ظلمات میں لا ڈالا اور بہتوں کو نئی روشنی نگر دکھائی۔ آج انگریزی ادب کا نہایت گہرا اثر ہندوستان کی ثقافتی۔ معاشرتی۔ عمرانی اور ادبی زندگی پر پڑا۔ اگر ایک طرف

انگریزی اور یورپین مدبرین نے ہماری سیاسی زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا شعور عطا کیا تو دوسری طرف انگریزی ادب کے زور بیان سے ہمارے ادیبوں کو اظہار خیال کا ایک بااثر اور زوردار آلۂ اظہار بھی دیا۔ انگریزی کے بلند پایہ مصنفین کی طرز تحریر، انداز بیان نے نہ صرف ہمیں نئے اسلوب سے آشنا کیا بلکہ ان کے بلند خیالات۔ ارفع تخیلات و فاضلانہ قوت استدلال نے وہ زور بیان عطا کیا کہ جس سے ہماری زبان میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال آسان ہو گیا۔ وہ معاشی مسائل ہوں یا سیاسی مسائل سب پر اردو کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اور یہ زبان صرف محدود مجلسی نہ رہی کہ جس میں صرف معاملات حسن و عشق کی رنگین و نمکین بیانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ حالی۔ شبلی، آزاد اور سرسید نے تصنع و تکلف عبارت آرائی مسجع مقفیٰ عبارت کو ترک کر دیا۔ اصلاح و معاشرت کے لئے سادہ و سلیس زبان میں۔ دلنشیں انداز میں وعظ و حکمت کے دفتر کھولے گئے۔

ان بزرگوں کی تحریروں نے سادی۔ جوش اور خلوص بیان کا سبق دیا۔ عبارت آرائی، رنگین بیانی الفاظ کی جادوگری کا طلسم ٹوٹا۔ ایرانی تکلف، تصنع کی جگہ عبارت میں سلاست اور روانی کی طرف توجہ کی گئی۔ اس دور کے ادیب اور انشاپرداز انگریزی ادب سے اس حد تک متاثر نظر آتے ہیں کہ ان کے جملوں کی ساخت اور بناوٹ۔ بندش کی چستی لفظوں کی ہم آہنگی سب انگریزی ادیبوں کا نقش ثانی معلوم ہوتی ہیں۔

حیدرآباد دارالترجمہ قائم ہوا جس میں مختلف علوم کی اور سائنس کی اصطلاحیں وضع ہوئیں۔ مستند شعبوں کے لئے مستند کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ جامعہ عثمانیہ میں ذریعہ تعلیم اردو رکھا گیا۔ انجمن ترقی اردو قائم ہوئی۔ اور مولوی عبدالحق صاحب کی بے پناہ لگن نے جوان کو اردو کے ساتھ تھی اردو کے ایسے ایسے ادیب ڈھونڈ نکالے۔ جنھوں نے اردو کو علمی و ادبی ذخیروں سے مالا مال کر دیا۔ تاریخ تمدن کا اردو ترجمہ منشی داد شبلی کا گویا گردی نے کیا جس کا آخری باب ہمارا عہد

نے پورا کیا۔ اور یہ ترجمہ اس قدر شگفتہ اور سلیس ہے۔ کہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ وہ ترجمہ ہے یا طبعزاد تحریر۔

مولانا نے فلسفہ پر بھی انگریزی کتابوں کے ترجمے انجمن ترقی اردو کی فرمائش پر کئے۔ ایک انگریزی کتاب سائیکلوجی آف لیڈرشپ تصنیف کی۔ موجودہ کارنامہ تفسیر قرآن انگریزی میں بھی ہے۔

مولانا کو نہ صرف اردو پر بلکہ انگریزی پر بھی عبور حاصل تھا۔ اور ان کے صدہا مضامین عرصہ تک رسالہ " ماڈرن ریویو " میں چھپتے رہے۔ جو کلکتہ سے نکلتا تھا۔

مولانا عبدالماجد کے تجرِ علمی کا جائزہ لینے سے بیشتر ملک کے اس سیاسی اور عمرانی پس منظر کو بھی دیکھنا ضروری ہے۔ کہ جس میں ان کی شخصیت کی تخلیق ہوئی۔ کیسے کیسے دانشوروں کے ساتھ ان کا وقت گزرا۔ اور انھوں نے کس طرح کسب و اکتساب علم کیا۔ ان کی تمام تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علم کی پیاس میں ہمیشہ تشنہ دہن رہے۔ اور زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے۔ اور اپنے اندازِ بیان کو خوب سے خوب تر بنانے میں مشغول رہے۔

اٹھارویں صدی کا آخری ربع اور انیسویں ہندوستان نشاۃ ثانیہ کہی جا سکتی ہے۔ روحِ ایشیاء اپنے برسوں اور قرنوں کے دورِ غلامی و محکومی سے انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ خود اعتمادی کا جذبہ جاگ اٹھا تھا۔ طوفانِ مغرب نے احساس و ضمیر ایشیاء کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ مغرب کی مادیت کا طوفان اٹھا۔ اور اس نے ہندوستان کی روحانیت کو اپنے نرغے میں لینا چاہا لیکن ہر " شر " خیر " کا نقیب ہوتا ہے۔

آزادیٔ وطن کا نعرہ بلند ہوا اور اس کی کڑک نے دلوں میں ولولوں کی بجلیاں دوڑا دیں۔ جذبۂ حبِ قومی نے دلوں میں آگ لگا دی۔ اس بے چارگی و بے بسی غلامی و پستی کے دور میں بھی شعلہ بیان مقرر۔ پراثر ادیب

بلند پایہ شاعر اور بے دار مغز سیاست داں پیدا ہوئے۔ جنھوں نے اپنے بلند خیالات سے ایک پوری ابھرتی ہوئی قوم کے ذہنوں کی تربیت کی۔ اگر ایک طرف مولانا محمد علی " ہمدرد " اور " کامریڈ " کے کالموں میں جذبات بھری زوردار الفاظ میں ملبوس تقریروں سے بے حس دلوں کی دنیا کو ٹھوکر لگا کر بے دار کر رہے تھے۔ تو دوسری طرف مولانا آزاد " الہلال " اور " البلاغ " میں بے مثال خطیب کی آن دکھا رہے تھے۔ اس غلامی کے دور میں بھی ذوق عمل، حب انسانیت، جذبۂ یقین۔ روح اور روحانیت کی رفعت اربندگھوش۔ وویکانند ٹیگور کے پیکر میں مجسم ہوکر عوام کی ذہنی اور جذباتی تربیت کرکے ان میں ایک خاموش انقلاب لانے میں برسرپیکار تھی۔ اس جہاد آزادی میں مسلمان بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے دیوبند کے مولانا محمود الحسن صاحب۔ عبید اللہ سندھی جو ہندوستان کی سیاسی آزادی کے ہاتھوں قید جلا وطنی۔ اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔ اس ذہنی ماحول میں مولانا عبد الماجد نے آنکھیں کھولیں۔ مولانا شبلی کی قربت نے تحقیق و تدقیق کی صلاحیت عطا کی۔ اکبر الہ آبادی کی بظاہر مزاحیہ لیکن عقل کو اپیل کرنے والی شاعری نے الحاد کی ظلمت سے نکال کر نور ایمان کی روشنی۔ تابناک اور حرارت زا اور حیات آفریں دنیا میں در آنے کی توفیق عطا کی۔

فلسفہ نے جو اوہام و شکوک پیدا کر رہے تھے۔ فکر میں جو گتھیاں اور گرہیں ڈال دی تھیں۔ اس کو ہنسی ہنسی میں سلجھانے میں مدد دی۔ باتوں ہی باتوں میں قرآن شریف کی عظمت کا احساس دلایا۔ اور اس کے مطالعہ کی دعوت دی۔ جب صاف ذہن اور صاف دماغ نے اس کا مطالعہ کیا تو حق کی حقانیت نے جلوۂ زیبا۔ فکر و خیال کی قندیل کو روشن کردیا۔ اور وہ ان کے ہم نوا ہوگئے۔ ہم مسٹر عبد الماجد مولوی عبد الماجد ہوئے۔ سوٹ بوٹ نے جبہ دعمامہ کو جگہ دی۔ عقل کی نارسائی اور خام خیالی رخصت ہوئی۔ اور یقین کی شمعیں دل میں جل اٹھیں۔ اور اس رد و صلاح و صلاحیت ہی سے ایک

حیات نو کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقۂ عقیدت پر بیعت ہوئے۔ اور پھر ان کی زندگی تصوف کے رنگ میں ڈوب کر نکھری اور تصوف و اسلامیت پر ایک دفتر کا دفتر لکھ ڈالا۔ جس کا اندازہ لگانا اور اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کو پہچاننا بڑا دشوار ہے۔

فلسفہ کے مطالعہ نے آپ کو منطق استدلال میں کمال عطا کیا۔ ایک موضوع پر ایک متوازن جچی تلی رائے اور معاملات و حقائق پر بے لاگ تبصرہ مولانا کی خصوصیت رہی ہے۔ آپ کے مضامین دل و دماغ دونوں کے لئے سامان آسودگی اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہیں۔ وہ چاہے تنقید ہو یا شخصیت پر اظہار خیال۔ وہ کوئی تحقیقی موضوع ہو یا واقعات دور حاضر پر تبصرہ۔ سب سے آپ کی قوت مشاہدہ بصیرت نگاہ کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا محمد علی سے جذباتی لگاؤ تھا ان کی شخصیت کی جیسی دھڑکتی تڑپتی تصویر جو قلم سے کھینچی ہے وہ مولانا محمد علی کی ڈائری میں آج بھی زندہ جاوید بن گئی ہے۔ نفسیات کا گہرا مطالعہ۔ ظاہر سے باطن تک اسرار بوقلموں۔ کرداروں کا [illegible] مطالعہ اس انداز سے کیا ہے کہ مسافران عدم اسی طرح ہنستے بولتے نظر آرہے تھے۔ جیسے دنیائے آب و گل کو پر رونق بنائے ہوئے تھے۔ آپ کی قوت حافظہ بھی غضب کی تھی۔ گذشتہ ۶۰ سال کے واقعات جواب تاریخ کا جزو بن چکے ہیں۔ ان کی تحریروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اور طلبائے تحقیق اور تشنگان مذہب و تاریخ کے لئے مختلف موضوعات پر مواد فراہم کر رہے ہیں۔ اور دعوت فکر و نظر دے رہے ہیں۔ مشاہدہ کے ایسے نجی واقعات جو کبھی پردۂ اظہار پر عکس فگن نہ ہو سکے۔ مولانا نے بیان فرما کر ان کے کردار کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر دیا ہے۔ اور علاوہ تالیفات و تصنیفات کے ان کا یہی احسان علم و ادب اور تاریخ پر ایسا عظیم ہے کہ جس کی سپاس گزاری کے لئے ہم اظہار و بیان کی ساری قوتیں ہیچ ہیں۔ ان کے قلم سے مولانا مناظر احسن گیلانی ملاحظہ ہوں۔ " مولانا شیروانی کے دولت کدہ پر کوئی کمیٹی تھی۔

نظر ایک نئے چہرے پر پڑی اور رچ جا۔ کہ اب پڑی ہے تو پڑی رہے ہٹنے نہ پائے نرم اور روشن چہرے پر ریشم کی طرح نرم اور ملائم ڈاڑھی۔ دل نے کہا کہ اس چہرے کو دیکھتے ہی چلے جایئے۔ بتانے والے نے یہ بتایا کہ یہ مناظر احسن گیلانی ہیں۔ اللہ اللہ کیسا دھوکا ہوا۔ نام سے عرصہ سے واقف تھا ایک خیالی صورت ذہن میں تھی۔ لیکن صورت سیرت ہر چیز سے متعلق خیال اور اندازہ کتنا مختلف نکلا۔ خیال تھا کہ مسن ہونگے یہ تو جوان نکلے۔ خیال تھا کہ بڑے سپارٹ اور بڑے مناظری ہوں گے اور خشکی و کرختگی کے پتلے۔ مشاہدہ نے بتایا کہ ایک لطیف جسم لطیف تر روح کو چھپائے ہوئے۔ خندہ رو۔ نرم خو۔ نہ کرختگی نہ ثقالت برعکس اس کے ایک پیکر محبت و لطافت۔ قال کے موقع پر قال اور حال کے موقع پر حال۔ صورت پر نورانیت برستی ہوئی۔ گفتگو سے محبوبیت ٹپکتی ہوئی۔ ذرا چھوٹے چھوٹے جملوں کے چٹختے ہوئے شگوفے۔ کھٹکتے ہوئے فقرے الگ الگ پڑے ہوئے دہک رہے ہیں۔ اگر مل جائیں تو شعلہ بن کر خیال کی دنیا میں آگ لگا دیں۔"

آپ کے زور بیان کا اندازہ اس پوری عبارت سے ہوتا ہے۔ ایک ایک لفظ روح میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔ اور پوری عبارت پڑھ کر شخصیت میں جان پڑ جاتی ہے۔ اور یہ اعجاز بیانی یہ طرز ادا کا بانکپن بس انہی کا حصہ ہے۔ اس کی تعریف کے لئے تمام الفاظ پست ہیں۔ اور جس کا لطف بس دل ہی دل میں لیا جا سکتا ہے۔ اور جس کو پڑھ کر سر دھنیے۔ اور مرحبا مرحبا کے نعرے لگایئے۔ مولانا محمد علی کے سلسلے میں پیش لفظ کی ابتدائی عبارت ملاحظہ ہو۔

" دوسروں کی آوازیں اور بھی پست تر ہیں۔ اور تنگ تر دائروں سے ان کی آواز آگے نہ بڑھی۔ ملک کے طول و عرض میں بس ایک ہی ہستی آئی تھی جس کی آواز شمال نے بھی سنی اور جنوب نے بھی۔ ہمالیہ کی بلندی نے بھی اور گنگا کی وادیوں نے بھی۔ خواص نے بھی اور عوام نے بھی۔ عالموں نے بھی اور جاہلوں نے بھی۔ بوڑھوں نے بھی اور بچوں نے بھی۔ آسام نے بھی اور سندھ نے بھی۔ اس کا

کلام سن کر ڈرائنگ روم کے صوفے کھکھلا کر ہنسے۔ اور اس کا پیام سن کر مسجد کے در و دیوار بلبلا کر روئے۔ خانقاہیں اور درس گاہیں۔ ہوٹل اور بازار۔ دفتر اور کارخانے آزادوں کی کانگریس اور رجعت پسندوں کی کانفرنسیں۔ پریس اور پلیٹ فارم۔ دیوبند اور ندوہ۔ فرنگی محل اور جمعیۃ علماء۔ مسلم لیگ سب کے سب اس سے مانوس اور مالوف چپہ چپہ پر اس کے قدم کے نشان۔ ذرہ ذرہ اس کے خیر مقدم سے لطف اندوز "

ایک پیراگراف میں تو محمد علی کی بے چین روح کی تصویر کھینچ کر رکھدی ہے۔ عبارت کا یہ اعجاز اعجاز ادب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ عبارت کی رومانی۔ لفظوں کی دل کشی قلب پر وہ تاثر ڈال رہی ہے کہ جس کی ثنا و صفت بیان کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے آفتاب آمد دلیل آفتاب کے مطابق مولانا کی تحریر وہ موہنی ہے ان میں وہ جان ہے کہ دل آپ ہی آپ اس طرف کھینچتا ہے۔ اردو سے اگر کسی کے دل میں عشق پیدا کرنا ہے تو کسی حُب کے تعویز کی ضرورت نہیں۔ بس گفتہ ماجرا سے پڑھ کر سنا دیا جائے۔ اور ذوق مطالعہ اور شوق مطالعہ تو پیدا ہونا لازمی اور یقینی ہے "

ایک صاحب طرز ادیب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص لہجہ اور ترانہ کے ساتھ ہر موضوع کی نوعیت اور طرز کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے رنگ میں اپنی تحریر کو سمو دے۔ بلاغت کلام یہ ہے کہ ہر سخن اور ہر نکتہ ایک مقام رکھے دیکھئے۔

مثنوی زہر عشق۔ سراسر عشقیہ اور رنگین موضوع ہے اور جس عہد میں وہ لکھی گئی وہ عہد بھی اپنی رنگینی میں لاجواب تھا۔ یعنی واجد علی شاہ کا اس کے نقد و تبصرے کا آغاز بقلم مولانا ملاحظہ ہو۔

" لکھنؤ ہے اور واجد علی شاہ۔ جان عالم کا لکھنؤ۔ ہر لب پر گل کا افسانہ ہر زبان پہ بلبل کا ترانہ۔ ہر سر میں عشق کا سودا۔ ہر سینہ میں جوش تمنا۔ ہر شام میلے ٹھیلے کا ہجوم۔ ہر رات گانے بجانے کی دھوم "

یہ عبارت رنگین بھی ہے اور کہیں کہیں مقفیٰ بھی۔ لیکن خوبی بیان یہ ہے کہ کہیں تصنع اور بناوٹ نام کو نہیں۔ رنگینی میں بھی سادگی ہے اور پرکاری میں

بھی سادہ نگاری۔

منفرد اسلوب نگارش ، مولانا عبدالماجد کا اسلوب تحریر اور ادبی خصوصیات اپنی جگہ بالکل منفرد اور بے مثال ہیں۔ وہ اپنے طرز کے بانی اور خاتم بھی ہیں۔ طنز نگاری۔ اسالیب بیان۔ اور اصناف ادب میں نازک ترین اور دشوار ترین صنف ہے۔ اس میں وہی ادیب اور صاحب قلم کامیاب ہو سکتا ہے جو صحیح معنوں میں زبان کا ادا شناس اور مزاج داں ہو۔ بلکہ اہل زبان جو کہ ذرا سی چوک، اور بد احتیاطی اور بے اعتدالی سے بلکہ بعض اوقات محاوروں کی چاٹ اور زبان کے چٹخارے میں طنز۔ ہجو۔ پھکڑپن۔ اور بے تمیزی کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد جیسا مانا ہوا ادیب محاورات کے بڑھے ہوئے شوق میں بعض اوقات موضوع کی ثقاہت اور مقصد کی متانت کو قائم نہ رکھ سکا۔ اور ان مرحوم کو اس وجہ سے دوسروں کا ہدف ملامت اور ملامزورت اذیت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

قرآن مجید کے ترجمے اور مذہبی مسائل کی تعبیر و تحریر میں ان سے ایسی فرد گزاشتیں ہونے کی وجہ سے مہذب مجلسوں میں ان کے استعمال سے احتیاط برتی جاتی ہے۔ ذرا سی غفلت لبیا رگوئی اور داستان سرائی کے جوش میں آدمی کو ذلت اٹھانی پڑتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جنھوں نے لکھنؤ کی ادبی مجلسوں کا لطف بھی اٹھایا تھا۔ اور زبان کی نوک پلک سے خوب واقف تھے۔ اس بارے میں بڑے محتاط تھے۔ مولانا عبدالماجد کی حس اس بارے میں نکادت حس تک پہنچی ہوئی ہے۔ اور زبان کے معاملے میں ان پر گرفت مشکل ہے۔ بعض مرتبہ ان کا ایک فقرہ۔ ایک شذرہ کا اور ایک شذرہ پوری کتاب کا کام کر جاتا ہے۔ اور کسی وقت ان کا ایک جملہ مخاطب یا شارالیہ کے لئے ایسا بھی بھاری پڑ جاتا ہے کہ اس کا سر کھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور اٹھا تا ہیں۔ بعض مرتبہ کسی پرانے شاعر کے مصرعہ کو عنوان بنا کر کتنا کہ کرجاتے ہیں اور وہ مصرعہ کچھ

سب کچھ کہہ جاتا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے۔ تب اس کی تشریح و تفصیل۔ اس مصرعہ پر
مولانا عبدالماجد کی ادبیات کے وسیع ذخیرہ کا پر وسیع نظر ان کے
انتقال ذہنی اور ان کے حسن انتخاب کی بے انتہا داد دینی پڑتی ہے۔ کہ وہ
یہ مصرعہ کہاں سے لائے۔ اور کس طرح اس کو نگینہ کی طرح انگوٹھی میں جڑ دیا۔
مولانا کی تمام ذوقی باتوں اور ان کے تمام علمی و ادبی تحقیقات اور ان
کی ساری تخلیقات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ نادرہ روزگار اور صاحب
کمال شخصیتوں میں سے ہیں۔ ایک ادیب اور صاحب قلم کی حیثیت سے بھی
قرآن کے ایک مفسر خادم قوم کے لحاظ سے بھی۔ قدیم و جدید کے ایک جامع عالم
کے طور پر اور اپنے وقت اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور فائدہ پہنچانے
والے انسان کی حیثیت سے بھی۔ ایک کہنہ مشق صحافی اور ایک صاحب طرز
ناقد و طنز نگار کی بناء پر بھی۔ وہ ہر طرح قابل قدر اعزاز کے مستحق ہیں۔
مولانا عبدالماجد دریا بادی نے بہت سی کتابوں پر مقدمے، دیباچے
اور پیش لفظ لکھے ہیں۔ یہ ادبی اعتبار سے اس قابل ہیں کہ ان تحریروں
کو کتابی صورت میں یکجا کیا جائے۔ خاص طور سے مثنوی زہر عشق پر مولانا
موصوف کا مقدمہ اس قدر دلچسپ ہے کہ بار بار پڑھنے کے بعد بھی جی
سیر نہیں ہوتا۔ یہ مثنوی اخلاقی اعتبار سے ہوا و ہوس کی عکاس و ترجمان ہے
مگر مولانا موصوف کی خیر پسندی اور صفائے باطن نے ہیرو اور ہیروئن کی ہوس
کاری سے بھی اخلاق و عبرت اور حیا کے نکتے پیدا کئے ہیں۔ اور کاغذ پر
لفظوں کے موتی بکھیر دیئے ہیں۔
مولانا عبدالماجد نے اپنی بیٹی کی شادی پر جو خطبہ دیا تھا وہ نہ صرف اردو ادب
بلکہ عالمی ادب میں اپنی آپ مثال ہے۔ شباب کا زمانہ کس قدر عارضی بلکہ شعلہ مستعجل ہے۔
صنفی تعلقات کی لذتیں بھی آتی ہیں۔ جوانی چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ جوان بیٹی اور عفت
پروردہ دوشیزہ کو یہ باتیں سمجھانا کس قدر دشوار نازک اور خطرناک کام ہے۔ مگر

مولانا ماجد نے اس کام کو بھی ایسی خوبی سے انجام دیا ہے کہ اسے کرامت نہ کہیئے تو اور کیا کہیئے۔
یہ خطبہ زبان و ادب کا دستور اور اخلاق کا منشور ہے۔

صاحب طرز ادیب

ہفتہ وار "سچ" اور "صدق" میں مولانا موصوف کے شذرات بلامبالغہ ادب پارے ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن پر طنز کرنے میں وہ نثر کے اکبر الہ آبادی ہیں۔ انگریزی اخباروں۔ رسالوں اور کتابوں سے اخذ و اقتباس خود اپنی جگہ علمی ریاضت اور ایک طرح کی ریسرچ ہے۔ ان اقتباسات سے پڑھنے والوں کی معلومات میں کس قدر اضافہ ہوتا ہے۔ ان اقتباسات سے مولانا موصوف نے جو نتائج نکالے ہیں۔ جس اچھوتے انداز سے اس پر طنز کیا ہے وہ پند و نصیحت اور تبلیغ اخلاق میں کیمیائے سعادت۔ گلستان سعدی۔ اور اخلاق جلالی کا عکس جمیل ہے۔

قاضی عبدالغفار۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی کی طنز نگاری مشہور بھی ہے اور مقبول بھی۔ مگر مولانا دریابادی کی طنز کے مختلف روپ ہیں۔ وہ کہیں نشتر ہے اور کہیں چٹکی۔ کہیں طمانچہ ہے کہیں گدگدی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا موصوف کی طنز نگاری دین و اخلاق کی دعوت ہے۔ وہ صاحب پیغام اور صاحب دعوت ادیب و طنز نگار ہیں۔

مولانا دریابادی نے ادب۔ طنز اور تنقید میں جس جرأت۔ ایمانداری حق گوئی اور عظمت کا مظاہرہ کیا ہے اس نے ان کے کردار کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

ع یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"

مولانا موصوف کی زبان معیاری ہے۔ جیسے سند میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ صحت زبان ان کی تحریر کی ممتاز خصوصیت ہے۔ نثر میں شعروں کا برمحل استعمال ان کی خوش ذوقی کا ثبوت ہے۔ ان کی تحریروں میں مصرعے اور اشعار پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر نے اسی موقع کے لئے یہ شعر لکھا تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کی تحریریں انشاء پردازی سکھاتی ہیں۔ ادب عالیہ کی تعریف ان کی تحریر کردہ پر صادق آتی ہے۔

زبان ۔ادب و اخلاق غرض ہر اعتبار سے وہ مصلح انشاپرداز اور معمار ادب ہیں ۔

حسن زبان وبیان

مولانا عبد الماجد کی تحریروں میں حسن زبان وبیان اپنی بہار دکھاتا ہے ۔انھوں نے تخلیق ادب کے سلسلے میں ہمیشہ زبان وبیان کا خاص طور پر خیال رکھا ہے ۔محاورہ اور روزمرّہ کی چاشنی ۔ مناسب مقامات پر دیے ہوئے مضامین کی دشوار گزار راہوں سے بھی وہ نہایت خوبی وکامیابی کے ساتھ گزر گئے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی باقی رہتی ہے ۔ تصنیفات میں زبان عالمانہ ہے ۔ غالباً فلسفہ کی اہمیت و وقت پسندی کا خیال رکھ کر وہ عربی فارسی کے ادق الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ لیکن زبان پر عبور ہونے کی وجہ سے عبارت میں تسلسل اور شگفتگی قائم رہتی ہے ۔ان کے اسلوب بیان کی ایک خوبی یہ ہے کہ جیسا ماحول ہوتا ہے ویسی ہی زبان کا اور الفاظ کا استعمال کرتے ہیں ۔ مثلاً فلسفہ کا مضمون لکھنا ہے تو پیرایہ عالمانہ ہوگا ۔ الفاظ بھی عربی کے ذرا مشکل ہوں گے ۔ مرزا سوداؔ کی سوانح عمری یا شاعری پر تنقید ہوگی تو بیان کرنے کا ڈھنگ بھی الگ ہوگا ۔ اور الفاظ بھی مشکل ہوں گے ۔ لیکن مرزا شوق کی مثنوی (زہر عشق) وغیرہ کے متعلق اظہار میں زبان اور الفاظ بھی اسی قبیل کے ہوں گے ۔ جو مرزا شوق کے کلام اور زبان کو پوری طرح ذہن نشین کرا دیں ۔ یعنی اس وقت ان کی لفظیات میں عام فہم کسی قدر شوخ لفظ نظر آتے ہیں ۔

اسلوب بیان بھی اسی قسم کا ہوتا ہے کہ عامیانہ فضا کو نہ تو اتنا پست ہونے دے کہ مبتذل نظر آئے اور نہ اتنا بلند کر دے کہ فلسفہ کی طرح دماغ انسانی کے لئے تخیل پر پرواز کا مطالبہ کرے ۔

مختصر یہ کہ مولانا ہر ماحول کو اس کی اصلی حالت پر قائم رکھتے ہوئے مفہوم اور نکات کو نہایت آسانی سے ذہن نشین کرا دیتے ہیں ۔ باوجود ان باتوں کے بھی طرز بیان کی انفرادیت ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ۔

ان کے اسلوب بیان کا ایک خاص انداز یہ ہے کہ مضمون کے درمیان کبھی کبھی سوالات خود ہی کر جاتے ہیں۔ اس طرح بحث طلب نکتے کے متعلق جتنے کوائف و مخالف سوال ہو سکتے ہیں۔ سب کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ گویا ہر خلش جو ایک سمجھدار آدمی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے نہایت خوبی سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا موصوف کی نثر میں پڑھنے والے کو علاوہ ندرت بیان کی تاثیر اور زور کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ بہت زیادہ لطف اس جگہ آتا ہے جہاں آپ بول چال کے وہ الفاظ لے آتے ہیں۔ جو غالباً بولنے ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ مثلاً " کا " جو اظہار غم کے وقت بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے۔ مرزا رسوا کے قصے میں ایک جگہ رقمطراز ہیں کہ ۔۔ دیکھتے دیکھتے خود ان کی زندگی افسانہ بن گئی ۔"

" کیسے کیسے افسانہ گو افسانہ نویس آئے اور کیسی کیسی مزیدار کہانیاں سنائے گئے کا " دیکھتے دیکھتے خود ان کی زندگی افسانہ بن گئی ۔"

اس کو قدامت پسندی کہیئے یا وضعداری کہیئے عبد الماجد صاحب کی عبارت میں کبھی کبھی ایسے الفاظ بھی آجاتے ہیں۔ جو زیادہ پسند نہیں کئے جاتے مثلاً " سنئیں " اور " لیس " وغیرہ۔ اور کبھی کبھی عبارت کا مقفیٰ ہونا بھی آپ کی نثر میں نمایاں طور پر نظر آجاتا ہے۔ لیکن باوجود متردد ہونے کے بھی یہ چیزیں اس خوبصورتی سے ان کی عبارت میں جگہ پا گئی ہیں۔ کہ بدمزگی کا شائبہ بھی پیدا نہیں ہونے پاتا۔

غرض یہ ہے کہ اپنی باکمال۔ با مقصد اور پُر خلوص ادبی خدمات کی بنا پر مولانا موصوف نے اردو کی ترقی۔ اشاعت اور بقا، میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ ان کی ادبی تخلیقات کی بنا پر وہ بلند مرتبہ ادیب۔ کہنہ مشق اہل قلم۔ نامور صحافی اور عظیم نقاد کی حیثیت سے، رہتی دنیا تک یاد کئے جاتے رہیں گے۔

۱۔ مولانا عبدالماجد بحیثیت تنقید نگار

۲۔ 〃 〃 〃 بامقصد صحافت نگار

۳۔ 〃 〃 〃 مصلح و مفکر اسلام

۴۔ فتنۂ نگار اور مولانا کی خدمات

اعزازات و سفر آخرت

مولانا عبدالماجد بحیثیت تنقید نگار

حضرت مولانا عبدالماجد اردو کے وہ صاحب طرز انشاء پرداز اور بالغ نظر تنقید نگار تھے۔ جن کی تحریریں انشائے عالیہ کا گرانقدر نمونہ ہیں۔ اور جن سے اردو زبان وادب اور تنقید کے مختلف گوشے منور ہوگئے ہیں۔ ان کے ادبی وتنقیدی مضامین معلمانہ پختگی فکر اور وسعت نظر کا آئینہ ہیں۔

درحقیقت تنقید شعور کی ایک ترقی یافتہ منزل ہے۔ اور اپنی اعلیٰ سطح پر فلسفہ۔ منطق۔ سائنس وادبی ذوق اور فکری بصیرت کے دائرے کی چیز بن جاتی ہے۔ تنقید اپنے وسیع تر مفہوم میں کائنات اور اس کے مظاہر کی طرف سوچا سمجھا ذمہ دارانہ رویہ ہے۔ جس کا استعمال ایک محدود پیمانے پر شعر وادب کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے۔ ادبی تنقید کا ملکہ اور رجحان اپنی ابتدائی شکل میں فطری ہوتا ہے۔ لیکن اس کا نشوونما علم وآگہی۔ ریاضت مطالعہ وسیع النظری اور صداقت نگاہ کی مدد سے ہوتا ہے۔

ایک بلند پایہ ذکی الحس نقاد اپنے سرمایۂ فکر کی بنا پر شگل تنقید اپنے گہرے اور بصیرت افروز خیالات پیش کرتا ہے۔ ۔ ۔ اسی تعلق سے مولانا عبدالماجد کی تنقیدی تحریریں تنقید ادب کا بہترین سرمایہ کہی جاسکتی ہیں۔ اردو میں ایسے ادیب ونقاد بہت ہی کم ملتے ہیں۔ جو قرآن وحدیث تصوف واخلاق۔ فلسفہ ونفسیات۔ سوانح وسیرت۔ سفرنامہ۔ ڈائری۔ سیاسی موضوعات اور سماجی مسائل۔ شاعری اور تخلیقی نثر۔ افراد اور مختلف تحریکات کے متعلق بے تکلفی اور ادبی لطافت کے ساتھ رکھیں۔

اور اظہارِ خیال میں تازگی۔ لطف زبان۔ نشتریت اور بلاغت بھی ہو۔
یہ ساری خوبیاں مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریروں میں بدرجۂ اتم پائی
جاتی ہیں۔ انھوں نے جتنا اور جو کچھ لکھا ہے غور و فکر کے پیمانے میں ڈھال کر
لکھا ہے۔ یا کسی مخصوص تخلیقی جذبے کے تحت لکھا ہے۔ اور قلم برداشتہ لکھا ہے
ان کی جملہ تنقیدی تحریروں میں ایک ادبی آن اور حسین اسلوبی شائستگی نظر
آتی ہے۔ یہ قدرت ہر قلم میں نہیں ہوتی ہے کہ وہ مختلف موضوعات کے
مناسب زبان استعمال کرے لیکن ہر ایک کے اندر ایک ایسا آہنگ بھی
موجود ہو جو اسلوب اور طرز ادا کی پہچان بن جائے۔

مولانا دریابادی کی تصنیفی عمر ۵ یا ۶ سال کے درمیان تھی جب انھوں
نے اس وادی میں قدم رکھا۔ اس وقت اردو دنیا نثری اسالیب کے متنوع
رجحانات کا آئینہ دار بنی ہوئی تھی۔ اور ہر دہائی میں ان کی تعداد بڑھتی جاتی تھی
سرسید۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ محمد حسین آزاد۔ علامہ شبلی۔ سرشار۔ اور
مولانا عبدالحلیم شرر۔ ان میں سے کون ہے جس کے جادوئے قلم اور اس کے اثر
کا انکار کیا جا سکے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنا سکہ رواں کیا۔ ہر ایک کے مقلد
پیدا ہوئے۔ ہر ایک نے اردو نثر کے حسن میں چار چاند لگائے۔ ہر ایک رہتی
دنیا تک کے لئے اپنا نقش بٹھا گیا۔

ناممکن تھا کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں کوئی منچلا ادیب
بننے کے شوق میں قلم اٹھائے۔ اور ان میں سے ہر ایک کے دام سے بچ کر نکل جائے
پھر لکھنے والوں کی دوسری کھیپ آئی جو ادبی حسن کاری کے نقطۂ نظر کے پہلے گروہ
کے کچھ آگے ہی تھی۔ کیونکہ اس نے تو ایک طرف اپنے پیش رؤں سے اثر قبول
کیا تھا۔ دوسری جانب مغربی ادب کے خزانوں کی کنجیاں بھی ان کے ہاتھ میں تھیں
مولانا ابوالکلام آزاد۔ محمد علی۔ مہدی افادی۔ نیاز فتحپوری۔ سجاد حیدر یلدرم
ناصر علی۔ دلگیر۔ وستوا۔ حسن نظامی۔ سجاد انصاری اردو کے وہ نثر نگار تھے جنھوں

نے تخیل اور تخلیقی نثر نے ان گوشوں کو منور کیا جنھیں حالی اور ان کے ساتھیوں کی توجہ نصیب نہیں ہو سکی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کا لہجہ ہے۔ طرز ہے۔ ایک سلیقہ ہے۔ جو ان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کی آوازیں کہیں ایک دوسرے سے مل بھی جاتی ہیں۔ ایک دوسرے سے ٹکراتی بھی ہیں۔ لیکن اپنی انفرادیت نہیں کھوتیں۔ اتنا ضرور ہے کہ بعض کا دائرۂ عمل محدود ہے۔ موضوعات محدود ہیں۔ اور شاید ذہن کی پرواز بھی محدود ہے۔ لیکن بعض وسیع میدانوں میں گشت لگانے اور ہر جانب بڑھنے اور پرواز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری کو اس نوع میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال مولانا عبدالماجد دریابادی کے سامنے یہی نمونے تھے۔ ان میں سے انھوں نے کسی کا تتبع نہیں کیا۔ انیسویں صدی ہی میں اردو ادب نے مغربی اثرات قبول کرنا شروع کر دیئے تھے۔ جس کے واضح ثبوت سرسید کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ بعد میں اس کا دائرہ بہت وسیع بن گیا تھا۔ اور فکر و خیال۔ ذوق و اظہار کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے لگا تھا۔ مذہب۔ اخلاق۔ ادب۔ فلسفہ تعلیم۔ تاریخ طرز معاشرت غرض زندگی کا کوئی ایسا اہم شعبہ نہیں تھا۔ جس پر نئے اثرات نے اپنا نقش نہ چھوڑا ہو۔ طالب علمی کے دور سے ہی مولانا دریابادی کا مطالعہ بہت وسیع اور ذہن اثر پذیر واقع ہوا تھا۔ اس لئے انھوں نے ابتداء میں یورپی ادب و فکر کے اثرات بھی قبول کر لئے تھے۔ لیکن انھوں نے کسی بھی ادیب یا نقاد کی پیروی ہرگز اختیار نہ کی۔ آج ایک مصنف اور نقاد کے سامنے بہت سے راستے ہیں۔ اور وہ ادبی نقطۂ نظر اختیار کرنے میں شعوری اور غیر شعوری طور پر کسی مکتبۂ فکر سے وابستہ ہو سکتا ہے۔ جہاں تک تنقید کا تعلق ہے۔ تشریحی۔ تاثراتی۔ نفسیاتی۔ جمالیاتی۔ سماجی۔ تاریخی۔ رومانی۔ کلاسیکی۔ فنی اور فلسفیانہ طریق کا رواج ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے وکیل۔ پیرو اور طرفدار مل جاتے ہیں۔ لیکن ۴۰۔ ۵۰ سال قبل تنقید میں یہ تقسیم واضح نہ تھی۔ حالی آزاد اور شبلی کے ادبی نقطۂ نظر میں ایک دوسرے سے اختلاف تھا۔

مولانا عبدالماجد کا ذوقِ تنقید اسی فضا میں پروان چڑھا اور جب ادبی موشگافیوں نے کئی مکاتب نقد پیدا کر دیئے اس وقت ان کا انداز نظر اور اسلوب دونوں اپنی راہ بنا چکے تھے۔

مولانا موصوف کے طرز تنقید پر غور کرتے ہوئے یہی باتیں سامنے آتی ہیں اور ان کے طریق کار کی لچک انھیں ہر تقلید اور دبستان سے الگ کر دیتی ہے۔ ابتدا میں انھوں نے آزاد اور شبلی کا رنگ پیدا کیا ہو۔ مہدی افادی۔ حسن نظامی۔ سید سلیمان ندوی نے انھیں متوجہ کیا ہو۔ اسکن اسکر وائلڈ، والٹر پیٹر کے اسلوب نے انھیں اپنی طرف کھینچا ہو۔ لیکن شروع ہی سے ان کی ادبی سوجھ بوجھ اور طرز اظہار میں کوئی ایسی بات ضرور ملتی ہے جو خود ان کی اپنی ہے۔ اگر کسی جملے کی ساخت محمد حسین آزاد سے مل جاتی ہے تو تحریر کا دوسرا حصہ شبلی کی یاد دلاتا ہے۔ اور تیسرے میں ابوالکلام آزاد کی خطابت جھلکتی ہے اور طنز کا نشتر رگوں میں دور تک اتر تا دکھائی دیتا ہے۔ پھر جب مکمل طور پر تحریر پر نظر ڈالی جائے تو وہ اپنا اپنا تاثر ایک امتیازی اور انفرادی اسلوب کی حیثیت چھوڑتی ہے۔ ہر دوسرے ادیب سے مختلف اور ہر تنقیدی اسلوب سے الگ۔

مولانا عبدالماجد کی تنقیدی بصیرت پر نگاہ کرتے وقت اس بات کا یاد رکھنا ضروری ہے۔ کہ ایک ادیب کے نقطۂ نظر کی تشکیل میں وہ سارے عناصر کام کرتے ہیں۔ جو نقاد کے ذہن میں چھائے رہتے ہیں۔ انھوں نے مذہبیات علوم اخلاق۔ نفسیات۔ سماجی محرکات۔ تاریخی افکار۔ تصوف۔ ادبیات اور شخصیات ہر ایک سے گہری دلچسپی لی ہے۔ مطالعہ گویا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ طالب علمی کا دور چھوڑ کر تقریباً ۶۰ سال سے ان کا یہ مشغلہ غور و فکر کے ساتھ جاری رہا۔ اور اس کے عملی نتائج ہزار ہا صفحات کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ جن کے تنوع کا یہ حال ہے کہ اگر اس میں ایک طرف۔ زود پشیماں ہے تو دوسری جانب "تفسیر ماجدی"۔ ایک جانب ہلکے پھلکے موضوعات پر نثری مضامین کا سلسلہ ہے۔ تو دوسری جانب تصوف اسلام۔ ایک طرف فلسفۂ اجتماع ہے تو دوسری

طرف مختصر تبصرے اور کتابوں کے پیش لفظ ان سب کے اندر ایک ہی روح کار فرما ہے ایک خاص طرح کی تنقیدی بصیرت ان سے جھلکتی ہے۔ جو تاثراتی اور شخصی ہوتے ہوئے بھی استدلالی رنگ رکھتی ہے۔

مولانا ماجد بات یا اپنا تنقیدی نقطۂ نظر واضح کرنے کے جوش میں حقائق کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ اور جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس کے اخلاقی پہلوؤں پر زور دیتے ہوئے بھی تخلیق کے ادبی جمالیاتی حسن پر بھرپور نگاہ ڈالتے تھے۔ اس کی بہت اچھی مثال مرزا شوق کی "زہر عشق" اور مرزا ہادی رسوا کی "امراؤ جان ادا" پر ان کے خیالات ہیں۔ دونوں تخلیقات کے موضوع وہ نہیں ہیں جن کی طرف مولانا موصوف پسندیدگی کی نظر ڈالتے۔ لیکن جب ان کے فنی اور ادبی محاسن کے ساتھ انصاف کرنے کا وقت آیا تو آپ نے بخل سے ہرگز کام نہیں لیا۔ اور ان پہلوؤں کی کھلے دل سے داد دی۔ جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔

یہ مزہ وہ ہے کہ اپنے مذہبی تصورات۔ اخلاقی عقائد اور تہذیبی افکار کی وجہ سے انھوں نے تحسین شناسی کے لئے وہ زبان استعمال کی ہے جو عام طور پر تنقید میں نہیں استعمال کی جاتی۔ مثلاً "زہر عشق" کے ایک دردانگیز منظر سے متاثر ہو کر وہ لکھتے ہیں۔

"نواب مرزا تجھ پر رحمت۔ تیری روح پر رحمت کہ تو نے کوکھ اجڑنے والی ماں کے جذبات کی تصویر اتار کر کاغذ پر رکھ دی ہے۔ ماں کے منہ سے بول نکل رہے ہیں یا دل جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر آنکھ اور زبان کی راہ سے خارج ہو رہے ہیں۔" پھر مضمون کے خاتمے پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔۔۔

"مشرق کے بدنام سخن گو۔ اردو کے بدنام شاعر رخصت تو درد بھرا دل رکھتا تھا۔ تیری یاد بھی اردو والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی۔ تو نے موت کو یاد رکھا۔ تیرے نام پر بھی موت نہ آنے پائے گی۔ تو نے غفلتوں اور سرمستیوں کی داستان کو خوب پھیلایا۔ شاید کسی رحمت بے حساب پر تکیہ کرکے۔ لیکن اپنی غفلتوں

اور سرستوں کو موت و انجام کی یاد دلا کر خوب رلایا ۔ ،،

مرزا رسوا کی صلاحیتوں اور خوبیوں کا ذکر تو مولانا ماجد کی زبان پر محبت اور عقیدت کے ساتھ آیا ہی تھا ۔ لیکن جب ان کی ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوئے تو ان کا قلم وجد میں رقص کرنے لگتا ہے "

" اردو میں ادل بہتوں نے لکھے پر ان کا رنگ سب سے الگ ۔ ان کا انداز سب سے جدا ۔ نہ ان کے پلاٹ میں سنسنی خیزیاں ۔ نہ ان کی زبان میں غرابت دانیاں ۔ نہ ان کے اوراق میں برق سیمابیاں ۔ نہ کوہ تراشیاں ۔ نہ ان کے الفاظ ترنم آمیز ۔ نہ ان کی ترکیبیں ارتعاش انگیز ۔ نہ ان کی تصویر رزم میں برق پاشیاں ۔ نہ ان کی بزم میں اہتمام آرائیاں ۔ پلاٹ وہی جو روزمرہ پیش آنے والے واقعات جو ہم اور آپ سب دیکھتے ہیں ۔ زبان وہی گھر اور باہر کی ستھری اور نکھری ۔ بول چال جو ہم سب بولتے ہیں ۔ قصہ کے عنوانات نہ لندن نہ ماسکو ۔ نہ ٹوکیو ۔ بس یہی لکھنؤ ۔ فیض آباد ۔ دہلی ۔ الہ آباد ۔ افسانہ کے اشخاص نہ اندھور ۔ نہ سندباد ۔ نہ تاج الملوک نہ ملکۂ زرنگار ۔ بس یہی حکیم صاحب ۔ راجہ صاحب ۔ نواب صاحب ۔ میر صاحب اور مرزا صاحب عسکری بیگم اور عمدہ خانم ۔ امراؤ جان اور بوا ۔ نیک قدم ۔ کہتے ہیں کہ صاحب کمال لاولد رہ جاتا ہے ۔ اس کی نسل آگے نہیں چلتی ۔ اپنے طرز کا موجد بھی وہی ہوتا ہے اور خاتم بھی وہی ۔ مرزا رسوا کا بھی خلف معنوی آج تک پیدا نہ ہوا ۔ ،،

یہ چند جملے مثال کے طور پر ایسی تخلیقات سے لئے گئے ہیں ۔ جو ان کے ذوق ادب کی ترجمان نہیں ۔ ورنہ اکبر یا آتی ۔ مولانا محمد علی یا نظیر اکبرآبادی پر اظہار خیال کرتے ہوتے ہیں ۔ تو ان کے نقطۂ نظر کا اندازہ کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے ۔ خاص طور پر اکبر الہ آبادی اور مولانا محمد علی کا ذکر آجائے تو تنقید اور عقیدتمندی کی حدیں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں ۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان حضرات کے افکار و خیالات سے لگاؤ ان کا جذبہ دار ہے آہنگ

نہیں ہے بلکہ ذہن بھی ان کا ساتھ دیتا ہے۔

مولانا عبدالماجد عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ فلسفہ اور نفسیات کے ادق مسائل سے اچھی طرح واقف تھے۔ لیکن ان کے اسلوب میں دشوار پسندی اور غرابت بیان کا شائبہ بھی نہیں۔ اخباروں کی خبروں پر حاشیہ آرائی ہو۔ کسی بڑے آدمی پر نکتہ چینی ہو۔ کسی کانفرنس یا اجتماع کے لئے چند سطور کا پیام ہو۔ کسی مشہور ادیب کی تخلیق پر تبصرہ ہو۔ کوئی معمولی ادبی لطیفہ یا چٹکلہ ہو۔ مولانا مرحوم کے قلم سے چھو کر رنگین اور شگفتہ بن جاتا ہے۔ اسلوب کی یہی ادبیت ہے جو کسی بھی منزل پر ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ معاصرانہ چشمکوں میں بھی اسلوب اپنی سادگی اور دقار کے ساتھ تیر و نشتر بنتا ہے۔ اور تعزیتی پیغاموں میں آنسو اور مرہم سفرناموں اور ڈائریوں میں اس سے مصوری ہوتی ہے۔ اور مذہبی مقالات میں عقیدے کی گرمی سے تابناکی پیدا ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا عبدالماجد دریا بادی کو جو تنقیدی نظر ریاضت سے ہاتھ آئی تھی۔ اس میں مطالعہ۔ ذہانت۔ ذوق سلیم۔ قدرت بیان اور صحیح ادبی مزاج کی آمیزش نے ایسی انفرادی شان پیدا کی ہے جسے تخلیقی تنقید کا نام دیا جاسکتا ہے۔ بہت سے علمی و ادبی کارناموں کے علاوہ مولانا موصوف اپنے ادبی اسلوب اور تنقیدی بصارت کی وجہ سے بھی اردو دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

یوں تو مولانا کی علمی و ادبی زندگی کے کئی پہلو ہیں۔ لیکن ان کے بے پناہ تنقیدی شعور نے بڑے بڑے ناقدوں سے اپنا لوہا منوالیا ہے ان کی تنقید قدیم اور جدید تنقید سے ہٹ کر اپنا ایک علیحدہ مزاج رکھتی ہے۔ ماقدانہ وضع اصطلاحات سے وہ بھی کام لیتے ہیں۔ لیکن ان میں لفاظی نہیں ہوتی۔ کڑی تنقید بھی کرتے ہیں تو ایسی کہ بار خاطر نہیں ہوتی۔

چنانچہ ایک زمانے میں ان کی تنقیدوں نے ایسی دھوم مچائی کہ ہفت روزہ "صدق" کے صفحات اس کا بوجھ نہ سنبھال سکے۔ چار ورق کے اس چھوٹے سے اخبار کو ظاہر ہے کہ صرف رسالوں اور کتابوں پر نقد و تبصرہ کے لئے وقف نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے مولانا نے تبصرہ کے عنوان کو ختم کر کے "رسید کتب" کے عنوان سے ایک مختصر سا سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ عنوان مولانا کے مختصر نگاری کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ ایک ایک دو دو سطروں میں وہ ضخیم سے ضخیم کتاب پر تنقید کر ڈالتے ہیں۔ اور جچے تلے فقروں میں وہ سب کچھ کہہ دیتے ہیں جب کہ دوسرے تنقید نگاروں کو لمبے چوڑے مضامین لکھنے کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔

مثلاً ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء کے نعتیہ کلام کا مجموعہ "ذکر خوباں" پر انھوں نے اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے۔

" ایک مسلمان شاعر کا نذرانۂ عقیدت بحضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم جو ہر لحاظ سے پڑھنے کے قابل ہے "

اس طرح نقوش لاہور کے شوکت تھانوی نمبر پر یوں نقد و تبصرہ کیا ہے

" شوکت مرحوم کی یاد میں ایک جامع اور مبسوط نمبر اپنے ضخیم نمبر میں ظاہر ہے کہ مضمون ہر قسم اور ہر سطح کے ہوں گے۔ جن چند مضمونوں کے پڑھنے کا اتفاق ہوا ان میں سب سے بہتر فضلی صاحب کا مضمون نظر آیا اور اس کے بعد نادم سیتاپوری۔ ارشد تھانوی۔ رشید صدیقی شاہد احمد دہلوی اور کنہیا لال کپور کے مضمون بھی اچھے معلوم ہوئے۔ "

صدق جدید ۸ نومبر ۶۳ء

مولانا مرحوم کی ادبی تخلیقات کے بغور مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ادبیات میں مولانا کی دل چسپی تنقید ہی سے زیادہ رہی ہے۔ ویسے جوانی میں کچھ شعر و شاعری بھی ہے۔ ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے۔ لیکن جلد ہی تخلیقات سے انتقادیات کی طرف آ گئے۔ اور تنقید میں بھی

آپ کا بیشتر انداز تعریفی یا توصیفی ہوتا ہے۔ اور اس میں تفصیل کے بجائے کوشش اس کی رہتی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفاہیم آجائیں۔ بعض اوقات بعض ادبی کارناموں کی شوخ اور رنگین عبارتوں کی بھی اس انداز میں تعریف کی ہے کہ خود مولانا کی شگفتہ مزاجی ظاہر ہونے لگتی ہے۔

اس بات کا سہرا مولانا ہی کے سر ہے کہ انھوں نے تنقیدات میں ایک نیا طرز ایجاد کیا۔ کلاسیکی ادب پر نفسیاتی تنقیدیں لکھیں۔ جن میں شاعر یا مصنف کو اس عہد کی عمرانی ثقافتی اور تاریخی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔ مثلاً زہر عشق پر ایک بالکل اچھوتے پہلو سے بحث کی جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ کتاب ایسی مخرب اخلاق نہیں ہے۔ جیسا کہ اسے عام طور پر سمجھا گیا ہے۔ بلکہ وہ اس دور عیش و تعیش میں بھی شاعر جذبات محبت اور شورش الفت کے طوفان میں بھی مآل محبت بھی دیکھ رہا تھا۔ راز و نیاز اور معاملات وصل و وصال کا حال لکھنے کے بعد وہ بے ثباتی حیات کا بھی درس دے رہا ہے۔ واعظ کا یہ دفتر تحریف سے بھرپور ہے اس پر مولانا ماجد کا تبصرہ یا تنقید ملاحظہ ہو۔

"غریب مشرقی کا تخیل بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکا۔ اعمال میں کیسی ہی شرمناک کوتاہیاں ہوں۔ لیکن عقیدہ میں فحش و بے حیائی کا جواز داخل نہ تھا۔ اپنے شہدہ پن کی کہانی سنانے کو تو سنا ڈالی لیکن معاً یہ خیال سامنے آگیا کہ خود خیر رسوا ہو چکے ایسا نہ ہو کر داستان فسق دوسروں کے لئے سامان تباہ کاری بن جائے۔ آخر مشرقی ہے بات کو انجام تک پہنچاتے پہنچاتے خود اپنے انجام کا بھی خیال آگیا۔ اٹھے تھے شیطان پورہ کی دلالی کرنے رخ خود بخود خانقاہ کی طرف پھر گیا۔"

اعجاز بیان کا کمال دیکھئے کہ ایک رنگین عیش و تعیش سے بھرپور داستان میں بھی اخلاقیات و اصلاحیات کا پیغام دے رہے ہیں۔ اور یہی مولانا ماجد کی خصوصیت ہے کہ وہ جا بجا عجیب سے عجیب تر کوائف و واقعات ہوں، "کچی باتوں" کے پیرائے میں ہاں ہے تنقید ہو کسی کتاب پر تبصرہ ہو تقریر ہو۔ کوئی موضوع ہو ان کی

بر سلیقہ نکھری ستھری پُر متانت تحریریں ۔ صرف اچھا ادیب بنا سکتی ہیں ۔ بلکہ اچھا انسان بھی اس ادیب کامل اور نقاد مخلص نے جو ادب آموز اور بصیرت افروز تخلیقات پیش کی ہیں ۔ وہ آنے والی نسلوں کی تہذیب ۔ کردار اور تہذیب نفس کے لئے سامان مہیا کرتی رہیں گی ۔

مولانا عبدالماجد بحیثیت بامقصد صحافت نگار

صحافت کی قدر وقیمت اور سماجی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے حقیقی شاعر اور پیغمبر کی طرح حقیقی صحافی دلوں کی تسخیر کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ شاعر اپنے احساسات کی اور پیغمبر اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے ہیں۔ انھیں اس سے قطعاً بحث نہیں ہوتی کہ عوام کیا پسند کرتے ہیں۔ اور کیا ناپسند۔ ان کے پاس ایک مخصوص پیغام ہوتا ہے اور وہ اس کی اشاعت میں ہمہ جان و تن مصروف رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف ایک صحافت نگار کو اپنے قارئین اور اپنے خریداروں کے ذوق اور مزاج کا خیال رکھنا پڑتا ہے یہی مزاج شناسی فن صحافت کا ایک اہم جزو ترکیبی شمار کی جاتی ہے۔ کامیاب صحافی اپنے جنبش قلم مختلف طرز فکر اور مختلف رجحانات رکھنے والے لوگوں کو مطمئن بھی کرتا ہے۔ اور اپنے نقطۂ نظر اور معیار صحافت کا بھی خیال رکھتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی ایک ایسے صحافی تھے جو محض ذہنی غذائیں فراہم نہیں کرتے۔ نمک مرچ لگا کر اور الفاظ کا سہارا لے کر فریب کو حقیقت اور حقیقت کو فریب بنانا ان کو نہیں آتا۔ معاصرین پر کیچڑ اچھالنا اور معززین کے وقار کو دھکا پہنچانا۔ ان کے ضابطۂ اخلاق کی رو سے نازیبا۔ حکومت اور عہدہ داروں کی خوشنودی کے لئے فن اور اخلاقی قدروں کو قربان کر دینا۔ ان کے لحاظ سے نامناسب تھا۔ حق پرستی اور راست گوئی میں انھیں کوئی باک نہ تھا۔ وہ صحافت کے اصولوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ زمانے کے سرد وگرم سے خوب واقف تھے۔ انگریزی دانی اور انگریزی ادب وصحافت سے شناسی کی وجہ سے انھوں نے بڑی مفید۔ بامقصد اور بے لوث قسم کی صحافت کی مثالیں پیش

کی ہیں۔ انھیں سیاسی اغراض سے مطلق واسطہ نہ تھا۔ وہ جو کچھ لکھتے تھے خلوص دل سے لکھتے تھے۔ عوام کے لئے لکھتے تھے۔ خود اپنے لئے لکھتے تھے۔

ایک مصلح دوسروں کی اصلاح کے لئے ذریعہ اپنے لئے روحانی سکون کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ مادی ناکامیوں سے دل برداشتہ نہیں ہوتا۔ اگر اس کی کوشش سے دو چار ہی کی اصلاح ہو جاتی ہے تو اس کے لئے یہ بات انتہائی خوشی کا باعث ہوتی ہے۔

مولانا موصوف کا صحافتی کردار ایک مصلح کا کردار ہے۔ اور مصلح کو بہت کم لوگ قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مگر ان کے برعکس ان کی بے لوث مقصدی صحافت نے انھیں عوام و خواص میں بے حد مقبول بنا دیا ہے۔

صدق جدید لکھنؤ مولانا کا جاری کردہ ہفت روزہ ہے۔ جس کا اداریہ (ایڈیٹوریل) خود مولانا لکھتے تھے۔ یہ ایڈیٹوریل ایک نصیحتوں کا دفتر ہوتا تھا۔ جس میں موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ مقصد کی یکسانیت بھی پائی جاتی تھی۔ جہاں تک مقصد کا تعلق ہے وہ ایک تھا اور بالکل واضح۔ وہی جو ایک مصلح۔ ہادی رہبر اور عامۃ الناس کے قائد کا ہوتا ہے۔ جہاں بے غرضانہ مشوروں اور بے لاگ تبصروں کے ذریعہ معاشرت کی گرتی ہوئی اقدار کو سنبھالنے کی سعی کی جاتی ہے۔ اور قصر ملت کی مانند پڑی ہوئی آب و تاب کو نیا رنگ و روغن دے کر جاذب نظر بنایا جاتا ہے۔ ایسے بلند مقصد کے حصول کے لئے لازمی طور پر متنوع اور رنگارنگ سامان کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہذا کبھی تو قرآن و حدیث کی مشعل ہدایت سے مشعل جلائی جاتی ہے۔ اور کبھی اسلامی تاریخ کے زریں ابواب سے کسب فیض کیا جاتا ہے۔ کبھی کسی مشہور واقعہ یا کسی تازہ واردات کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ کبھی معاصرین کے کالموں سے اقتباس لے کر بصیرت افروزی کی جاتی ہے۔ غرض جہاں کہیں بھی کوئی چیز نصیحت آمیز نظر آئی مولانا اسے تحریری

درس کی شکل دیدیتے تھے۔ اور اس سلسلے میں اس کا ذرا بھی خیال نہ کرتے تھے۔ کہ جس واقعہ یا بات کو اپنے ادارہ کا محور بنا رہے ہیں وہ مادی اعتبار سے کتنی اہم یا کتنی حقیر ہے۔ یا اقبال مرحوم نے اپنی شاعری کے ذریعہ پیغمبری کی تھی۔ یا مولانا نے اپنی صحافت کے ذریعہ یہ نیک فرض انجام دیا ہے۔
کیفیت اور نوعیت کو کمیت پر ترجیح دے کر وہ ادنی سے ادنی چیزوں سے سامان درس حاصل کرتے تھے۔ وہ بیسویں صدی کے تازہ تر صحافتی تقاضوں سے رو گردانی۔ ان تقاضوں سے لاعلمی اور ناواقفیت کی بنا پر نہ تھی۔ بلکہ بالکل جان بوجھ کر اور دیدہ و دانستہ تھی۔ انھوں نے ۱۸ فروری ۱۹۵۶ء کے صدق جدید میں "نیو اسٹیٹسمین" کے ایڈیٹر کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا تھا۔
" کہ جھوٹ اپنے ملک کے متعلق بولنا تو ذرا دشوار ہوتا ہے اس لئے کہ فوراً قلعی کھل جاتی ہے۔ لیکن دوسرے ملکوں سے متعلق بولنا کیا مشکل ہے۔ خصوصاً ان ملکوں کے متعلق جن سے اپنی لاگ ڈانٹ اور رقابت چلی آرہی ہے۔ اور جن کے بارے میں ہر بڑے سے بڑے مبالغے بلکہ صریح جھوٹ کو قبول کرنے اپنی قوم ہر وقت تیار ہے۔ جو اخبارات اپنی قوم کی اس ذہنیت کو پاگئے ہیں۔ وہ اس سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور اپنی اشاعت کو مختاط قسم کے اخبارات کے مقابلے میں دوگنے تگنے تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ کامیاب اخبارات نے اس انداز کو پہچان لیا ہے۔ کہ پر منفعت کاروبار اپنی قوم کو تلخ حقیقتوں سے آگاہ کرتے رہنے سے نہیں چلتا بلکہ اسے ہر حال میں خوش رکھنے اور خوشامد کرتے رہنے ہی سے چلتا ہے۔"
اس کے بعد مولانا نہایت پر مغز اور رمزیت سے بھرپور تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔۔۔
" اخبارات کا فائدہ جنگ دامن چھڑ جانے میں نہیں۔ لیکن اس میں ضرور ہے کہ خبریں برابر جنگی قسم کی اور جنگ کو قریب لانے والی سنسنی خیز

قسم کی برابر نکلتی رہیں۔ روس جنگ عظیم ثانی کے زمانے میں برطانیہ کا بہترین دوست اور حلیف تھا۔ جنگ کا خاتمہ ہوا کہ وہ خبیث ترین قسم کا آلتقان دشمن "بالشویک" ہے۔ جن درسگاہوں خصوصاً ابتدائی درسگاہوں میں تربیت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اپنی قوم کے جن لوگوں نے جنگ میں حصہ لیا ان کو ہیرو سمجھا جائے۔ اور انھیں کی عظمت دلوں میں بٹھائی جائے۔ وہاں کے فارغ طلباء میں جنگ جوئی اور جنگ پسندی پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ ساری قوم میں اسی طرح دوسری قوم کے خلاف تعصب کا زہر ملتا ہے۔ اور پھیلتا رہتا ہے اور اخبارات اس آگ کو ہوا دینے کو ہر وقت آمادہ اور کمربستہ رہتے ہیں"

صدق جدید ۲۸ فروری ۵۸ء

مولانا ماجد کی تحریروں میں بے لاگ سچی تنقیدیں ملتی ہیں جن میں لگاوٹ کا ذرا بھی شائبہ نہیں ہوتا۔ محتاط صحافت ان کا خاصہ ہے۔ لوگ انھیں لاکھ طعن و تشنیع کے حصاروں میں لیتے رہے لیکن وہ ان کے خیالات کو بیڑیاں نہ پہنا سکے۔ انھوں نے جو کچھ سوچا صحیح طور پر سوچا اور زبان سے ادا کر دیا۔ کسی کو ناگوار خاطر گزرے یا خاطر جمع ہو انھیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔

وحدت ادیان کی تلقین فی زمانہ ہر مذہب کے پیروکاروں نے اختیار کر رکھی ہے۔ یہ ایک نظریہ ہے اور بڑی حد تک عالمی اخوت کا داعی بھی ہے۔ لیکن اس کے پوشیدہ مضرات پر رائے زنی کون کرے۔ کون ہے جو اس جرم کا مرتکب کہلوانے کے لئے تیار ہو۔ کہ ایسی عالمی اخوت کی دشمنی کی جرأت کرے لیکن مولانا دریابادی اقبال کی گوسفندی والی حکایت بیان کرنے کے بعد یوں رقمطراز ہیں۔۔۔

" کچھ ایسا ہی افسوں شیطان نے وقت کے بڑے بڑے افلاطونوں کے کان میں پھونک دیا ہے۔ اور اچھے اچھے دانایان روزگار نے وحدت ادیان کی میٹھی لوریوں کے اثر میں آ کر جھومنا اور اونگھنا شروع کر دیا ہے۔

وحدت ادیان کا مسئلہ بجائے خود بتنی بھی حقیقت رکھتا ہو آج جس سیاق میں چلا جارہا ہے اس کے لحاظ سے تو اسلامیت کے حق میں تو قطعی پیام ہلاکت ہے۔ صدق جدید ۲۱ جنوری ۱۹۵۵ء

مولانا صاحب فسق وفجور کے بدترین دشمن تھے۔ اور اس سلسلے میں ہر قابل دست انداز باتیں ان کی تنقید کا نشانہ بنتی رہی ہے۔ اس میں وہ رعایت کسی کے ساتھ نہیں کرتے تھے۔ وہ بے خوفی کے ساتھ اپنے دل کی بات اور اپنا خیال پیش کردیتے تھے۔ بات چاہے جس کے بھی خلاف پڑے۔ پاکستانی وزیراعظم کے بیان پر جس میں اشارہ ہوا تھا کہ یکم جنوری ۱۹۵۶ء سے پاکستان ایک خود مختار جمہوریۂ اسلامیہ ہوگا۔ مولانا یوں تبصرہ فرماتے ہیں۔۔

"یقیناً یہ دنیائے اسلام کے لئے ایک بڑی خوش خبری ہے۔ آج جب ایک نہیں متعدد بڑی بڑی مسلم حکومتیں اپنے کو مسلم کہتے ہوئے ہچکچاتی ہیں۔ اپنی اسلامیت سے شرماتی ہیں۔ کسی ملک کا اپنے ملک کو ہانک پکار کر مسلم اور اسلامی کہہ دینا بڑی جرأت کا کام ہے۔ اور یہ جرأت ہر طرح قابل مبارکباد ہے اللہ اس نام کی برکت عمل میں بھی ظاہر کرے۔ لیکن خدا کرے اس اسلامیت کی ذمہ داریوں کو بھی کچھ لیا گیا ہو۔ اور پاکستان کے حکمرانوں نے، امیروں۔ وزیروں نے۔ بڑے اور چھوٹے افسروں نے۔ علماء و مشائخ نے۔ پبلک لیڈروں نے۔ قانون ساز مجلسوں کے اراکین نے۔ اہل قلم نے۔ عام رعایا نے۔ اور سب سے بڑھ کر اہل صحافت نے۔ اور روزناموں اور ہفتہ داروں کے ایڈیٹروں نے بھی سمجھ لیا ہو کہ اسلامی حکومت کے۔ اسلامی معاشرت کے۔ اسلامی سیاست کے اور اسلامی برادری کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ اور اس ایک اقرار کے بعد کیا کچھ ترک کرنا ہوگا۔ کیا کچھ اختیار کرنا"

صدق جدید ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۵ء

حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا کے اخلاص قلب سے انکار کیا ہی نہیں جاسکتا

یہ اور بات ہے کہ جب مفادات ٹکراتے ہیں۔ تو دوست دشمن کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ پاکستان میں سینما بینی کے بڑھتے ہوئے رجحان کے سلسلے میں ایک خبر پاکر کہ روزانہ تماشائیوں کی تعداد اوسطاً ڈیڑھ لاکھ ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔۔

"لیکن سینما بینی کا جو زور ہے اس کے لحاظ سے یہ ڈیڑھ لاکھ روزانہ تماشائیوں کی تعداد پاکستان کے لئے تو زیادہ نہیں کم ہی معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال اس اندازہ کو بنیاد قرار دے کر کاش کوئی حساب لگا کر یہ بھی بتا دیتا کہ سال میں کتنے گھنٹے اور کتنے دن اپنی عمر عزیز کے اور اپنی دولت کا کتنا حصہ پاکستانیوں نے اس شغل پر ضائع کر دیا۔

صدق جدید ۲۲ جولائی ۱۹۵۶ء

اس خلوص کا کیا کہنا اس تحریر کا ایک ایک لفظ بر بادیٔ ملت پر خون کے آنسو روتا ہوا نظر آتا ہے۔ ماشاءاللہ اس دل کی وسعتیں جو تڑپتا ہے تو اس لئے کہ ایک اسلامی اسٹیٹ کے باشندے اپنا قومی نقصان کر رہے ہیں۔ اور اپنے آپ کو اخلاقی انحطاط کا شکار بنانے کے درپے ہیں۔ لیکن یہ خلوص یہ دردمندی صرف اسلامی اسٹیٹ کے لئے مخصوص نہیں۔ ایک سگریٹ ساز کمپنی کی اس اطلاع پر کہ لکھنؤ میں ہر سال ۶۰ لاکھ روپے کی سگریٹ پی جاتی ہے۔ مولانا کی پر درد طبیعت بے چین ہو اٹھتی ہے۔ فرماتے ہیں۔۔۔

"گویا تمباکو نوشی کی بھی صرف ایک مد سگریٹ نوشی پر ضلع لکھنؤ پانچ لاکھ روپیہ ماہوار خرچ کرتا ہے۔ بیڑی نوشی حقہ نوشی وغیرہ کی مدیں اس حساب سے خارج ہیں۔ یہ مفلس ملک۔ افلاس زدہ۔ گرانی زدہ ملک کے صرف ایک ضلع کا نقشہ ہوا۔ اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ اسراف کی اور ساری مدوں۔ آتش بازی سینما بینی وغیرہ پر ہر سال ہر ضلع میں پھر سارے اضلاع مل کر کتنا پھونک دیتے ہوں گے۔"

صدق جدید ۱۰ جولائی ۱۹۵۶ء

فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے والے قوم و ملک کے دشمن کیا ایسے ہی طرز فکر کے مالک ہو سکتے ہیں۔ نہیں! ہرگز نہیں! یہ مسلک تو صرف صلح کل ہستیوں کا ہی ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کا ہو سکتا ہے۔ جو صرف سنسنی خیز خبروں سے عوام کو

مغالطہ میں ڈال کر صحافت کی دوکان چلاتے اور ان کے روپیہ پر ڈاکہ نہیں ڈالتے
ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس جو مواد فراہم کرتے ہیں۔ اس میں عوام کی منفعت کا پہلو
نمایاں رہتا ہے۔ مولانا ایسے شخص تھے جو اپنوں۔ بیگانوں سب کے لئے دل میں جگہ
رکھتے تھے۔ غیر مسلموں کی بھی فلاح چاہتے تھے۔ اپنی صحافت کی پالیسی کے تعلق سے
وہ خود رقمطراز ہیں۔

صدق کا مسلک ومزاج اچھا ہے یا برا جیسا کچھ بھی ہے واضح اور ظاہر
ہے۔ اور حیرت ہے کہ کوئی شخص اس کے چند پرچے پڑھے اور غلط فہمی میں مبتلا رہے
وہ سیاسی پرچہ تو کسی معنی میں ہے ہی نہیں۔ اصلاً ایک دینی۔ اصلاحی۔ اخلاقی صحیفہ
ہے۔ اس کی اصل دعوت ایک دینی و اصلاحی دعوت
ہے۔ پھر اس کا ایک مخصوص علمی و ادبی کردار و معیار ہے۔ اور اس کا خاص حصہ کتابوں
کے نقد و نظر کے لئے وقف رہتا ہے۔ ان سب کے بعد اگر کچھ جگہ بچتی ہے۔ تو وہ سیاسی
رائے زنی بھی کر دیتا ہے۔ وہ بھی صرف اپنے ملک سے متعلق جس سے وہ سیاسی آئینی
قانونی، جغرافیائی طور پر وابستہ ہے۔

اخلاقیات کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس میدان میں آ کر صدق کا تعلق
ساری دنیا خصوصاً اسلامی دنیا سے قائم ہو جاتا ہے اور وہ نسق والجاد نکتہ
جیسی اپنی بساط کے موافق دنیا بھر پر کیا کرتا ہے۔ صدق کے پاس اس بدقسمتی کا
کیا علاج ہے۔ کہ پاکستان پر اس کے شذرے کثرت سے نقل کرتا رہتا ہے
صدق کے فرد جرم میں ذکر تلخی و تنگ نظری کا آیا ہے۔ تلخی سے اشارہ اگر دعوت
صدق کی جانب ہے تو ظاہر ہے کہ یہ تو ناگزیر اور کوئی دعوت آج تک ایسی
نہیں ہوئی جو کسی نہ کسی طبقہ کو تلخ نہ محسوس ہوئی ہو۔ رہا دوسرا سوال۔
تنگ نظری کا۔ اس سے اگر تعصب مراد ہے تو بحمد اللہ۔ شریف ہندوؤں کی
داد و تحسین میں تو صدق نے آج تک بخل سے کام نہیں لیا ہے۔"

صدق جدید ۸ اگست ۱۹۵۶ء

یہ اقتباس اس بات کا بیّن اور روشن ثبوت ہے کہ صاحب صدق حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی ایک اصلاحی مزاج کے صحافت نگار تھے۔ ادو محض سنسنی خیزی اور ہنگامہ آرائی ان کے اخبار یا ان کی صحافت کا مقصد اور منشاء نہ تھا۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام اہل ہند اور تمام انسانی برادری کی اصلاح وبہبودی کے پیش نظر بیا صحافتی زور قلم صرف کیا۔

مولانا عبدالماجد بحیثیت مصلح مفکر اسلام

حضرت مولانا عبدالماجد کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ ان کی مختلف اور متنوع حیثیتیں تھیں۔ اور ہر حیثیت میں وہ کامل نظر آتے ہیں۔ بلند پایہ طنز نگار۔ صاحب طرز ادیب۔ ممتاز صحافی۔ انوکھے سوانح نگار۔ ماہر فلسفی۔ جدید وقدیم علوم کے ماہر وعالم کی حیثیت سے علمی دنیا میں انھیں کون نہیں جانتا لیکن ان سب سے قطع نظر عالم اسلام میں ایک مفکر اور مصلح کی حیثیت سے ان کا مقام بہت بلند ہے۔

مولانا علوم اسلامی پر گہری نظر رکھتے تھے۔ مفسّر قرآن بھی تھے اور تصوف وسلوک کے اسرار ورموز سے بھی اچھی طرح آشنا تھے۔

عصر حاضر میں جن بلند پایہ علماء نے دین وملّت کی خدمت اور رہنمائی کے لئے خلوص کے ساتھ گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں مولانا محترم بلاشبہ نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ جس رخ سے بھی ان کے کارناموں پہ نظر ڈالئے وہ اپنی انفرادیت کے باعث ممتاز ہی نظر آئیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے صاحب علم وبصیرت صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد کے ذہنی و فکری ارتقا کی تاریخ بڑی دلچسپ و سبق آموز ہے۔ ان کی زندگی کے نشیب و فراز کو خود ان کی تحریروں کی روشنی میں مرتب کیا جائے تو ایک اہم علمی و مذہبی کارنامہ ہوگا۔

مولانا ماجد کا مرتبہ بحیثیت مفکر اسلام اور مصلح امت کیا ہے۔ اس کا تعین مستقبل قریب میں ہی کیا جائے گا۔ جب ان کی خدمات اور کارناموں کے اثرات واضح طور پر مرتب ہوں گے۔ فی زمانہ تمام اسلامی دنیا بلند پایہ مفکرین، جلیل القدر علماء و مبصرین۔ اور قدیم و جدید علوم کے ماہرین سے خالی نہیں ہے۔ اسلام اور مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ آغاز سے اب تک کوئی دور بھی علماء و فضلاء، صوفیائے کرام و مبلغین اسلام سے خالی نہیں رہا۔ رشد و ہدایت کے علم بردار ہر زمانے میں رہے۔ اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جان و مال کی بازی لگانے والے ہر عہد میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ہر ایک نے اپنے حلقہ اور ماحول کو اپنے اصلاحی نقطۂ نظر سے کم و بیش متاثر کیا ہے۔ اسی طرح جاہ پرست، تملق پسند اور دنیاوی عزت و عظمت کے شیدائی علماء کا ایک بڑا گروہ بھی ہر زمانے میں نظر آئے گا۔ ایسے لوگ پہلے بھی تھے۔ آج بھی ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔

بیسویں صدی کا ایک تہائی عرصہ گزرنے کے بعد عالم اسلام کو جن علماء و مفکرین نے اپنے افکار و نظریات سے متاثر کیا۔ اور ان کو دین حنیف کی طرف متوجہ کیا۔ ان کی تعداد محدود ہے۔ ان میں سے برصغیر ہند و پاک کے چند علماء بھی شامل ہیں اور ان کی عظیم خدمات نے انھیں سارے عالم اسلام میں متعارف کرا دیا ہے۔

مولانا عبدالماجد کا شمار بھی ان چند اکابرین ملت اور مفکرین اسلام میں کیا جاتا ہے۔ مولانا موصوف نے جدید علوم و فنون کی ترویج اور تیز رفتار اشاعت اور ترقی کے زمانے میں جب ہر طرف مذہب و اخلاق کے زوال کا چرچا اور ان کے ختم ہونے کا پرچار ہو رہا تھا، اسلامی تعلیمات کو جدید انداز میں پیش کیا۔

انھوں نے خاص تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنا مخاطب بنایا اور سائنٹیفک سے مذہبی تعلیمات کو دل نشیں انداز میں پیش کیا۔ غلط تحریکوں اور مذہب کے مخالف عناصر کی مدلل مخالفت میں پیش پیش رہے۔ اس سلسلہ میں کبھی بھی حق گوئی و بے باکی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا کسی شخصیت سے تو کیا حکومت سے بھی وہ کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔

مولانا کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ یہی ہے کہ وہ علمائے اسلام کی صف میں بڑی عجیب صورت میں شامل ہو گئے۔ اور یہی نہیں! بلکہ ممتاز علماء میں نمایاں حیثیت حاصل کر لی۔ حالانکہ انھوں نے ابتداء سے جدید تعلیم حاصل کی۔ دینی نصابی تعلیم سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ کسی مدرسہ میں انھوں نے مروجہ درسیات میں شرکت نہیں کی۔ وہ دنیوی علوم پڑھتے رہے۔ اور اعلیٰ تعلیم کے دوران انھوں نے فلسفہ کو ایک خاص مضمون کی حیثیت سے پڑھا۔ اور اس میں مہارت بھی حاصل کر لی۔ اس کے نتیجہ میں وہ ابتداءً مذہب سے بیزار ہو گئے اور ایک عرصہ تک الحاد و بے دینی میں شہرت حاصل کرتے رہے۔ کون جانتا تھا کہ جو شخص وجود باری تعالیٰ کا سرے سے منکر ہے۔ جو اپنی بعض تصانیف میں اسلام کی بیخ کنی پر آمادہ نظر آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اسی سے تجدید دین و اسلام اور اصلاح امت کا کام لے گا۔ ایسی مثالیں تو بہت کم ملیں گی۔ کہ ایک شخص نے ابتداء سے عالم شباب تک باضابطہ دینی تعلیم نہ حاصل کی ہو بلکہ اس کی مخالفت پر کمربستہ رہا ہو اور پھر اچانک اس کی ایسی قلب ماہیت ہو کہ وہ اپنے ذوق و شوق۔ محبت و لگن سے دینی علوم میں بھی اتنی نمایاں مہارت حاصل کرے کہ بلاشبہ اکابرین علماء نہ صرف اس کو اپنی صف میں جگہ دیں۔ بلکہ وہ اس صف میں نمایاں نظر آنے لگے۔ یہ معاملہ حضرت مولانا عبدالماجد کے یہاں نظر آتا ہے۔ اور اس لئے یہ ان کی زندگی کا سب سے اہم اور تعجب خیز واقعہ ہے۔

بی اے تک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جا کر ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ ان کا پسندیدہ مضمون فلسفہ تھا۔ لیکن نسپا نسہ مونشگافیوں نے ان کے مذہبی عقائد نے تزلزل پیدا کر دیا۔ دینی علوم کا انھوں نے

اس وقت تک گہرا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ تلاش وجستجو ان کو ضرور تھی مگر راہ میں بھٹکتے رہے۔ اور الحاد و بے دینی کی راہ اختیار کی۔ پہلے انگریزی زبان میں ایک کتاب "سائیکولوجی آف لیڈرشپ" کے نام سے لکھی۔ جو لندن سے شائع ہوئی۔ اس کا اردو ملخص "فلسفۂ اجتماع" کے نام سے انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا۔ اس کتاب کے بعض حصوں سے ان کے الحاد کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ علماء نے اس کی مخالفت کی بعض نے ان پر کفر کے فتوے دیئے۔ اسی زمانہ میں مولانا کو دارالترجمہ حیدرآباد میں ملازمت مل گئی۔ حیدرآباد کے قیام میں بھی ان کے افکار ونظریات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کو راہ حق کی تلاش ضرور تھی۔ ذوق وجستجو میں خلوص تھا وہ مطالعہ کو وسعت دیتے۔ اور سلسلہ کو بڑھاتے رہے۔

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کے بعض جلیل القدر علماء علوم وفنون میں مہارت کے بعد مدتوں تشکیک کا شکار رہے۔ شبہات کی وادیوں میں بھٹکتے رہے۔ لیکن تلاش حق کی تڑپ نے انھیں بے چین رکھا۔ اور اپنے دور تشکیک وانتشار میں وہ عوام وخواص کے مورد طعن وتشنیع رہے۔ امام غزالیؒ کا واقعہ شاہد ہے۔ کہ اسلامی علوم کے علاوہ یونانی فلسفہ کے زبردست عالم تھے۔ جب مدرسہ نظامیہ بغداد کے صدر مدرس مقرر ہوئے تو اس زمانے میں وہ شکوک وشبہات کا شکار رہے۔ جس کی وجہ سے انھوں نے تھوڑے عرصہ بعد عالم اسلام کی سب سے بڑی درسگاہ کی مسند صدارت ترک کردی۔ اور دشت نوردی اور صحرا نشینی کی زندگی اختیار کی۔ پھر جب ان کی محنت قدرے ٹھکانے لگی۔ اور حق وصداقت کی روشنی نظر آگئی تو دوبارہ مسند درس کو بھی زینت بخشی۔ اور تصوف کی اور سلوک کی راہ پر بھی عظیم رہنما کی حیثیت سے نظر آنے لگے۔ یونان کے فلاسفروں کی غلطیوں اور ان سے پیدا ہونے والی گمراہیوں پر مدلل بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں۔ انھیں امام غزالی کی تعلیمی، اور اخلاقی نظریات سے یورپ نے روشنی حاصل کی کئی ایسی مثالیں اور بھی ہیں۔

مولانا عبدالماجد کے ملحدانہ خیالات میں تبدیلی کا آغاز ۱۹۱۸ء سے ہوا اس زمانے میں انھوں نے ہندو مذہب کی روحانیت و اخلاقیات کا مطالعہ مکمل کر لیا تھا۔ اس کے بعد مثنوی مولانا روم کو غور و خوض کے ساتھ پڑھا جس نے ان کی بڑی رہنمائی کی۔ مولانا سچائی کے متلاشی تھے۔ اللہ کو ان سے اس دین کی خدمت لینی مقصود تھی۔ جس کے وہ باغی تھے۔ بہر حال ان کے قلب و ذہن میں تبدیلی ہو کر رہی۔ یہ ان کی زندگی کی اہم اور سبق آموز داستان ہے۔ علم کی گہرائی اور گیرائی نے انھیں وہ روشنی دکھادی۔ جس کی انھیں تلاش تھی۔ اس سلسلہ میں اکبر الہ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا بھی ذکر ضروری ہے۔ اکبر مولانا کے والد ماجد کے دوستوں میں سے تھے۔ ان کو اس گمراہی سے دکھ تھا۔ جس میں مولانا ماجد مبتلا تھے۔ اکبر اپنے مخصوص انداز میں کبھی کبھی ان کو نصیحتیں کرتے رہتے تھے

مولانا محمد علی سے آپ کے تعلقات اس وقت شروع ہوئے جب لندن سے آپ کی انگریزی کتاب شائع ہوئی۔ اس کتاب کے سبب سے مولانا محمد علی آپ کی علمی بصیرت سے بہت متاثر ہوئے۔ لیکن اس کے ساتھ کتاب کے قابل اعتراض حصوں پر مولانا محمد علی نے خطوط کے ذریعہ دلائل کے ساتھ روشنی ڈالی۔ اور ان کے بعض نظریات کی تردید بھی کی۔ مولانا محمد علی جوہر بڑے حق گو اور نڈر رہنما تھے۔ ان کے دلائل اور خیالات سے مولانا عبدالماجد بہت متاثر ہوئے۔ ان کے کچھ عرصہ بعد دونوں میں قریبی رابطہ پیدا ہو گیا۔ محمد علی مولانا ماجد کو اپنے مشہور اخبار "ہمدرد" کے مضمون نگاروں میں شامل کر لیا۔ خلافت کمیٹی کے کاموں میں شریک کیا۔ محمد علی جو کہ ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم رہنما اور حق گوئی میں بے مثال شخص تھے۔ ان کی معیت میں کام کرنا اور ان کی خدمات سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ مولانا ماجد نے حق گوئی و بے باکی کا بڑا حصہ محمد علی ہی کی صحبت میں پایا تھا۔

مولانا عبدالماجد علامہ شبلی نعمانی کے فیض تربیت سے بھی بہرہ یاب

ہوئے۔ سیرت النبی کے مصنف اور عالم اسلام کے زبردست عالم دین شبلی نعمانی۔ ہمارے علمی ادبی۔ دینی و ثقافتی زندگی میں عظیم وقد آور شخصیت تھے۔ ہندوستان میں اسلامی علوم کے احیاء و ترویج کے سلسلے میں شبلی نعمانی سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا ماجد نے انھیں کے فیض صحبت سے استفادہ کیا تھا۔ جب علامہ شبلی نے "سیرت النبی" جیسی معرکۃ الآرا تصنیف کا کام شروع کیا۔ تو مولانا عبدالماجد کی خدمت بحیثیت مترجم حاصل کی۔ جو حوالے کی انگریزی کتابوں کے مطلوبہ اقتباسات کا اردو میں ترجمہ کرتے تھے۔

علامہ شبلی مؤرخ بھی تھے۔ اور سوانح نگار بھی۔ فارسی ادبیات و تاریخ کے ماہر اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز۔ علوم اسلامیہ پر گہری نظر رکھنے والے عالم اور اردو فارسی کے شاعر۔ جدید علوم سے بھی خاصی حد تک واقف تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ رہنا اور ان کی رہنمائی میں علمی و ادبی کام انجام دینا نہ صرف سعادت بلکہ۔۔ ع صحبت صالح ترا صالح کند۔۔ کے مصداق مولانا ماجد کو علامہ شبلی کے افکار و نظریات اور علمی وسیع النظری سے استفادہ اور علمی کاموں کا اچھا موقع نصیب ہوا تھا۔

شبلی سے وابستگی کی حالت اُن کے تعلقات علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر ممتاز علمائے ندوہ سے بھی قائم ہوئے۔ اور یہ سلسلہ تاحیات جاری رہا۔ شبلی کے فیض صحبت اور محمد علی کی تربیت نے مولانا موصوف کے قلم کا جادو جگایا۔ آپ کو اردو کا ذوق مولوی عبدالحق مرحوم سے ملا۔ جن سے مولانا کے روابط خصوصی تھے۔ ندوۃ العلماء کے اکابرین سے ربط وضبط کے باعث ان میں جدید علوم کے ساتھ علوم اسلامیہ کے مطالعہ کی بھی رغبت بڑھی۔ اور آخر میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ سے استفادہ کر کے تصوف و سلوک کی منزلوں کی طرف بڑھے۔ گویا اس طرح رنگین مزاج۔ ڈرامہ و تھیٹر سے لگاؤ رکھنے والے۔ الحاد و بے دینی سے ہمکنار سفر

عبدالماجد کتنے نشیب و فراز طے کرکے مولانا عبدالماجد مفکر اسلام اور مصلح ملت کی حیثیت سے اترے۔ اور گمراہی کے دلدل سے نکل کر بے شمار گم کردہ راہوں کو راہ راست دکھائی۔ باہمی تفرقوں کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ اسلام کو اس کی اصل شکل و صورت میں مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے کی جد وجہد کی۔ غیر مسلموں کو اسلامی تعلیمات کی خوبیوں اور برکتوں سے دل نشیں انداز میں واقف کرانے میں انھیں غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ جس کا ثبوت ان کی بے شمار تحریریں ہیں۔

بیسویں صدی میں جتنی سیاسی۔ اسلامی۔ اصلاحی تحریکیں برصغیر ہند و پاک میں چلیں اتنی شاید ہی کسی اور زمانے میں چلی ہوں۔ ان میں بعض تحریکوں سے طرح طرح کی گمراہیاں پھیلیں۔ اس فضا میں حق و صداقت کے نشان کو اجاگر رکھنا کھرے کھوٹے کا فرق بتانا کسی بڑی ہی ہستی کا کام تھا۔ اس سے قبل علما نے جو اصلاحی اقدام کئے۔ ان کے سامنے ایسی تحریکات نہ تھیں خود مسلمانوں کے اندر جو اصلاحی تحریکیں تھیں اور ان میں جو غلط اور گمراہ کن چیزیں تھیں ان کی نشاندہی کرنا بھی کسی بڑے حق گو عالم و مفکر ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دور موجودہ کی تمام تحریکات کا بیشتر طبقہ تعلیم یافتہ تھا۔

بہر حال یہ خدمت بھی حضرت مولانا عبدالماجد نے بحسن و خوبی انجام دی انھوں نے سب سے زیادہ خطرناک تحریک کمیونزم اور تمام نہاد سوشلزم کی خامیوں اور ان کے مضر اثرات سے مسلمانوں کو خبردار کیا۔ دلائل و براہین سے ان جبر یہ نظریات کے ہر پہلو کا جائزہ لیا۔ علماء کے اختلافات و مذہبی فرقہ کے نزاعات کی اعلانیہ مذمت کی۔ اور ان مصلحین اور اصلاحی جماعتوں کی حمایت کی جو صالح روایات کے حامل تھے۔ حق بات کہنے میں آپ نے کبھی مصلحت سے کام نہیں لیا مولانا جو کچھ لکھتے تھے ان کا اسلوب نگارش سب سے الگ تھا۔ فتنہ نگاری میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔ ان کا انداز بیان نہایت دلکش تھا۔ ان کی بیشتر تحریریں اسلامی

اخلاق کی طرف نشاندہی کرتی ہیں ۔ ان کے لکھنے کا مقصد صرف یہی تھا کہ دین کو فروغ حاصل ہو۔ اور اخلاق اور سماجی اصلاح کا کام آگے کی طرف بڑھتا رہے۔ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو جدید علوم سے پیدا ہونے والی گمراہیوں اور غلط فہمیوں سے دور رکھا جائے۔

مولانا اسلامی فکر کے لحاظ سے ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے ۔ ذہنی بیداری اور فکری دسترس میں ان کا مدمقابل مشکل ہی سے ملے گا ۔ ان کی ذات اسلامی افکار اور اصلاحات کا سرچشمہ تھی۔ ان میں جو اعلیٰ صلاحیتیں تھیں ۔ ان کی بدولت انھوں نے اسلامی تعلیمات کے چمن میں مسلسل آبیاری کی ہے۔

جب مولانا نے ہوش سنبھالا تھا ۔ تو اس وقت ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے اعلیٰ نمائندے اور نمونے موجود تھے ۔ جن کے فیوض و برکات سے ملک کے در و دیوار منور ہو رہے تھے ۔ انھوں نے اپنے معاصر علماء و فضلاء سے رابطہ قائم کیا تھا۔ اور مختلف تحریکوں کا گہرا مطالعہ بھی کیا تھا۔ پسندیدہ نظریات کو سراہا۔ اور غیر ناپسندیدہ نظریات و افکار کی واضح طور پر مخالفت کی۔

مغربی تہذیب اور سائنس کی غیر معمولی ترقیوں نے جن نظریات و تصورات کو جنم دیا ان کو مذہب و اخلاق کے لئے ایک چیلنج سمجھا جانے لگا۔ احیائے علوم اور اصلاح مذہب کی بعض تحریکات نے فتنوں کی صورت اختیار کرلی۔ خود مولانا نے ایک یوں لکھا ہے۔ کہ " شاہ ولی اللہ سے سرسید تک مذہب و معاشرت کے تصور میں جو تبدیلیاں راہ پاتی ہیں۔ وہ آزادی افکار کی انھیں گیتی نورد تحریکوں کا پرتو ہیں۔

دیباچہ تصوف اسلام صفحہ ۱۳

مولانا ماہر علوم جدیدہ سے بخوبی واقف تھے ۔ اس لئے آپ نے اسلامی تعلیمات کی برتری کو سائنسی نقطۂ نظر سے ثابت کرنے کی کامیاب جد و جہد کی ۔ اسلامی تعلیمات کے متعلق ان کے نظریات و عقائد کا عکس ان کی حسب ذیل الفاظ میں نظر آتا ہے۔

" اسلام ذاتی طرف سے بندوں کے حق میں کامل ترین۔ جامع ترین

پیام رحمت ہے انسان کے ذہنی، عقلی، اخلاقی، معاشرتی، جسمانی، روحانی، انفرادی اجتماعی عام ضرورتوں کا کفیل اور ہر شعبۂ حیات میں ترقیوں کا حامل۔ خدارسی اور خداشناسی کی تعلیم اس کا اصل مقصود تھی۔ اس پر اس نے خاص طور سے زور دیا۔ اور اس کے ذرائع و وسائل اس نے اس جامعیت کے ساتھ بیان کیے کہ کسی قسم کی تغییر و ترمیم، تخفیف و اضافہ کی گنجائش نہ چھوڑی۔

تصوف اسلام صفحہ ۱۴۔

جب سائنسی علوم کی ترقی نے مذہب و اخلاق کے رشتوں کو بظاہر کمزور کرنا شروع کیا یا ایسا سمجھا جانے لگا۔ تو مولانا موصوف نے اپنی فکر و بصیرت سے قرآن و احادیث کی روشنی میں ثابت کیا کہ سائنس کی ترقی اسلام کے مخالف نہیں بلکہ اس کی صداقت کو دوبالا کرنے والی ہے۔ اس سلسلے میں جناب والا کی بیشمار تحریریں موجود ہیں۔ جو بیشتر صدق۔ صدق جدید اور صدق کے فائلوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ ان سب کا احاطہ کرنا بھی مشکل ہے۔

مولانا عبدالماجد کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ علم و حکمت کے گہرے نکات دلکش اسلوب اور شگفتہ انداز میں بیان کر دیتے تھے۔ مشکل مسائل کو منطقی انداز سے۔ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق حل کر دیتے تھے۔ آپ اسلامی تعلیمات کی صداقت اور برگزیدگی کے بہترین ترجمان تھے۔ وہ انسانی فطرت کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھے۔ صراط مستقیم کے پرکھنے اور اس کی طرف رہنمائی کی صلاحیت بھی ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

علمائے اسلام اور اسلامی حقانیت

اسلام کی حقانیت کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کا آغاز اس وقت سے ہوا جب یونانی فلسفہ اور منطق کی کتابوں کے ترجمے عربی زبان میں ہوئے۔ یہ سب عباسی دور خلافت میں ہوا۔ مامون رشید کے عہد میں یونانی منطق و فلسفہ کا ہر طرف چرچا تھا۔ مسلمان علماء کا ایک بڑا گروہ اسلامی تعلیمات

کو یونانی فلسفہ اور منطق کے پیمانے سے ناپنے لگا۔ اور ان میں توافق پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی مدد سے عقیدۂ توحید پرکھا گیا تاکہ مضبوط دلائل کے ساتھ دوسروں کے لئے اسلام کی حقانیت و برتری کا ثبوت بہم پہنچائیں۔ مدارس میں بھی اسی فلسفہ کا رواج ہوا۔ پھر اس میں اختلافات پیدا ہونے۔ جس کے نتیجے میں علماء کا طبقہ کئی گروہوں میں تقسیم ہوگیا۔ اور ہر ایک نے ایک دوسرے کو غلط راہ پر ثابت کرنے میں اپنی ساری علمی قوت صرف کی۔ اس طرح علماء کے مختلف گروہ نمودار ہوئے۔ ان اختلافات کی بدولت اسلام کو زبردست نقصان پہنچا۔ انہی اختلافات کی بدولت یونانی فلسفہ کے مقابلہ میں علمائے اسلام نے علم الکلام کی بنیاد ڈالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی مسائل و معاملات میں بحث و مباحثے اور مناظرے کثرت سے ہونے لگے۔ علماء کا ایک گروہ دن رات اسی چکر میں رہتا تھا۔ جس نے عقل کو صحیح ذریعۂ علم ماننے سے انکار کیا۔ اور علماء نے صوفیاء کے طریقۂ معرفت کی مخالفت کی۔

امام غزالی پہلے اسلامی مفکر تھے جنھوں نے اسلامی علوم کے ساتھ یونانی منطق کو منطبق کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ منطق کے بغیر کوئی علم مکمل نہیں ہوتا۔ انھوں نے اسلامی اخلاق کے مبادیات کو نہایت سلیقے کے ساتھ مدون کیا۔ جس کو علماء نے بے حد سراہا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ نے ان کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن بقیہ علوم کے سلسلہ میں وہ امام غزالی کی رائے کے متفق نہ تھے۔ بلکہ ان پر شدید تنقید یں کرتے رہتے۔ امام غزالی نے یونانی فلسفہ کے بہت سے نظریات کو دلائل کے ساتھ رد کیا لیکن ایک بڑے حصہ کو درست بھی تسلیم کیا ہے۔ اور اسلامی مسائل میں ان کے ذریعہ استدلال کو اپنایا۔

بہرحال یہ سلسلہ بڑھتا رہا۔ ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) نے اسلامی تعلیمات کے سلسلے میں اس طرز و اسلوب کی پرتند روکالت کی۔ جو قرآن نے اختیار کی۔

انھوں نے ارسطو کی منطق پر تنقید کی اور کہا کہ اسلامی علوم کے لئے منطق کی اصطلاحات کو استعمال نہ کیا جائے ۔ جبکہ سلف صالحین بھی ان سے واقف نہ تھے

یہ حقیقت ہے کہ آغاز اسلام اور نزول قرآن کے بعد سے تمام مسلمان ہر معاملے میں قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کرتے تھے ۔ قرآن کا اسلوب بیان اور طرز استدلال ہر مسلمان کا جزو تھا ۔ مسلمانوں کی فکر و عمل کو اس سے روشنی ملتی ہے ۔ یہی اسلامی تہذیب و ثقافت کا جاندار جز تھا اور انسانی فطرت سے ہم آہنگ بھی ۔ ہر مسلمان کے لئے خدا ۔ قیامت توحید و رسالت پر ایمان و یقین کے لئے وہ دلائل کافی تھے ۔ جو قرآن مجید نے بیان کر دیئے ہیں ۔ اگر مسلمان اسی راہ پر چلتے اور مسلمانوں کو چلاتے تو نت نئے در پیدا ہوتے ۔ مگر جب یونانی فلسفہ اور منطق کا نفوذ ہوا تو قرآنی طرز استدلال اور اسلوب بیان سے آخر نے قطع نظر کر لیا ۔ یونانی فلاسفہ نے اسلام سے پہلے ایک فلسفہ مرتب کیا تھا ۔ اسی قدر قضا انسانی عقل کی حدود میں آسکتا ہے ۔ بھلا اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے طرز استدلال پر ایسے انسان ساز فلسفہ کو کیسے ترجیح دی جا سکتی ہے ۔ تاہم عقل و استدلال کی یہ بدعت ایسی جاری ہوئی کہ اس دور سے لیکر اس زمانے تک اس کا سلسلہ جاری ہے ۔ ایک مختصر گروہ علماء و صوفیاء کا ہر دور میں ایسا موجود رہا ہے جس نے قرآن ہی کو اسلامی تعلیمات کا منبع سمجھا ۔ اور اپنے فکر و فن کا محور اسی کو بنایا ۔

اسی گروہ سے مولانا عبدالماجد بھی تعلق رکھتے ہیں ۔ آپ فلسفہ اور منطق کے عالم تھے ۔ اس لئے انھوں نے عقلی دلائل سے مذہبی صداقتوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ۔ علمی زندگی میں انھوں نے مذہبی مسائل و مباحث میں بھرپور عقلی دلائل پیش کئے ۔ سائنس کی جدید ایجادات سے بظاہر مذہبی روایات اور عقائد پر جو ضربات پڑتی نظر

آتی تھیں مولانا ان پر قرآن اور احادیث کے جوابوں سے روشنی ڈالتے تھے۔ لیکن عقلی دلائل بھی اس کے ساتھ پیش کر دیتے تھے۔ بے شمار تحریروں میں انھوں نے بڑی اہم گتھیوں کو سلجھایا ہے۔

اصلاحی خدمات

مولانا مرحوم نے اسلام کی خدمت اور ملت اسلامیہ کی اصلاح کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا اندازہ تو اس دور میں نہ ہو سکا۔ مگر آئندہ دور میں ضرور ہو جائے گا۔ ان کی خدمات تحریری ہیں۔ لیکن ہر تقریر اور خطبہ سے زیادہ موثر۔ مولانا آخری آخری زمانہ میں اسلام کی حقانیت اور عقائد و مسائل کی اہمیت کے سلسلے میں عقلی دلائل کو ترک کر دیا تھا اور ہر معاملہ میں قرآن و حدیث سے استدلال کرنے لگے تھے۔ ان کی تازہ ترین تحریروں سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

قرن اولی سے علماء اور صلحاء نے یہی طریقہ اپنایا تھا اور جو اس مسلمان کے لئے جسے اللہ پر یقین ہے کافی ہونا ہے۔

مخالفین اسلام اہل قلم خواہ وہ کسی گوشے میں ہوں۔ یا کسی ملک میں ہوں۔ جب اسلام کے خلاف کچھ لکھتے تھے تو مولانا عبدالماجد ان کا نہایت مناسب مدلل اور منہ توڑ جواب دیتے تھے۔ یورپ کے اکثر معروف مصنفین اور رسائل کے مدیروں نے اسلام یا پیغمبر اسلام پر کوئی مخالفانہ کتاب یا مضمون لکھا اور مولانا کی نظر سے وہ گزر گیا تو اس کا جواب دینا وہ نہایت درجہ ضروری سمجھتے تھے۔

غرض مولانا ماجد ان فتنوں سے ملت اسلامیہ کو بڑے دلچسپ انداز میں باخبر کر دیتے تھے۔ جن کے پھیلنے سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا تھا۔ اور جو فتنہ سر پر آجاتا تھا اس کے تدارک کے طریقے بھی اشاروں اور کنایوں میں بتا دیتے تھے۔

موجودہ دور میں دنیائے اسلام کے اسلامی مفکّرین اور مصلحین
امّت میں کئی قابل قدر شخصیتیں موجود ہیں۔ ان میں مولانا اہم شخصیتوں
کی صف اول میں نمایاں ہیں۔
انشاءاللہ ان کی خدمات کو بقائے دوام ضرور حاصل ہوگا۔

فتنۂ نگار — اور مولانا کی خدمات

مولانا موصوف نے علمی وادبی دنیا میں وقت اور علمائے وقت کے ہاتھوں کھڑے کئے ہوئے کئی فتنوں کا مقابلہ "سچ"، صدق"، "صدق جدید" کی زوردار تحریروں سے کیا ہے۔ اول فتنوں میں سب سے اہم فتنہ رسالہ "نگار" (لکھنؤ) کا تھا۔ اس کے مدیر شہیر نیاز فتحپوری صاحب (جو اپنے قلم سے اپنے نام کے ساتھ رسالہ کے سرورق پر اپنا لقب رئیس التحریر لکھتے تھے۔) نے اسلام اور عقائد اسلام کے خلاف اپنے مضامین کے ذریعہ بڑی زہرافشانی کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔ اسلام کی مقدس ہستیوں حتیٰ کہ ذات رسالت کے بارے میں بھی ان کا قلم جادۂ اعتدال سے بری طرح بھٹک گیا تھا۔ انہی نیاز صاحب کے بارے میں حضرت مولانا عبدالماجد صاحب اپنی کتاب "معاصرین" میں یوں رقمطراز ہیں۔ "لیکن نگار فتنۂ روزگار۔ نگار کے اوراق میں انھیں دیکھیئے تو یہ دوسرے ہیں۔ لحاظ نہ اپنے عہد و پیمان کا۔ نہ دوسروں کے دین و ایمان کا۔ ہر ناجائز اس کے صفحات میں جائز۔ اور ہر ناگفتنی اس بزم کاغذی میں گفتنی۔ حق تعالیٰ کی ذات سے لے کر قرآن مجید و انبیائے کرام۔ ملائکہ مقربین سب کے ساتھ تمسخر و استہزاء۔ گستاخیاں و بدتمیزیاں ۱۹۳۱ء میں "سچ" نے زبردست لے دے شروع کی۔ اور قوم نے سخت پکڑا۔ تو ڈھیلے پڑ گئے۔ اور لگے بار بار توبہ نامہ شائع کرنے۔ آئندہ کے لئے وعدے کئے۔ کان پکڑے۔ ۱۹۳۶ء میں موقع پایا۔ میدان خالی دیکھ پھر الحاد نے دور باندھا۔ اب کی تبلیغ یہ شروع ہوئی کہ قرآن مجید کلام الٰہی نہیں کلام بشری ہے۔ ۱۹۴۵ء میں ایک مرتبہ مرے کھیے دشمن اسلام پادری کی آڑ

بکہ ایک بار پھر قرآن مجید پر زہرافشانی شروع ہوگئی۔ غرض فتنہ فروشی کا ہر وار ایک نیا سوانگ اور نگار کی گرم بازاری کے لئے روز ایک نیا عنوان تلاش نیاز اپنے اس نفس امارہ نگار کے بغیر محض نیاز ہی ہوتے۔ عالم۔ فاضل۔ محقق نہ سہی۔ مرد اشراف صاحب ایمان ہونا کیا تھوڑی بات ہے۔ . . .

یہ نیاز صاحب دریدہ دہن۔ آریہ سماجی ناظرین اور گستاخ زبان۔ و گستاخ قلم مسیحی مشنریوں سے بھی یگ گونہ بازی لے جارہے تھے۔ اس فتنہ کے خلاف بعض مسلمان اخباروں درسائل نے گاہ بگاہ آواز اٹھائی۔ لیکن اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ اور نیاز صاحب کا قلم اور زیادہ ڈھیٹ ہوتا چلا گیا۔ چوں کہ ان کے اس قسم کے مضامین سے گمراہی بہت پھیل رہی تھی۔ خصوصاً اس دور کے نوجوان طبقہ میں جو انشائے نیاز سے بری طرح متاثر تھا۔ اس لئے ۱۹۳۶ء کی آخری سہ ماہی میں مولانا عبدالماجد نے اس "فتنہ نگار" رسالہ نگار کے خلاف یورش مہم شروع کی۔ اس سے قبل بھی سچ کے بعض مضامین اور شذرات نیاز صاحب کی ان تحریروں کے جواب میں نکل چکے تھے۔ ۲۵ر ستمبر ۱۹۳۶ء کا "سچ" نکلا وہ پورا کا پورا اسی فتنہ کے جواب کے لئے وقف تھا۔ اور آٹھ مضمون کا پورا اخبار صرف ایک ہی طویل مضمون "ایک دشمن اسلام مسلمان"، (دوسری ذیلی سرخی اسلام اور مسلمانوں پر جگر خراش حملے۔) کے عنوان سے مولانا کے قلم سے درج تھا۔ اس میں رسالہ نگار کے فائلوں کا جائزہ لے کر نیاز صاحب کے خرافات اور اسلام اور مسلمانوں پر ان کے قلمی حملے کے نمونے کثرت سے پیش کئے گئے تھے۔ ان اقتباسات کو دہرانا اس فتنہ کو تازہ کرنا ہے۔ اس لئے صرف ایک ہی اقتباس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ جس سے اندازہ ہو جائے گا۔ کہ نیاز صاحب، اس وقت الحاد کی ترنگ میں خود اپنے مسلمان ہونے پر اظہار تاسف کر چکے تھے۔ "جب وقت میں دیکھتا ہوں کہ بعض اکابر قوم روز بروز تنگ نظر اور رسم ورواج کے پابند ہوتے جاتے ہیں۔ تو میری یاس کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ اور پھر خود اپنی ذات سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ کہ کیوں بجائے مسلمان ہونے کے

انسان پیدا ہوا۔ ۱۱۱ (نگار مارچ ۱۹۲۹ء)

یہ اقتباس قدرے ہلکا ہے۔ دوسرے اقتباسات جو اس طویل مضمون میں نقل ہوئے تھے۔ وہ ایک سے بڑھ کر ایک اشتعال انگیز اور ملت اسلامیہ کے لئے صبر آزما تھے۔ مولانا کے سچ کے اس طویل مضمون میں جو انشائے ماجدی کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا نیاز صاحب کی عبارتوں کو نقل کرکے جو جوابی تبصرے کئے گئے تھے ان کے نمونے ملاحظہ ہوں۔

"عذر گناہ سنتے تھے کہ کبھی بدتر از گناہ بھی ہوتا ہے۔ شکر ہے کہ اس بہترین مثال نیاز صاحب نے ادب اردو میں مہیا کردی۔ عالم اسلام کے طول و عرض میں کوئی دوسرا مسلمان کسی دوسرے فرقہ کا بھی سہی ایسا آپ کی نظر سے گزرا ہے۔ جو سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام اور دوسرے انبیاء کرام کے اسمائے گرامی کو ہر کلمۂ ادب و تعظیم سے معرّا و مخلّی محض محمد۔ موسیٰ اور عیسیٰ لکھے۔ بلکہ اپنی اس خرافات نگاری کو فخریہ پیش کرے۔ مسلمان تو مسلمان تمیزدار و شائستہ ہندو۔ سیح۔ سکھ۔ عیسائی و پارسی بھی اب اس اسم گرامی کو یونہی بلا تعظیم نہیں لکھتے۔ یہ نام کا مسلمان کیا اس سے بھی گیا گزرا ہو لیا ہے۔ اور بے دینی کے ساتھ بدتمیزی بھی اپنے اندر پوری طرح پیدا کرلی ہے۔"

حضرت عیسیٰ مسیح کی شان میں نیاز صاحب کے قلم نے جو بدلگامی کی تھی اس کا اقتباس درج کرکے مولانا لکھتے ہیں۔

"اب مسلمان خدارا بتائیں کہ اگر یہی الفاظ کسی ہندو۔ کسی آریہ کسی عیسائی کی زبان سے ادا ہوئے ہوتے تو کیا مسلمان اسی طرح بے حس اور خاموش رہتے۔ کیا محض اسلامی نام کی آڑ پر کفر نوازی کو قابل تحمل۔ ہر گندہ ذہن کو گوارہ کرے گی۔"

سچ "کے اس مضمون سے سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک آگ سی لگ گئی۔ مسلم اخبارات و رسائل نے اس مضمون کو نقل کیا۔ اور اس کی تائید میں پُر زور مضامین اور نوٹ لکھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے رسالہ معارف"

میں اس پر خاص توجہ دی۔ حیدر آباد کے "رہبر دکن" لکھنؤ کے "ہمت" اور "حق"، بمبئی کے "خلافت" لاہور کے "انقلاب" "زمیندار" بجنور کے "مدینہ" دہلی کے "الجمعیۃ"، "والامان"، "ملت"، وغیرہ نے اس فتنہ کے خلاف مسلسل آواز اٹھائی۔ جابجا احتجاجی جلسے ہوئے۔ نگار کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اس کے ایڈیٹر کے خلاف مقدمے دائر کیے گئے۔ سب شہر لکھنؤ میں خاص طور پر بڑے احتجاجی جلسے ہوئے۔ اخبار "سچ" میں مولانا کا سلسلۂ مضامین اس تعلق سے برابر ہفتوں بلکہ مہینوں جاری رہا۔ بلکہ دوسرے مراسلے اس سلسلہ کے احتجاجی جلسوں کی روداد یں اور دوسرے اخبارات کے تائیدی مضامین کثرت سے نقل ہوئے۔ اور "فتنۂ نگار اور قوم کی آواز۔ قوم کا مجرم قوم کی عدالت میں" "اللہ کا مجرم اللہ کے بندوں کی عدالت میں"، "نیاز نقاب ہٹ جانے کے بعد"، وغیرہ کے مختلف عنوانات سے نکلے۔

نیاز شروع شروع میں بہت اکڑتے رہے۔ لیکن بالآخر ان کو توبہ نامہ پر دستخط کرنے پڑے۔ لکھنؤ کے جلسۂ عام میں جو توبہ نامہ ان کی طرف سے پیش ہوا تھا۔ اس کی لازمی شرط یہ تھی۔ کہ وہ اسے اپنے رسالے میں بھی نمایاں طور پر شائع کریں۔ اس شرط کی انھوں نے اچھی خاصی خلاف ورزی کی۔ اول توبہ نامہ ان الفاظ میں نہیں چھپا جو اصل جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں خاصی کتر بیونت کی گئی تھی۔ اور پھر اسے غیر نمایاں طور پر شائع کیا گیا۔ اور ہر پرچہ میں شامل بھی نہیں کیا۔ ان کی اس خاص بدعہدی پر مولانا اور دیگر حضرات نے سخت احتجاج کیا۔ اور اس کی سرگرم کوشش کی گئی۔ کہ ان کے خلاف توہین مذہب کی دفعہ کے تحت حکومت مقدمہ چلائے۔

نیاز صاحب نے توبہ کے بعد توبہ جس طرح نبھائی اس پر مولانا دریابادی کا مضمون "نگار کی تازہ فتنہ نگاریاں" کے عنوان سے ۲۷ نومبر کے سچ میں نکلا۔ اور ماہ نومبر کے نگار کے بعض مضامین کی نیازی عبارتوں کو نقل

کرکے یہ دریافت کیا گیا تھا کہ یہی الفاظ ہے ان صریح وعدوں کا کہ ..
آئندہ میری طرف سے ایسے مقالات کبھی شائع نہ ہوں گے جس سے مذہبی شکایت کا سبب پیدا ہو، نگار میں بھی آئندہ کسی قسم کے مذہبی مضامین درج نہ کروں گا۔"

اور نیاز صاحب کی اس کھلی ہوئی توبہ شکنی پر ان کو یہ عبارت لکھنی پڑی۔
"مدت ہوئی ایک غزل کا مطلع سنا تھا"،

ع کبھی بے توبہ ہم نے پی ہی نہیں   توبہ یوں کی کہ جیسے کی ہی نہیں

شعر شاید ریاض خیرآبادی کا ہے۔ شعر پر عمل جناب نیاز فتحپوری کے حصہ میں آیا اور عمل بھی ان حدود تک جہاں شاعر کی فکر رسا کی بھی رسائی نہ ہوئی ہو۔ شاعر غریب سے تو صرف اتنا ہو سکا اور وہ تھا تخیل کی دنیا میں کرے نوشی سے توبہ کرکے پھر سے نوشی شروع کر دیتا تھا۔ اس سے یہ بھی نہیں ہو سکا تھا کہ واقعات کے عالم میں بحالت ثبات د ہوش و سلامت حواس۔ جیتے جاگتے۔ دن دھاڑے سیکڑوں بھلے مانسوں کے مجموعہ میں ہزار با شریفوں کے اطمینان دہی کے لئے صاف و صریح لفظوں میں ایک پختہ تحریری وعدہ کرے۔ اور جب اس وعدے کے ایفا کا وقت آئے تو۔ توبہ یوں کی کہ جیسے کی ہی نہیں۔ شاعر کو بہرحال اپنی عزت اور اپنی شرافت کا پاس ہوتا ہے۔ یہ ننگ روز ازل سے اس ننگ اسلام ہستی کے لئے اٹھا رہا تھا کہ جسے کو اس پر ندامت و افسوس ہے کہ وہ مسلمان کے گھر میں کیوں پیدا ہوا۔ تاہم ضرورتاً و مصلحتاً اس پر بھی اصرار ہے کہ دنیا اسے مسلمان ہی شمار کرے۔ ہے کوئی جو علامہ نیاز فتحپوری کو اس تاریخی شرف و اعزاز سے محروم کر دے۔

بہرحال معاملہ اب پھر قوم کی عدالت میں ہے۔ ذرا فیصلہ ملت اسلامیہ کے ہاتھوں میں ہے۔ مسلمان کب تک اس ننگی دنگی کو اپنے ساتھ برداشت کرتے رہیں گے۔

اس کے بعد دوسرے پرچہ ۱۴ دسمبر میں مولانا کے بیچ باتوں والے صفحہ پر سیح کی ایک اور تحریر بعنوان " بدعہد دشمن اسلام " کے عنوان سے نکلی اور اسی پرچہ میں ان کا ایک بڑا مضمون " نیاز توبہ کے بعد " نکلا۔ پھر ۲۱ دسمبر کے بیچ میں بیچ باتوں والے صفحہ پر ان کی دوسری تحریر " بدسرشتوں کی سرشت " اور متعدد نوٹ ان کے قلم سے نکلے ہیں۔ جن میں اطلاع یہ بھی تھی کہ دیوبند ضلع سہارنپور کے ایک غیور مسلمان نے نیاز صاحب کے خلاف اس سلسلہ میں توہین مذہب کی دفعہ کے تحت مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ اس پرچہ میں مولانا کا ایک مقالہ " عذر گناہ " کے عنوان سے نیاز کے ایک جوابی مضمون کے جواب میں نکلا۔ اور ۱۸ دسمبر کے بیچ میں نیاز صاحب کے رسالہ کے ایک اور مضمون نگار (جو حق گو کے فرضی نام سے انکار حدیث کے مضامین نگار میں کثرت سے لکھا کرتے تھے۔ اور اس فتنہ کے خلاف تحریک شروع ہونے پر اپنے رجوع و توبہ کا پبلک اعلان کر چکے تھے۔) کا مضمون صفحہ اول پر " ایک حق گو کی حق گوئی " کے عنوان سے نکلا۔ اور خبر بھی چھپی کہ دہلی میں بھی عزیز حسن بقائی ایڈیٹر " پیشوا " نے نیاز صاحب کے خلاف ایک مقدمہ زیر دفعات ۲۹۵ (الف) اور ۲۹۸ دہلی کی ایک عدالت میں دائر کر دیا ہے۔ اور " بدعہد دشمن اسلام " کے زیر عنوان نیاز کی توبہ شکنی کے خلاف خطوط اور اخبارات کے مضامین نکلے اور اس توبہ شکن کے خلاف لکھنؤ میں ایک جلسۂ عام زیر صدارت منشی احتشام علی کاکوروی ہوا۔ جس میں نیاز صاحب کے خلاف ایک تجویز منظور کی گئی۔ اور ان کے خلاف موثر کارروائی کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کے کنوینر مولوی ظفر الملک علوی مقرر ہوئے۔

۱۹۳۳ء کے شروع کے بیچ میں بھی اس سلسلہ کی بعض چیزیں نکلیں اور اگرچہ نیاز صاحب کے خلاف قانونی کارروائی اس زمانہ [illegible] صاحب

کی افراط مروت کے باعث عمل میں نہ آسکی۔ لیکن نیاز صاحب کی مذہب کے خلاف بدلگامی خاصی کم ہوگئی۔

اس کے کئی سال بعد ۱۹۴۱ء میں نیاز صاحب پر الحاد کا دورہ پڑا۔ اور انھوں نے ایک مسیحی پادری ٹسڈیل کی کتاب ماخذ القرآن کا نہ صرف اردو ترجمہ جو اپنے رسالہ نگار میں چھاپا بلکہ انھوں نے اس خیال کی پوری تائید اپنے مضمونوں کے ذریعہ کی کہ قرآن وحی الٰہی اور منزل من اللہ نہ تھی۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے۔ ان کے ان مضامین کے خلاف مولانا نے اپنے اخبار صدق میں (جو اب سچ کے بجائے نکل رہا تھا) میں زوردار مضامین اور نوٹ لکھے اور ان کا ساتھ اسلامی ہند کے رسائل و اخبارات نے دیا۔ اور اس فتنہ کی پوری سرکوبی کی۔ ان نام نہاد دلائل کی پول کھول کر رکھدی جو اس سلسلہ میں نیاز کے قلم الحاد رقم نے پیش کئے تھے۔

غرض یہ کہ مولانا نے اپنی حق پسند طبیعت اور حق نگار قلم کا خامہ زور نگار کی بیخ کنی کے لئے صرف کیا۔ اور آخر بفضل ایزدی انھیں راہ حق میں کامیابی حاصل ہوکر رہی۔

انعامات۔ اعزازات و وظائف سرکاری

۱۔ ۱۹۶۹ء میں حکومت یوپی کی جانب سے اردو کے ادیب و خدمت گزار کی حیثیت سے ۵ ہزار روپیہ کا نقد انعام دیا گیا۔

۲۔ ۱۵ اگست ۱۹۶۵ء عربی کے فاضل کا ایوارڈ صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ملا۔ اعزاز خاص طور سے اپریل ۶۶ء صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے ہاتھوں دیا گیا۔

۳۔ ۱۹۶۷ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی آنرری ڈگری دی۔

۴۔ سرکاری طور پر حج بیت اللہ کو بطور نمائندہ حکومت ہند بھیجے جانے کی پیشکش۔ جو مولانا کی خود دار طبیعت نے گوارہ نہ کی۔

وظائف

۱۔ مولانا کو مالی اعانت کی خاطر مخلصوں کی خاصی تعداد وقتاً فوقتاً ہدیے اور نذرانے پیش کرتی رہی ہے۔

۲۔ حکومت حیدرآباد (نظام سرکار) کی جانب سے ۳۰۰ روپیہ ماہوار علمی پنشن ملتی رہی۔ جو بعد میں پولس ایکشن ہوتے ہی بند ہو گئی۔

۳۔ جب مولانا ابو الکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کی تحریک پر دوبارہ جاری جاری ہوئی تو کل ۱۲۵ روپیہ پر آ گئی۔

۴۔ ۱۹۶۰ء سے ہند سرکار نے عربی اسکالر کی حیثیت سے ماہانہ پنشن مقرر کر دی اس کی رقم آخر میں ۳ ہزار روپیہ سالانہ تک پہنچ گئی۔

۵۔ حکومت اتر پردیش کی طرف سے ۳ سو روپیہ ماہوار پنشن ملتی رہی۔

سفر اور سفرنامے

مولانا نے اپنی زندگی میں متعدد سفر کسی خاص مقصد، نیت اور مخصوص پروگرام کے تحت کئے تھے۔ اپنے ان تمام سفروں کی روداد انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں قلمبند کر گئے ہیں۔ ان کے یہ سفرنامے معلومات افزا بھی ہیں۔ اور ادبی نقطۂ نظر سے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ کے سفروں کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

۱۹۱۲ء یعنی اوائل عمر میں ایم اے کلاس میں داخلہ لینے کی غرض سے علی گڈھ تشریف لے گئے۔ وہاں زیادہ جی نہ لگا اور کورس کی ایک کتاب دستیاب ہی نہ ہوئی اس لئے واپس آگئے۔

۱۹۱۳ء میں امتحان دینے کی خاطر الہ آباد گئے۔ اس لئے کہ علی گڈھ اس وقت تک محض کالج تھا یونیورسٹی قائم نہ ہوئی تھی۔

۱۹۱۴ء میں ایم۔ اے کرنے کے لئے دہلی گئے۔ سینٹ اسٹیفن کالج میں داخلہ لیا۔

۱۹۱۲ء کے آخر میں والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے ایم۔ اے کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس لکھنؤ آگئے۔

۱۹۱۵ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی دعوت پر کانفرنس میں بطور لٹریری اسسٹنٹ کام کرنے کے لئے علی گڈھ گئے۔ طبیعت نے ملازمت کا بار برداشت نہ کیا۔ اس لئے دو ہی مہینے میں خرابی صحت کا بہانہ کرکے استعفیٰ دے کر واپس آگئے۔

۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے محکمہ سررشتہ تالیف و ترجمہ میں بحیثیت مترجم کام کرنے کے لئے حیدرآباد گئے۔ ملحدانہ خیالات کی وجہ سے اختلافات پیدا ہوئے اس لئے آخر جولائی ۱۹۱۸ء تک مشکل سے نباہ کیا اور پھر چھٹی لے کر لکھنؤ واپس آگئے۔

۱۹۲۶ء میں نظام دکن کی خدمت میں حیدرآباد حاضر ہوئے۔ ۲۵ سنٹ تک حضور نظام کی باریابی حاصل رہی۔ ۱۲۵ روپیہ پنشن تاحیات منظور ہوئی اور

اور کام یہ سپرد ہوا کہ مولانا شبلیؔ کی طرح کتابیں لکھیں اور ان کو سلسلۂ آصفیہ سے منسوب کرتے رہیں۔

۱۹۵۰ء میں افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرنولی مرحوم نے مدراس مدعو کیا۔ یہاں قرآنی موضوع پر چھ لکچر دیئے۔ جو بعد میں کتابی شکل میں شائع بھی ہوئے۔

۱۹۷۱ء میں لکچروں کی دوسری فرمائش آنے پر پھر مدراس تشریف لے گئے۔ اور مشکلات قرآن۔ یا قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں؛ اس موضوع پر تقریریں کیں جو کتابی شکل میں شائع ہوگئیں۔

۱۹۲۹ء میں سفر حج بیت اللہ کی نیت سے حجاز مقدس کا سفر کیا۔ اور اپنے سفر کی تفصیلات اور حج کی روداد کو سفر حجاز کے عنوان کے تحت نہایت دلکش انداز میں کتابی شکل میں پیش فرمایا۔

۱۹۵۴ء میں گورنر جنرل پاکستان ملک غلام محمد مرحوم کی دعوت پر لاہور و کراچی کا سفر کیا۔ آپ کی اہلیہ محترمہ اور داماد ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی بھی ساتھ تھے ایک ہفتہ کراچی میں اور تین روز لاہور میں قیام کیا۔ اس سفر کی روداد "ڈھائی ہفتہ پاکستان میں" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئی ہے۔

۱۹۵۸ء میں بین الاقوامی مذاکرہ میں بحیثیت قائد ہندوستانی وفد شرکت کرنے کے لئے لاہور تشریف لے گئے اس سفر میں بھی ڈاکٹر ہاشم قدوائی کو ان کے سکریٹری ہونے کا شرف حاصل رہا۔

۱۹۵۵ء میں اپنے مخلص ہم وطن حاجی عبدالقیوم اور ان کے بھائی محمد امین مالکان امینیہ ہوٹل کی دعوت پر کلکتہ کا سفر کیا۔

۱۹۵۱ء میں مولانا مناظر احسن گیلانی سے ملنے کی غرض سے گیلان کا سفر کیا۔ حضرت مولانا عبدالباری بھی شریک سفر تھے۔۔۔ تھانہ بھون۔ اعظم گڑھ۔ علی گڑھ دہلی کے علاوہ آپ نے بھوپال کا بھی سفر کیا۔ وہاں جاکر حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب سے شرف ملاقات حاصل کیا اور اپنے تاثرات بڑے عقیدتمندانہ انداز

میں تحریر فرمائے۔ ان کے یہ تمام سفر ہر اعتبار سے یادگار کہے جا سکتے ہیں۔ عمر کے آخری دس بارہ سال کثرت ضعف اور ادبی مشاغل کے باعث دریاباد ہی میں عزلت گزیں رہے۔ بالآخر ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ اناللہ الخ

مولانا عبدالماجد کی علالت مرض کی رفتار اور سفر آخرت کا حال

مولانا عبدالماجد ان باکمال ہستیوں سے تھے۔ جن کی شخصیت اور علم و دانش کے تمام گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالنا آسان کام نہیں۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی علم و ادب۔ قرآن و سنت کی خدمت میں گزار دی۔ اور بہت کچھ خدمت کی تمنا لے کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کی ذات درحقیقت مجموعۂ کمالات تھی۔ یہ تادم آخر صحافت ادب۔ مذہب اور زبان کی دنیا میں اپنے زور قلم کا مظاہرہ کرتے رہے۔ ۵ جنوری ۱۹۷۷ء کو ان کی رحلت اچانک طور پر نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ ایک طویل علالت میں مبتلا رہے۔ مولانا محترم پر سب سے پہلے فالج کا حملہ ۱۳ مارچ یوم جمعہ ۱۹۷۵ء کو بعد مغرب ہوا۔ جب کہ وہ معمولی کے مطابق کھانا کھا رہے تھے۔ علاج اولاً ڈاکٹری ہوا۔ مرض کی شدت میں کچھ کمی نظر آئی۔ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ بعد لکھنؤ آئے پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا ہومیوپیتھک علاج شروع کیا۔ مرض کا حملہ دائیں طرف تھا۔ لیکن اس کے دو ڈھائی ہفتے بعد صدق کے لئے دو چار نوٹ کسی نہ کسی طرح لکھنے لگے تھے۔ مرض میں ایک حد تک نفع ہو کر وہ ایک حال پر ٹھیر سا گیا تھا۔ اس حالت میں ۱۹۷۵ء گزرا ۱۹۷۶ء گزرا۔ ۱۹۷۶ء بھی گزرا۔ ان کا قیام کبھی دریاباد رہتا کبھی لکھنؤ میں

اس اثنا میں ایک بار دارالمصنفین جس سے مرحوم کا تعلق بہت قدیم تھا اور اس کے ابتدائی ممبروں میں سے اب صرف یہی زندہ رہ گئے تھے۔ کے جس کے جلسۂ انتظامیہ کی شرکت میں اعظم گڈھ اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی کے جلسہ کنونشن میں شرکت کے لئے علی گڈھ کا بھی سفر کیا۔ اور بعض چھوٹے چھوٹے سفر بارہ بنکی اور بڑے گاؤں کے بھی کئے۔

آخری بار رمضان دریاباد میں گزارے۔ اور پورا قرآن مجید مہینہ بھر میں تراویح میں باوجود انتہائی ضعف کے بلاناغہ سنا۔ عید کے چند روز بعد وہ دریاباد سے جہاں کا قیام وہ کسی حال میں نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ بڑی حد تک مستقل قیام کے قصد سے لکھنؤ آئے یہاں وسط اکتوبر ۱۹۷۵ء میں دفعتاً شب میں گر پڑنے کے باعث کولہے کی ہڈی ٹوٹنے کا سانحہ پیش آیا۔ اس حادثہ نے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا۔ حادثہ کے دوسرے ہی دن ہڈی کے علاج کے ماہر ڈاکٹر نے بڑی چابکدستی سے پلاسٹر چڑھا دیا۔ اور اس وقت سے وفات تک مولانا کی ساری دنیا ایک کمرے، اور ایک کمرے میں بھی، ایک ہی پلنگ بلکہ چوبی تخت پر محدود ہو کر رہ گئی۔ دائیں طرف پلاسٹر لگا ہوا تھا۔ اس لئے صرف بائیں طرف کروٹ لے سکتے تھے۔ اور تکیہ کے سہارے کسی حد تک بیٹھ سکتے تھے۔ اس حال میں اکتوبر کا بقیہ مہینہ گزرا۔ نومبر گزرا اور دسمبر بھی۔ رفتہ رفتہ اجابت کا نظام معطل ہو گیا۔ پیشاب کی بھی اکثر زیادتی رہتی تھی۔ جو کوئی ملنے آتا تھا مولانا بڑی حسرت سے فرماتے تھے کہ میری زندگی بس اس تخت تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ تھوڑا بہت لکھنے کا جو کام کسی نہ کسی طرح صرف کر لئے کر لیتے تھے، اس حادثہ کے بعد اس کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اور اب تو انھیں قلم سے دستخط تک کرنے میں سخت زحمت ہونے لگی۔ شروع دسمبر میں ماہانہ بخشش کے فارم پر دستخط بڑی مشکل سے کئے۔ اسی دوران دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کی مجلس انتظامیہ کا ایجنڈا موصول ہوا جس میں مہمان کا انتخاب بھی تھا۔ اس فارم پر دستخط اردو میں کرتے تھے۔ بار بار کوشش کے بمشکل ایسے دستخط کر سکے جن کا پڑھنا بہت دشوار تھا۔

اپنی اس بے بسی اور معذوری پر بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

جسمانی معذوریاں

مرض فالج کے باعث آپ مختلف جسمانی معذوریوں کا شکار ہو گئے تھے۔ پھر بھی دسمبر اکتوبر ۱۹۷۶ء تک کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ لکھنے میں غیر معمولی تکلیف اور پریشانی محسوس کرنے لگے۔ بسا اوقات جملے نامکمل رہ جاتے تھے۔ اور غلط الفاظ خصوصاً ملے جلے الفاظ کی صورت میں نکل جاتے تھے۔ ان کی تحریریں بھی زیادہ صاف نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنے قلم سے خطوط کا جواب لکھتے تھے۔ اور پھر اپنی منجھلی صاحبزادی سے صاف کراتے تھے۔ یا اصل تحریر کے نیچے وہ اس عبارت کی نقل کر دیتی تھیں۔ لیکن بڑی لوٹنے کے حادثہ کے بعد تحریر کا یہ سلسلہ بالکل ختم سا ہو گیا۔ آخر مرض فالج سے قبل دونوں آنکھیں بہت کمزور ہو چکی تھیں۔ خصوصاً دائیں آنکھ۔ جنوری ۱۹۷۶ء میں موتیا بند کا آپریشن کیا گیا۔ اس کے لئے انھیں کچھ عرصہ تک میڈیکل کالج کے اسپتال میں رہنا پڑا۔ اسپتالی زندگی کا ان کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ وہ اس تجربے پر اور اپنی آنکھ کے آپریشن کے بارے میں اپنے خاص رنگ میں صدق میں کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ مگر افسوس کہ دماغی توازن کے روز افزوں انحطاط کے باعث اس ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور اسی طرح بہت سی تحریری ارادوں کو پورا نہ کر سکے۔ نہایت افسوس اور حیرت کے لہجہ میں بار بار فرماتے تھے۔ کہ کون کہہ سکتا ہے کہ اب میرے لئے چند سطریں لکھنا دشوار ہو جائے گا

علالت کے دوران معمولات

فالج میں مبتلا ہونے کے بعد بھی مولانا نے اپنے معمولات کی پابندی جہاں تک بن پڑی جاری رکھی۔ روزانہ بعد عصر ملاقات کا سلسلہ جاری رہا شدید علالت کے شروع کے چند دنوں کو چھوڑ کر پنج وقتہ نماز با جماعت کی پابندی جاری رکھی۔ کئی ماہ تک نماز مغیام دریابادی میں گھر والی مسجد میں

اور زمانۂ قیام لکھنؤ میں گھر سے قریب ماموں بھانجے والی قبر کی مسجد میں نماز مغرب با جماعت پڑھتے رہے۔ اور نماز جمعہ بھی انہی دو مساجد میں ادا کرتے رہے۔ لیکن آخر کے چند ماہ پیشاب کی غیر معمولی زیادتی اور اس کے روکنے پر قادر نہ ہو سکنے۔ نیز بڑھتی ہوئی کمزوری کے باعث مسجد کی حاضری ترک ہو گئی۔ گھر میں پنج وقتہ نماز باجماعت پڑھتے رہے۔ اس کا سلسلہ ہڈی ٹوٹنے تک جاری رہا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب آخر تک ان کے معالج رہے۔ درمیان میں ڈاکٹر بدیع الزماں اشرف کا بھی علاج رہا۔

فالج کا دوسرا حملہ اور رحلت

آخر دسمبر ۱۹۷۶ء میں فالج کا نیا حملہ ہوا۔ اس کا اثر زبان پر خاص طور سے ہوا۔ اور ساتھ ہی دماغی قوتیں ضعیف تر ہو گئیں۔ اور اب جو کچھ فرماتے تھے۔ اس کا بڑا حصہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اور اکثر دوسروں کی بات بھی سمجھ نہ پاتے تھے۔ اس صورت حال کی وجہ سے قدرتاً انہیں ناگواری جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ اور بعض وقت ملنے والوں کو پہچاننے سے قاصر رہتے تھے۔ قبض کی شکایت متواتر رہنے لگی تھی۔ وفات سے پانچ چھ روز قبل بالکل غفلت سی طاری ہو گئی۔ اور آخری الفاظ جو ان کی زبان سے نکلے اور سننے والوں کی سمجھ میں آ سکے۔ خدا حافظ اور اللہ کے تھے۔

وفات سے چند روز قبل ہڈی کا پلاسٹر کھول دیا گیا تھا۔ جس وقت پلاسٹر کھلا وہ بے ہوش اور حد درجہ غافل تھے۔ غفلت کے دوران بار بار ہاتھ کان تک اٹھاتے اور اس کے بعد نیچے لا کر نماز کی طرح نیت باندھتے۔ بالآخر ۵ر جنوری ۱۹۷۷ء کی رات میں دو بجے طبیعت زیادہ ناساز ہوئی اور سوا چار بجے روح راہیٔ جنت ہو گئی۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

نماز جنازہ۔ تجہیز و تکفین

مولانا کی وفات کی خبر ریڈیو اور اخبار کے ذریعہ ملک بھر کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔ مولانا علی میاں ندوی کو ان کی وصیت کے مطابق رائے بریلی اطلاع دی گئی تاکہ وہ نماز جنازہ پڑھائیں۔ مولانا علی میاں ندوی تشریف لائے اور اول وہی

نمازجنازہ پڑھائی ۔غسل کے سارے مراحل علی احمد ہاشمی نے انجام دیئے ۔
ساڑھے گیارہ بجے کفن پہنا کر باہر لایا گیا ۔ اور ۱۶ جنوری کو بعد نماز ظہر مولانا
علی میاں کے آنے پر نماز جنازہ ندوہ کے وسیع میدان میں ہزاروں کے مجمع کے
ساتھ ادا ہوئی ۔ اس کے بعد جنازہ بس پر رکھا گیا اور "بس" نماز مغرب سے
قبل دریاباد پہنچ گئی ۔ قصبہ اور آس پاس کے دیہاتوں میں اعلان کر دیا گیا
تھا ۔ قبر وغیرہ تیار رکھی گئی تھی ۔ تدفین میں شرکت اور آخری دیدار میت اور کاندھا
دینے کے لئے اتنا بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا ۔ کہ دریاباد میں اس سے قبل کبھی دیکھنے میں
نہیں آیا تھا ۔

بستی کے ہندو مسلمان ۔ بوڑھے نوجوان سب قصبہ دریاباد کے نام کو ملک اور ملک
کے باہر روشن کرنے والے اس آفتاب کے روپوش ہونے پر گریہ کناں نظر آ رہے تھے ۔
جوار کے لوگ بھی بڑی تعداد میں آ گئے تھے ۔ اور جنازہ مکان سے مڈل اسکول
کے وسیع فلڈ میں پہنچایا گیا ۔ جہاں دریاباد کے مرد بزرگ حافظ غلام نبی صاحب
نے نماز جنازہ پڑھائی اس کے بعد مکان سے متصل مولانا کو سپرد خاک کر دیا گیا ۔
قبر میں اتارنے کی سعادت ان کے داماد اور بھتیجے حکیم عبدالقوی کو حاصل ہوئی ۔
اسی مقام پر دفن کرنے کی وصیت مولانا نے فرمائی تھی ۔ زندگی میں ایک بار
جب مولانا علی میاں ندوی دریاباد تشریف لائے تھے ۔ تو مولانا کے مدفن کی
مجوزہ جگہ جو مولانا کے کمرے سے متصل تھی فرمایا تھا کہ اس مزار کا مجاور حقیقی
معنوں میں میں ہی ہوں ۔

علالت بیماری اور مرض کی داستان

حضرت مولانا مرحوم پر رجب ۱۹۷۵ء میں فالج کا حملہ ہوا۔ تو وہ سن رسیدہ ہونے کے باعث اور کثرت ضعف کی وجہ سے بالکل معذور سے ہوگئے۔ اس مرض اور معذوری کی تفصیلات وہ اکثر صدق جدید کے کالموں میں تحریر فرماتے رہے ان میں سے چند کے اقتباسات درج ذیل ہیں . . .

علالت کے تعلق سے ایک دعا

(ایک خط اور اس کا جواب)

آں مکرم کی علالت کی خبر سے بڑی تشویش ہے۔ خدا کرے بہت جلد صحت یابی ہو جائے۔ آمین ... کہ ملت کو ضرورت ہے۔
آں جناب مدظلہٗ کے قلم کی۔
مولانا طیب قاسمی مدظلہٗ کی زبان کی۔
مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کے فکر کی۔
رئیس التبلیغ مولانا انعام الحسن مدظلہٗ کی سعی کی۔
اور شیخ الحدیث مولانا ذکریا مدظلہٗ کے ذکر کی۔

طالب دعا:۔ ابن غوری۔ ایم۔ اے (دکن)

صدق:۔ بجز نمبر اول کے اور ساری فہرست سے بالکل اتفاق ہے۔ آمین

مریض کی راہ

(عبدالماجد)

بعد مغرب کھانا کھا لیتا ہوں۔ آج کل ۸ بجے رات تک عشاء کی نماز سے فارغ ہوا نو۹ سے قبل سو جاتا ہوں۔ لیکن کم سے کم تین مرتبہ پیشاب کرنے کے لئے اٹھنا ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی چار پانچ بار بھی۔ اور پھر نیند مشکل سے آتی ہے۔

پچھلے چند ہفتوں میں دو چار بار یہ ہوا کہ چہرہ تمتما اٹھا۔ اور کان تک سرخ ہو گئے۔ اور یہ کیفیت دس پندرہ منٹ طاری رہی۔ پھر ٹھیک ہو گئی۔

کیلا قبض میں مفید ہوتا ہے۔ تین کیلے روزانہ کھانے سے قبض دور ہو جاتا ہے۔ اور اجابت ہو جاتی ہے۔ بغیر اس کے قبض رفع نہیں ہوتا۔ حافظہ عملاً بالکل غائب ہے۔

آنکھوں کے ڈاکٹر نے کہلا بھیجا ہے۔ کہ جب تک لکھنے پڑھنے کی عینک ٹھیک نہیں ہو جاتی ذرا لکھنے پڑھنے کا کام نہ کریں۔ ایسی عینک ملنے میں ابھی دو تین ہفتہ کی دیر ہے۔ ۷۶ء

بیماری کی داستان
بیمار کی زبان سے

از ــــــــــ عبدالماجد دریابادی)

قرآن مجید کی سب سے چھوٹی اور سب سے آسان سورت کون سی ہے۔ لیکن یقین مانئیے کہ ایک رات کو عشاء کے وقت اس کا نام کسی طرح یاد نہیں پڑا۔ اِنَّآ اَعْطَیْنٰكَ الْکَوْثَرَ نام کسی طرح بھی یاد نہیں پڑا۔ اور یہ اتفاق محض ایک ہی بار نہیں بار بار ہوا۔ اَرَ اَیْتَ الَّذِیْ شاید اس سے کچھ ہی دشوار ہو۔ لیکن یہ اتفاق نسیان اس کے ساتھ بھی ہو کر رہا۔ سورہ البقر کا آخری رکوع اٰمَنَ الرَّسُوْلُ مشہور ترین رکوع ہے۔ لیکن یہی اتفاق نسیان اور فراموشی اس کے ساتھ ایک بار نہیں۔ بار بار پیش آچکا ہے۔
مثالیں کہاں تک سنئے گا۔ اور یقین بھی خدا معلوم کب تک آئے گا پارہ ۲۳ شروع سے لیکر آخر تک حفظ تھا۔ اور تین پاروں (۲۷ - ۲۸ - ۲۹) کا بیشتر حصہ بھی از بر تھا۔ اور اس پر فخر و ناز تک کا دعویٰ تھا۔ مگر اس کا انجام بھی یہی رہا۔ اور حفظ کو فراموشی میں تبدیل ہوتے دیکھ لیا۔
قرآن مجید اور البیات کو چھوڑیئے۔ اردو کے عام روزہ کے الفاظ لکھنے میں جو دشواری پیش آئی ہے۔ الاستگر اسناد اشارات دونوں سے دماغ جواب دے چکا۔ اور سب سے بڑا یہ ہے کہ اپنے عزیزوں کو فوراً نام لے کر نہیں سکتا۔ صحیح نام لینے میں ہلا ایک منٹ لگ جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ فالج کا اثر جسم کے نصف دائیں حصّہ پر ہے۔ ایک ہاتھ پیر ٹانگ آنکھ وغیرہ ان کی تکلیفیں ایک حد تک بار ثابت ہو رہی ہیں۔ لیکن اس جسمانی اذیت کو کوئی نسبت اس دماغی اذیت سے نہیں جو ہر وقت پیش آتی رہتی ہے۔ صدق ۱۹ اپریل ۱۹۷۶ء

مریض کا روزنامچہ

از ——— عبدالماجد دریابادی

علاج بدستور ڈاکٹری ہو رہا ہے۔ پیشاب کی اب ویسی زیادتی نہیں ہے پھر بھی رات میں کبھی دو اور کبھی تین بار اٹھنا پڑتا ہے۔ دن میں بھی بعض اوقات بڑی بے تابی سے محسوس ہوتا ہے۔ بصارت کا ضعف اور زیادہ ہو گیا ہے۔ ثقل سماعت کا بھی وہی حال ہے۔ شروع جنوری میں لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں آنکھ کا اپریشن وہاں کے ایک ماہر ڈاکٹر گرگ کریں گے اس سلسلہ میں اسپتال میں وارڈ لے کر قیام کرنا ہوگا۔ پیر میں احساس ابھی بہت کم ہے۔ پیر سے چپل نکل جاتی ہے۔ اس کا احساس نہیں ہوتا۔ پیر کے نیچے درد اب بھی بہت ہوتا ہے۔ بعض اوقات لعاب دہن کی کثرت اب بھی ہو جاتی ہے۔

عید الاضحیٰ کے بعد دریاباد سے لکھنؤ کا سفر سینجر ٹرین سے کیا۔ ٹرین ڈھائی گھنٹہ لیٹ لکھنؤ پہنچی۔ اسٹیشن پر بیٹھے بیٹھے اور پھر ٹرین پر بیٹھے بیٹھے بہت تکان ہو گیا۔

صدق ۱۶ دسمبر ۱۹۷۵ء

وصیت نامۂ ماجدی

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے دوران حیات ایک وصیت نامہ کئی سال قبل لکھدیا تھا۔ اور پھر اس میں کچھ تبدیلیاں بھی کرتے رہے۔ آخری بار لکھا ہوا یہ وصیت نامہ بعض ٹکڑوں کو (جو بعض خانگی حیثیت تقسیم ترکہ وغیرہ کی رکھتے ہیں) چھوڑ کر ذیل میں تحریر کیا جاتا ہے۔

کلماتِ وصیّت

(۱) پیدائش ۱۶ مارچ سنہ ۱۸۹۲ء (اغلباً ۱۵ مارچ کی ہے مطابق شعبان سنہ ۱۳۱۰ھ وصیت نامہ لکھ ڈالنے کا خیال مئی سنہ ۱۹۵۲ء مطابق شعبان سنہ ۱۳۷۱ھ میں پیدا ہوا۔

چنانچہ خوب خیال ہے کہ روتی ہوئی آنکھوں اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک مسودہ گھسیٹ دیا۔ اس وقت سن ۶۰ سال کا تھا۔ پانچ سال بعد اسے کالعدم کر کے فروری سنہ ۱۹۵۷ء رجب سنہ ۱۳۷۶ھ میں دوسرا قلمبند کر دیا۔ عمر نے طوالت کھینچی۔ تیسری بار نظرثانی اور ترمیم کے بعد نوبت ۲ مئی سنہ ۱۹۶۰ء کو لکھنے کی آئی۔ یہ مسودہ بھی فرسودہ ہو گیا۔ آج ۶ ستمبر سنہ ۱۹۷۲ء (۲۷ رجب سنہ ۱۳۹۲ھ) کو یہ مسودہ چوتھی بار لکھ رہا ہوں اب اپنی عمر کے اسی ۸۰ ویں سال میں ہوں بحساب سال شمسی۔

بھائی صاحب نے دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء میں دفعتہً انتقال کیا۔ دل تو ٹوٹنے کو یہی صدمہ کیا تھا کہ محبوب بیوی شروع جنوری سنہ ۱۹۶۹ء میں اپنے میکے بارے میں بالکل دفعتہً ،، سفرِ آخرت ،، پر روانہ ہو گئیں۔ اس نے تو مجھ کو بالکل ہی بٹھا دیا۔

چنانچہ آج تک ہنسی اس کے بعد سے ہونٹوں پر نہیں آئی ہے۔ اور اب امید اور انتظار اس کا رہنے لگا ہے۔ کہ دیکھئے کب اس سرور کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔

(۴) جنازہ پڑھانے کے لئے نمبر اول مولانا علی میاں ندوی کو رکھتا ہوں وہ نہ ملیں تو مولانا فارقلیط (ایڈیٹر "الجمعیۃ") مولانا محمد اویس ندوی۔ ورنہ پھر کسی صالح مسلمان کو بھی۔ دریا بادوالوں میں حافظ غلام نبی بھی اچھے ہیں۔ مدفن کے لئے اصل تمنا یہ تھی کہ (حرمین شریفین کے بعد) جگہ کسی مسجد کی عین دہلیز کے نیچے ملتی۔ بلا علامت قبر کے گویا زمین دوز تاکہ نمازی اس کے اوپر سے گزرتے رہتے۔ لیکن اس تمنا کا پورا ہونا مشکل ہی ہے اس لئے دو تین جگہیں تجویز کئے دیتا ہوں۔

(۱) والدہ ماجدہ کی قبر کی پائیتنی۔ مگر وہاں اب جگہ کہاں ہے۔

(۲) اپنے مکان سے متصل حضرت مخدوم محمد ابکش درگاہ کے اندر اپنے احاطہ کی دیوار سے متصل۔

(۳) اس پرانے قبرستان میں جو میاں نعیم نعمانی کے مکان سے متصل ہے۔ انھیں کی دیوار سے لگ کر۔ قبر پختہ نہ ہو تو بہتر ہے۔ بارش وغیرہ سے حفاظت کے لئے ٹین کی چادریں ڈالی جاسکتی ہیں۔ قبر پر نام کے بجائے یہ آیتیں ضرور لکھ دی جائیں۔

(۱) وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ۔ (۲) قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝

اپنے مخلصین سے طمع اس کی رکھتا ہوں کہ دعائے مغفرت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ اگر ہر روز تین بار سورہ اخلاص کا معمول بنایا جاسکے تو سبحان اللہ۔۔۔

صالحین خصوصاً مولانا محمد زکریا صاحب (سہارن پور) مولانا محمد طیب صاحب (دیوبند) اور مولانا فارقلیط صاحب الجمعیۃ والے۔ سے دعائے مغفرت ضرور کرائی جائے۔

سے اگر وقت موعود وطن سے باہر کہیں آجائے تو وہاں سے

لاشہ لانے کی زحمت وطوالت خوانخواہ نہ گوارہ فرمائی جائے۔

(نمبر ۳ کا تعلق خانگی امور سے ہے اس لئے اس کو یہاں سے حذف کیا جاتا ہے)

(۴)

دل میں آرزوئیں ہزاروں ہیں۔ اور حسرتیں بے شمار اپنا اعتراف تو مجھ سے ناشکرے کو بھی کرنا پڑے گا کہ اللہ نے اس عمر تک اپنے ہر طرح کے لطف وکرم سے نوازے رکھا۔ اور ہر قسم کی نعمت سے سرفرازی دی۔ اپنے استحقاق وقابلیت سے بڑھ کر اپنے کمال ستاری سے خلق میں رسوا ہو جانے سے بچائے رکھا۔ آخرت تو یہ صفت ستاری کہیں بڑھ چڑھ کر ہو گی۔ وہاں کیسے کیسے اپنے فضل وکرم سے محروم رکھے گا۔

بھروسا، سارا ناز، سارا اعتماد بس اس ایک ذات پر ہے جس نے اپنا نام اَلْعَفُوُّ بھی بتایا ہے اور اَلْغَفُوْرُ بھی اور اَلْغَفَّارُ بھی۔ اور جس نے بے شمار شہادتیں بھی اس کی اپنے سچے رسول کے ذریعہ امت تک پہنچا دی ہیں۔ ورنہ اپنے اصل حال کے لحاظ سے تو جی بے اختیار یہی چاہتا ہے کہ زمین پھٹے اور اس میں سما جاؤں۔ اور مخلوق میں سے کسی کو اپنا چہرہ نہ دکھاؤں۔ اتنے دن جیا نہ حقوق اللہ کی ادائیگی کی توفیق ہوئی اور نہ حقوق العباد کی۔

عزیزو، مخلصو، رفیقو، بس اب اللہ حافظ . . .

یغفر اللہ لنا ولکم۔ انشاء اللہ العزیز ملاقات جس میں کسی قسم کا خلل نہیں پڑے گا۔ اب جنت ہی میں ہو گی۔

۱۔ مولانا عبدالماجد اہل علم و صاحب فکر دانشوروں کی نظر میں

۲۔ مولانا عبدالماجد قریبی رشتہ داروں کی نظر میں

مولانا عبدالماجد دریابادی اہل علم و صاحب فکر دانشوروں کی نظر میں

مولانا محترم کے انتقال پر ملال پر ہندوستان ہی نہیں تمام دنیا کے گوشہ گوشہ سے اہل و ادب نے اظہار تعزیت کے بیانات جاری کئے۔ ان تحریروں سے جہاں عقیدت و احترام کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہاں یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ مولانا ماجد کا مقام اہل نظر کی نظروں میں کتنا بلند و بالا تھا۔ ان تحریروں کے اقتباسات درج ذیل ہیں -

(۱) پروفیسر رشید احمد صدیقی

(جو خود ۹ دن کے بعد راہی ملک عدم ہو گئے)

کل اخبار میں مولانا عبدالماجد صاحب مرحوم و مغفور کے سانحۂ رحلت کی خبر پڑھی۔ مرحوم کی وفات سے کتنی وہ طویل قیمتی اور لونوع بہ نوع خدمات کی یاد تازہ ہو گئی۔ جس پر مرحوم کی گراں قدر شخصیت اثر انداز رہی تھی۔ مذہب و اخلاق ادب و تنقید معاشرت و صحافت کی کون سی وادیاں نہ تھی جس سے مرحوم خوشی خاموشی سنجیدگی اور قابلیت سے نہیں گزر چکے تھے۔ گذشتہ نصف صدی سے اوپر مرحوم کو جو طویل اور زرین زمانہ ہمارے نواح کی جیسی جلیل و عظیم شخصیتوں سے متاثر ہونے اور متاثر کرنے کا ملا وہ شاید اب کسی کو نصیب نہ ہو۔ وہ ایک نشان منزل تھے جس کو انھوں نے ہمارے علم و دانش اور تہذیب و ثقافت کے راستے میں بہت دور تک لاکر نصب کر دیا تھا -

مرحوم کی علمی، مذہبی، ادبی اور اخلاقی خدمات کی تفصیل پیش کرنا ابھی تو کیا بہت دنوں تک ناممکن رہے گا۔ مرحوم و مغفور اب وہاں پہنچ چکے ہیں جہاں ان کا معاملہ اللہ جل شانہ کے ساتھ ہے۔ لیکن ہماری ذمہ داری بھی کچھ کم نہیں ہے۔ کہ مرحوم کی دینی خدمات کا تفصیلی اور بطریق احسن جائزہ لیں تاکہ وہ آئندہ نسلوں کی رہبری اور سیرت افزائی میں معاون ہو۔ یہ سطور لکھ رہا تھا کہ محسوس ہوا جیسے دریاباد تاریخی اعتبار سے جیسا کچھ ہو اب مرحوم ہی کے نام سے وابستہ ہو گیا ہے۔ یہ امتیاز اس صدی میں اور ہمارے ہی دیار کے کسی اور کے حصہ میں شاید ہی آیا ہو۔

(۲) سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب

ناظم دارالمصنفین اعظم گڈھ

آج یکایک ریڈیو سے خبر ملی کہ مولانا اللہ تبارک و تعالیٰ کی آغوش رحمت میں ہیں۔ دل یہ کہہ رہا ہے کہ جس سے اسلام کی سطوت اور شوکت تھی وہ اس دنیا سے جاتا رہا۔ اردو ادب کو جس سے رفعت نزاکت اور لطافت ہوئی وہ آج ہم سے چھین لیا گیا۔ دارالمصنفین کو جس کی ذات گرامی سے قوت تھی وہ اب نہیں رہا۔

(۳) میر غلام رسول نازکی (سری نگر)

آخر کار ہونی ہو کر رہ گئی۔ آج صبح آل انڈیا ریڈیو نے حضرت مولانا مرحوم و مغفور کے انتقال کی خبر دی۔ اور میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ خود وہ سالہا سال سے اس کے لئے تیار تھے۔ اور موت کے

آئینہ میں رخ دوست کو دیکھ کر زندگی دشوار سمجھ رہے تھے ۔ اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے ۔ کچھ عرصہ پہلے مجھے آیت کریمہ وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ سے القاء ہوا تھا کہ جس کے اعداد ۱۳۹۶ء ہیں ۔ اور مجھے حضرت مولانا کے بارے میں ایک مجہول سا احساس بھی تھا ۔ کہ یہ تاریخ انھیں کے شایان شان ہے کہ میرا اندازہ درست ثابت ہوا ۔ مجھے حضرت مولانا نے مسلمان بنایا ہے ۔ اور نہ معلوم میری ہی طرح کتنے گمراہ ان کی تحریروں سے راہ راست پر آئے ہونگے ۔

(۴) ارباب فکر ۔ النادی العربی دارالعلوم دیوبند

(ایک تعزیتی جلسہ میں درج ذیل قرارداد پیش کی گئی)

آج مورخہ ۷ جنوری ۱۹۷۷ء کی صبح کو آل انڈیا ریڈیو کی اطلاع پر کہ ہندوستان کے مشہور بزرگ صحافی اور ادیب بے مثال ۔ علم وفضل کے خزانے کا گوہر ۔ شب چراغ اخلاق وفضائل کا پیکر ۔ مفکر قرآن ۔ مدیر صدق جدید حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کی لکھنؤ میں وفات ہوگئی ۔

اس خبر روح فرسا سے دارالعلوم دیوبند میں ۔ رنج والم کی لہر دوڑ گئی ۔ اور فوراً تعزیتی جلسہ کیا گیا ۔ جس میں حضرت مولانا مرحوم کی صحافتی اور علمی خدمات کو سراہا گیا ۔ جو انہوں نے ہندو بیرون ہند کے مسلمانوں اور ملک وملت کے لئے انجام دی ہیں ۔

(۵) محمد عبدالرحمٰن نوروی صاحب (مکہ معظمہ)

" واقعی عالم اسلامی کی عظیم شخصیت اس دنیا سے اٹھ گئی ۔ دینی علمی ۔ ادبی یا سیاسی کسی بھی میدان میں اپنے پُراثر قلم کا سکہ جمائے رکھا تھا ۔

دینی یا دنیوی کوئی مسئلہ ہوا تو اپنے قلم سے دینی رنگ میں بڑے دلپذیر اور نہایت عجیب و غریب انداز میں سمجھا دیتے۔ پتہ نہیں کتنی تصانیف کتنی تحریریں اور بے شمار صفحات انھوں نے لکھے ہوں گے۔ جنھوں نے تمام عالم اسلام کو متاثر کئے بغیر نہ رکھا ہوگا۔ خاص کر اسلام کے مخالفین اور فرنگیوں کے خلاف ان کی تحریریں بڑی لاجواب ہوتیں۔ ہفتہ وار صدق جدید" اسی رنگ میں رنگا ہوا ہوتا۔ غیران کے ان کارناموں اور دینی خدمات کے متعلق تو کوئی صاحب علم اور اہل قلم ہی لکھ سکتا ہے۔ انھوں نے بیشتر حصہ اپنی عمر کا اسلام کی خدمات میں صرف کیا اور عمر کے آخری حصہ میں بھی۔ جب کہ وہ نہایت معذور ہو چکے تھے۔ ان کی جدائی ایک کبھی نہ پر ہونے والے خلاء کو چھوڑ گئی ہے۔ ایسے خوددار با ہوش اور مخلص عالم اور قلم کے دھنی کی مثال بہت کم ہی دنیا میں مل سکتی ہے۔

(۶) نجم الحسن خیرآبادی

• مولانا محترم عبدالماجد کے حادثۂ رحلت کی المناک خبر نظر سے گزری۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

افسوس کہ ایک ماہر اہل قلم۔ یکتائے روزگار انشا پرداز اور علم و ادب کے روشن چراغ سے دنیا محروم ہو گئی۔ دنیائے فانی کی بوالعجبی دیکھئے۔ پھر جس نے کل تک عالم اسلام کے مشاہیر علم و فضل کے مرثیے لکھے آج خود اس کا مرثیہ لکھا جا رہا ہے۔ جس نے ہر ضرورت کے موقع پر موت اور لعبد الموت کے معاملات یاد دلائے۔ اب وہ خود اپنے مولیٰ کے حضور پہنچ چکا ہے۔

(۷) مولوی محمد تقی عثمانی رسالہ البلاغ (کراچی پاکستان)

مولانا دریابادی کی ذات برصغیر میں کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب۔ بلند پایہ صحافی۔ صاحب تصنیف فلسفی اور اردو انگریزی کے مشہور مفسر قرآن تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی فلسفہ کے گمان آباد میں بسر ہوئی۔ اور وہاں سے وہ دین اور دینی عقائد کے بارے میں شکوک و شبہات میں ایسے مبتلا ہوئے کہ مدتوں الحاد و تشکیک کا شکار رہے۔ لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے ایسی توفیق دی کہ قرآن و سنت کی صداقت و حقانیت واضح ہوئی۔ فلسفہ کا خمار اترا۔ عقل و عقلیت کے فریب کھلے تصوف کا رنگ چڑھا۔ اور بالآخر مل و اسپنسر کا یہ شیدائی خانقاہ تھانہ بھون کے ایک بوریہ نشیں (حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے آگے دو زانو ہو گیا۔ ان کا اخبار جو پہلے سچ پھر صدق اور آخر میں صدق جدید کے نام سے نکلتا رہا۔ اپنے طرز کا منفرد اور نرالا جریدہ تھا۔ جسے کتابت و طباعت کی ظاہری خوشنمائی عمر بھر نصیب نہ ہو سکی۔ لیکن مولانا دریابادی کے قلم کی حلاوت ایسی تھی۔ کہ اسے شروع کر کے ختم کئے بغیر چھوڑ دینا اہل ذوق کے لئے مشکل تھا۔ وہ اپنے اداریہ میں جو "سچی باتیں" کے زیر عنوان ہوا کرتا تھا، عموماً کسی ایک موضوع پر لکھنے کے بجائے دنیا بھر کے اخبارات و رسائل کے تراشے نقل کرتے۔ اور ہر تراشے کے ساتھ اپنا مختصر تبصرہ ایک دو سطروں میں کر دیتے۔ لیکن یہ ایک دو سطریں مفصل اداریوں پر بھاری ہوتی تھیں۔ ان کا قلم صحیح معنی میں بے باک اور نڈر تھا۔ انھوں نے جس بات کو درست سمجھا اس کے اظہار میں ان کو نہ کبھی حکومت کا خوف دامن گیر ہوا اور نہ عوام یا رائے عامہ کا۔ وہ آخر تک اپنی رائے کا اظہار بے خوف و خطر کرتے رہے۔ خواہ اس کے نتائج کچھ بھی ہوں۔

(۸) ڈاکٹر سید احتشام ندوی صدر شعبۂ عربی (کیرالہ)

مولانا دریابادی کی شخصیت اردو ادب اور اسلامی لٹریچر پر تناور درخت کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ مولانا نے اصلاحی احساسات و جذبات کو ۶۰ برس تک اردو ادب کے قالب میں ڈھالا ہے۔ وہ اب سیاست۔ اشخاص۔ واقعات اور کتابوں پر ہر ہفتہ تبصرہ کرتے۔ مگر یہ تبصرے درحقیقت ان کے اسلامی احساسات کے عکاس ہوتے تھے۔ مولانا نے ایک عظیم الشان لٹریچر کو جنم دیا ہے۔ جو فلسفہ سے لے کر صحافت تک پر محیط ہے۔ اتنی تہ دار۔ متنوع اور جامع شخصیات مشکل سے وجود میں آتی ہیں۔ مولانا کی شخصیت اس سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ آپ نے ایسے گاؤں میں بیٹھ کر جس طرح علم و ادب۔ دین و ثقافت کی خدمت کی ہے۔ زبان و اسلوب۔ کے جس طرح جلوے۔ دکھائے ہیں۔ اردو صحافت کو جس طرح نکھارا اور سنوارا ہے۔ حسن نگاری کو جس طرح آگے بڑھایا ہے۔ اور فکر و فن کا جس طرح مظاہرہ کیا ہے۔ وہ اردو اور اسلامیات کے موضوعات کو حیات ابدی بخشنے کے لئے کافی ہے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

(۹) محمد سلیم مدرسہ صولتیہ (مکہ مکرمہ)

حضرت مولانا کی وفات پوری امت اور پورے ملک کا نقصان ہے۔ افسوس ہے کہ ہم سب ایک بے حد عظیم اور صاحب علم و فضل ہستی سے محروم ہوگئے۔ جس نے تقریباً نصف صدی تک اپنے علم و تحقیق سے دنیا کو روشن کئے رکھا۔

افسوس ہے کہ آج اپنے قلم سے ان کو مرحوم لکھنا پڑ رہا ہے۔ خدمت دین۔ ادب نوازی اور اپنی عظیم شخصیت کے بیش نظر اور اپنے آثار باقیہ کے لحاظ سے مولانا زندہ رہیں گے۔

(۱۰) سید محمد سلمان ندوی فرزند علامہ سید سلیمان ندوی رح صدر شعبہ اسلامیات ڈربن یونیورسٹی ڈربن (جنوبی افریقہ)

یہاں کسی کو کیا معلوم اور کس کو کیا بتاؤں کہ سیدی الاجل مولانا عبدالماجد دریا بادی کے انتقال پر ملال سے ہم نے کیا کھو دیا۔ ذاتی طور سے میرے لئے یہ غم والد مرحوم کے غم سے کم نہیں، والد مرحوم کا غم تازہ ہو گیا۔ مولانا مرحوم کی شفقت اور محبت اب کہاں تلاش کروں۔ والد مرحوم کے انتقال کے بعد سے مولانا مرحوم سے اور قریب ہو گیا تھا۔ ان کے خطوط اس بات کے شاہد ہیں کہ انھیں میری کتنی فکر تھی۔ امت کے لئے یہ حادثہ اور بھی سخت ہے۔ امت مسلمہ کو کاش یہ احساس ہو سکے۔ کہ انھوں نے کتنا انمول ہیرا کھو دیا۔ میں مرحوم کی بے باکی و نڈر حق گوئی۔ حق شناسی اور سادگی سے متاثر تھا۔ ان کا قلم اسلام کے دماغ میں شمشیر براں تھا۔ آہ کہ وہ تلوار ٹوٹ گئی۔ ۔ ۔

والد مرحوم کے ساتھ ان کی تنہا محفلیں یاد آتی ہیں۔ پھر جب والد مرحوم کے انتقال کے بعد جب بھی دریا باد جانا ہوتا گیا وہاں یہ ضیافتیں ہوتی تھیں۔ مولانا کی علمی و ادبی اور تاریخی حیثیت تو احباب ہی بہت ہوئیں گے میں تو اتنا جانتا ہوں کہ میں از سرِ نو یتیم ہو گیا۔

سرِ رفتہ باز آید کہ ناید   نسیم از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے آں فقیرے   دگر دانائے راز آید کہ ناید

(۱۱) عبدالرحمٰن بزمی (لندن)

حضرت مولانا مرحوم کی وفات ایک عظیم سانحہ اور ملت اسلامیہ کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو علم وکمال اور طویل عرصۂ حیات کی نعمتوں سے نوازا تھا۔ اور مرحوم نے ان نعمتوں کا بیشتر حصہ خدمت دین وملت کے لئے وقف کر رکھا۔ یہ ان کے شکران نعمت کی برکت تھی کہ انھوں نے علمی وتحقیقی میدان میں تن تنہا وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے جس کی تکمیل کسی ادارہ یا انجمن ہی سے مکمل ہو سکتی تھی۔ مولانا مرحوم معارف اسلامیہ اور علوم حاضرہ کا مجمع البحرین تھے۔ مفسر وشارح قرآن کریم۔ اردو کے مایہ ناز محقق۔ ممتاز انشاء پرداز اور منفرد طنز نگار تھے۔ ان کی وفات سے علم وفضل کی ایک انجمن معدوم ہو گئی ہے۔ اور تاریخ کے ایک پورے باب کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ مولانا مرحوم کا نام نامی اور ان کے علمی وادبی کارنامے انشاء اللہ العزیز زندہ رہیں گے۔

(۱۲) نواب حافظ احمد سعید خاں آف چھتاری (علیگڑھ)

مجھے اخبار سے معلوم کر کے سخت صدمہ ہوا۔ کہ وہ چراغ راہ کہ جو اپنی روشنی میں ملت کی رہنمائی کر رہا تھا۔ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ اور ملت کے رہنما حضرت مولانا عبدالماجد صاحب مرحوم ومغفور اپنے رب کے پاس چلے گئے۔ مجھے اس خبر سے سخت صدمہ ہوا۔ فقط

مولانا مرحوم کا خاندان ہی نہیں حقیقت میں پوری قوم سوگوار ہے۔

(۱۳) محمد یوسف صاحب بٹلہ (کراچی)

"سچی بات تو یہ ہے کہ امت اپنے ایک بہترین مفکر بڑے ہی غمگسار اور بے باک ناقد سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔ آخر سب کے لئے فنا ہے۔ مگر کامیاب ہے وہ جانے والا جو اپنے آقا کو راضی کرکے جائے"

(۱۴) محمد عبدالوحید خاں ایم۔اے۔ایل ایل بی

عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد

اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز صحافی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نامور گریجویٹ مولانا عبدالماجد دریابادی ایک طویل مدت تک اردو زبان وادب کی خدمت گزاری کے بعد جسمانی حیثیت سے ہم سے جدا ہو گئے ہیں ۸۵ سال تک جس طرز نگارش اور منفرد اسٹائل کے باعث جس انداز تحریر کا ثبوت دیا۔ آن بان سے وہ تحریر کو کچا کر موڑ دیا کرتے تھے۔ طنز ومزاح کے جو نشتر چلاتے سلیس اردو جو بہت معیاری ہوئی اور مخصوص انداز کے باعث حیرت انگیز ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں سارے ہندوستان میں ایسی منفرد تحریر کا مالک شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ مولانا کو خدا نے خاص مقصد کے لئے پیدا کیا تھا۔ خاص طرز سے تحریر لکھوائی۔ نئی نسلوں کے سامنے ان کی تحریر کے نمونے تحریر کے دستاویز ہیں۔ اردو برتنے اردو لکھنے اور تحریر کو موڑ دینے کا انداز مولانا کا اپنا انداز تھا۔ قرآنی تفا۔ اور تصانیف اور اسلامیات پر ان کی خامہ فرسائیاں ان کی خشناق کے لئے کافی ہے۔ ہندومت دستور وفلسفہ کے مطالعہ سے وہ پھر اسلام

کی طرف رجوع ہوئے تھے۔ انھوں نے کھل کر بے خوف ہو کر اس کا اظہار کیا ہے۔ یہ بڑے دل گردے کا کام ہے۔ وہ اعلیٰ پایہ کے صاحب طرز ادیب صحافی۔ انشا پرداز اور مفکر تھے۔ ان کا ہفت روزہ صدق۔ ان کی منکسر المزاجی۔ ان کی تحریر کی چاشنی۔ حلاوت اور تحریر کے دم خم کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ عبرت خیز اور سرشار کر دینے والی طرز نگارش مولانا کا حصہ تھی۔

صدق جدید میں خبروں پر تبصرہ اور صدق جدید کے پہلے صفحے پر قرآنی عبارت۔ "جو سچ پر یقین رکھتے ہیں وہی فلاح پانے والے ہیں۔" کے ذریعہ مولانا نے زندگی بھر سچ کی تبلیغ کی۔ ساری اردو دنیا ان کے سچ کی قائل اور معترف تھی۔ اردو تحریر کا دل موہ لینے والا انداز آج مر چکا ہے۔ مگر اپنے نمونۂ تحریر اور تحریری جولانیاں۔ باجمین دبے لاگ دبے خوف بل کے لادے اپنے دریابادیت کا وہ جیتا جاگتا سچا ثبوت چھوڑ گیا ہے۔

(۱۵) جگن ناتھ آزاد (سری نگر)

آخر وہ گھڑی آہی گئی جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ کیا بتاؤں کہ جب ریڈیو سے یہ خبر سنی۔ تو دل و دماغ کا کیا عالم ہوا۔ ایسا لگا جیسے ایک ایک دور کا خاتمہ ہو گیا ہو۔ یوں تو میں مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم کے ہزاروں لاکھوں نیازمندوں میں ایک تھا۔ لیکن جتنی شفقت وہ مجھ پر فرماتے تھے۔ اور جس قدر محبت کا اظہار کرتے تھے۔ وہ ہندوستان پاکستان ان کے کم نیازمندوں کے حصہ میں آئی ہوگی۔ آج میرا ان کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے اب میری کوئی کتاب شائع ہوگی۔ تو میں ان جملوں کو ترستا رہ جاؤں گا۔ جو مولانا عبد الماجد کے قلم سے نکلے تھے۔ اور جو حقیقت میں وہ سند اور سرٹیفکیٹ کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن دوسرا رشتہ جو جسم کی قید سے آزاد ہے۔

انشاءاللہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ مولانا نے ہندوستان کی (جس میں ایک مدت پاکستان بھی شامل رہا۔) دوستوں کی ذہنی اور مذہبی خدمت کی ہے۔

(۱۶) محمد امجد علی صدیقی۔ کریم نگر (دکن)

اس طویل عرصہ میں مولانا کی شخصیت کے کئی پہلو دیکھنے میں آئے۔ اور سبھی ایک سے بڑھ کر ایک پائے گئے۔ کیا تفسیر کیا حدیث۔ کیا تاریخ کیا جغرافیہ کیا نفسیات کیا سوانح مگر میری نظر میں مولانا کی شخصیت بحیثیت ایک ادیب کے سب سے بڑھ کر اعلیٰ و ارفع ہے۔ اور پھر بحیثیت طنز نگار ان کے معاصرین ہی کیا پچھلے لوگوں میں بھی بہت کم اس مقام کو پہنچ جاتے ہیں۔ انگریزی میں ... مشہور طنز نگار گزرا ہے۔ مگر بلاغت کے اعتبار سے ہمارے مولانا اس کو منزلوں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے واقعات سے معنی خیز نتیجے برآمد کرنا اور با اعتدال بھرپور وار کرنا اس طرح کہ گویا ایک سرجن مادۂ فاسد کو نکال پھینکتا ہے۔ وہ انھیں کا کام تھا۔ مجھ کو علم میں یہ اہلیت نہیں کہ ان کے کسی بھی علمی پہلو کو اجاگر کرسکوں۔ قلمی خاکو میں ان کا جواب نہیں۔ اور کئی تعزیت نامے مثلاً ابوالکلام آزاد۔ مناظر احسن گیلانی۔ سید سلیمان ندوی وغیرہ پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ ان کی جیتی جاگتی اور منہ بولتی تصویر ہے۔ جو بھی چاہے اس کو آج بھی پڑھ کر دیکھ لے۔

(۱۷) مولوی غلام محمد صاحب حیدرآباد (کراچی)

اس ذرۂ بے مقدار کو علمی و دینی طبقہ میں متعارف کرنے کا بڑا ذریعہ حضرت مولانا مرحوم ہی کی ذات اقدس تھی۔ حضرت کے شفقت ناموں کا ایک ذخیرہ ان کی محبت ایک سند ہے۔ افسوس کہ ایک بلا حق گو۔ ایک پرسوز ہمدرد

اور ایک صاحب نظر چارہ جو سے ملت اسلامیہ محروم ہوگئی ۔ جنھوں نے حضرت مولانا دریابادی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی تصنیفات میں دیکھا ہے ۔ وہ ان کے کمالات ذاتی کو کچھ نہیں سکتے ۔ وہ ایک مومن ۔ خاشع ۔ ایک متوکل ۔ ایک مستغنی کامل ایک بے ریا اور غیر اللہ سے بے پروا حقیقی معنی میں صوفی انسان تھے ۔ حضرت مرحوم کی ذات پر ایک دور کمالات ختم ہوگیا ۔ وہ اپنے دور کے اہل کمال کی آخری نشانی تھے ۔

(۱۸) مولانا ابو اللیث ندوی سینٹرل جیل بریلی

قومی آواز کے ذریعہ حادثہ فاجعہ کی اطلاع ملی إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۔ آپ کے ساتھ پوری ملت تعزیت کی مستحق ہے ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے بہترین انعامات سے نوازے ۔ مولانا کے کمالات خصوصیات کے ساتھ ان کی وہ نوازشیں بھی اس موقع پر یاد آرہی ہیں ۔ جو وہ مجھ پر فرمایا کرتے تھے ۔

(۱۹) مولانا عتیق الرحمن سنبھلی مدیر الفرقان مقیم لندن

مولانا کو اللہ نے عمر طبعی سے نوازا ۔ پھر کافی دن پہلے ایسی صورت کردی گئی ۔ کہ ہم لوگ مولانا کی عدم موجودگی کے لئے تیار ہو جائیں مگر ان چیزوں سے یہ حادثہ ذرا بھی ہلکا نہیں ہوا ۔ کم از کم میرا تو یہی احساس ہے اللہ ہمیں مولانا کا بدل عطا فرمائے ۔ اتنی چیزیں اللہ نے ایک ذات میں جمع کردی تھیں ۔

(۴۰) مالک رام نئی دہلی

یہ واقعہ ہے کہ میں جب پچھلے مہینہ لکھنؤ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ اور ان سے جو باتیں ہوئیں۔ اور ان کی جو حالت دیکھی اسی دن سے مجھے اندیشہ تھا کہ یوں تو قادر مطلق جو چاہے کرسکتا ہے۔ لیکن بظاہر یہ جھلملاتی شمع ہیں۔ آخر وہی ہوا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔ میرے ان سے گذشتہ ربع صدی سے تعلقات تھے۔ جو میری کتاب عورت اور اسلامی تعلیم پر ان کے تبصرے سے شروع ہوئی۔ بحمدہٖ اس پچیس سال میں کئی مرتبہ اختلاف رائے کے باوجود وہ ہمیشہ مجھ پر مہربان رہے۔ اور بزرگانہ توجہ فرماتے رہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

علم و ادب کی دنیا کا جو نقصان ہوا ہے اس کا اندازہ تو کس کو ہوگا۔ زمانے کا چلن بدل گیا۔ حسن و قبح کے معیار بدل گئے۔ نئی پود کلاسیکی ادب کی قائل ہی نہیں رہی۔ ان حالات میں ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ ان کے صحیح مقام کے معترف ہوں گے۔ امید موہوم ہے۔

(۴۱) عبداللطیف صاحب اعظمی جامعہ ملیہ (نئی دہلی)

مولانا مرحوم کی شخصیت میں ایسی گوناگوں خصوصیات تھیں کہ جیسے لوگ صدیوں میں کسی ملک و قوم میں پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا ایک منفرد طنز نگار۔ ایک صاحب اسلوب ادیب۔ دین و مذہب کے مخلص و جاں نثار خدمت گزار اور مسلم دانشوروں اور مفکروں میں ایک امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ ان جیسا ادب اور اسلام اور اسلامی تہذیب

اسلامی اخلاق۔ اسلامی صفات پر جان دینے والا اب بھلا کہاں ملے گا۔ برصغیر ہند و پاک سے معتبر شخصیتیں اٹھتی جا رہی ہیں۔ اور ان کی جگہ لینے والا کوئی پیدا نہیں ہوتا۔ خصوصاً ملت اسلامیہ میں مسلمانوں میں پہلے ہی قحط الرجال تھا۔ تھوڑی بہت جو شخصیتیں رہ گئی تھیں۔ اور جن سے ملت کا وقار اور بھرم قائم تھا۔ رفتہ رفتہ ہم ان سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ع کوئی محرومی سی محرومی ہے۔

(۲۲) پروفیسر آل احمد سرور (علی گڑھ)

مولانا نے اچھی خاصی عمر پائی۔ اور یہ ساری عمر نہایت باقاعدگی پابندی وضع اور وزن و وقار کے ساتھ مذہبی۔ علمی۔ ادبی اور صحافتی سرگرمیوں میں گزاری۔ ظاہر کہ قرآن کی تفسیر اردو اور انگریزی میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ جو نہ صرف ان کی بہترین یادگار ہے بلکہ ایک لازوال روشنی کا پیام ان کا صدق جدید اردو کے ایسے جواہر پارے رکھتا ہے۔ جن کی عظمت مسلم ہے۔ پھر ان کی علمی کتابوں کے علاوہ محمد علی ذاتی ڈائری اکبرنامہ۔ ہم آپ کو اردو ادب کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔ مولانا کو لغت نویسی سے خاص دلچسپی تھی پچاس کا ذاتی علم ہے۔ اگر ان کو دوسرے کاموں سے وقت ملتا تو وہ اکیلے ایک اچھی خاصی لغت تیار کر سکتے تھے۔ مولانا کے نقطۂ نظر سے بعض لوگوں کو اختلاف تھا۔ اور میں بھی بعض معاملات میں ان سے متفق نہ تھا۔ جس کا ان کو بھی علم تھا۔ لیکن یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ سبھی مولانا کے علم و فضل اور ان کے بلند ادبی درجہ کا احترام کرتے تھے۔ مولانا کے انتقال سے ہمارے بزرگ اردو اور عالموں میں ایک ایسی ممتاز اور بلند پایہ کی شخصیت کی کمی ہو گئی جس کا بدل اب ایک امر محال۔

(۲۳) مسلم احمد نظامی ایم۔ اے (دہلی)

آخر وہ منحوس خبر سن ہی لی جو ہماری بد قسمتیوں کا ثبوت ہے ۔حضرت مولانا کے نام کے ساتھ مرحوم و مغفور کے الفاظ کیسے لکھے جائیں گے۔ ایک مجاہد اللہ کو پیارا ہوا ۔ ملت نے ان کی خدمات کو زندگی بھر سراہا۔ تو اب تو وہ زندۂ جاوید ہو گئے۔

اللہ نے مغفرت ان کے لئے مخصوص کرالی تھی ۔ وہ ملت کا نادرالوجود سرمایہ تھے ۔ ان کا جسم گیا مگر روحانی فیوض سے مستفید ہونے کا موقعہ اب آیا ہے ۔ اس آفتاب عالم کے غروب ہونے سے اندھیرا ہو گیا ہے ۔

(۲۴) مخلص بھوپالی ۔ بھوپال ۔

مولانا نے پچہتر سال کے لگ بھگ اپنے قلم کے جو ہر دکھائے وہ بلا شبہ علم و فن کے فرمانروا تھے ۔ مرحوم کیا نہیں تھے ۔ عظیم صحافی ، ایک غم گسار ۔ ایک حق گزار دوست ۔ انجمن ادب کے آفتاب ۔ معلم اخلاق اور مفسر قرآن سب ہی کچھ تو تھے ۔ اور اب یہ خلا کبھی پورا نہ ہو سکے گا۔

(۲۵) مولوی عبدالماجد زاہد۔ رامپور

افسوس علم و دانش کا آفتاب غروب ہو گیا ۔ ایک عالم جلیل اور صاحب طرز قلم کار دنیا سے رخصت ہو گیا ۔ مولانا کا وفات سے دنیائے دین و دانش میں خلاء پیدا ہو گیا ہے ۔ بظاہر اس کا پورا ہونا ممکن نظر نہیں

آیا۔ مولانا کا سانحۂ ارتحال ایک قومی و ملی حادثہ اور پوری ملی دنیا کا نقصان ہے

(۲۶) مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو۔ حیدرآباد

آخر مولانا دریابادی بھی وہاں چلے گئے۔ جہاں ایک دن ہم سب کو جانا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور اپنے پیچھے ایک ایسا عظیم الشان علمی ذخیرہ چھوڑ گئے۔ جس سے مسلمان مدتوں رہنمائی حاصل کریں گے!

(۲۷) مولانا جمال میاں فرنگی محل۔ کراچی۔

مولانا علم و فضل فقر و سادگی کا ایک بے نظیر و دلکش نمونہ تھے ان کے اوصاف کا خلاصہ لکھنے کے لئے ایک ضخیم کتاب بھی کافی نہیں۔ چند سطریں کیا احاطہ کر سکتی ہیں۔

(۲۸) صوفی نذیر احمد کاشمیری

مولانا عبدالماجد صاحب کے متعلق مرحوم و مغفور لکھتے ہوئے دل ایک خلا اور ساتھ ہی ایک جھٹکا محسوس کرتا ہے۔ مولوی صاحب قدیم و جدید جوڑ کے قریب ہی ایک مختصر سی رصدگاہ بنا کر عمر بھر کے لئے وہاں مقیم ہو گئے تھے۔ خالص ملی نقطۂ نگاہ سے جدید و قدیم کے توازن پر نگاہ رکھنا ان کی زندگی کا قریباً مقصد بن گیا تھا۔ محمد علی۔ ابوالکلام۔ اقبال اور اکبر الہ آبادی کے بعد جس جامع سیرت و فکر کے لوگوں پر نظر پڑتی تھی مولوی عبدالماجد ان

میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ کسی بھی چیز کے حسن و قبح کا معیار ان کی نگاہ میں ملت محمدی کا صحیح مفاد تھا۔ اس سلسلہ میں ان کی اتنی جامع کہ شاید ہی اس مفاد کا کوئی پہلو ہو جو ان کی نگاہ سے مخفی رہ سکے۔ مولوی صاحب عملاً تو وہابی تھے۔ اس لئے انہوں نے صاحب رزم و بزم بننے سے ہمیشہ عمر بھر اجتناب کیا۔ لیکن فکری طور پر ملت اسلامیہ کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو مولوی صاحب کی نگاہ سے پوشیدہ رہ جائے۔ وہ اگر عملاً بے ہمہ تھے۔ تو فکراً نہایت درجہ باہمہ تھے۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(۲۹) جناب مظفر گیلانی آئی۔اے۔ایس۔پٹنہ

سبھی جانتے ہیں کہ مولانا اسلامیات کے ایک جید عالم اور دنیائے علم و ادب میں بہت ہی بلند مقام رکھتے تھے۔ ان کی طرز تحریر خاص ان کی اپنی تھی جس کو نہ پہلے کسی نے اختیار کیا تھا۔ اور نہ بعد میں اپنا سکا انداز بیان ایسا انوکھا کہ پڑھتے جائیے اور کوئی تھکن محسوس نہ ہو انشا پردازی میں اپنا جواب آپ تھے۔ طنز نگاری اس کے تو گویا شہنشاہ ہی تھے۔ اور عنوانوں کے قائم کرنے میں تو کوئی ان کا ثانی آج تک کوئی ہو ہی نہ سکا۔ جہاں تک ان کی اسلامی تصنیفات خصوصاً تفسیر ماجدی کا تعلق ہے۔ میرے لئے ان پر کچھ لکھنا چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی رحلت سے اسلامیات اور دنیائے علم و ادب میں ایک ایسا خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ اب وہ نہ جانے کب بھر سکے گا۔ زمانہ قریب میں تو مجھ کو اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ ایک جامع انسان ملنا اب مشکل ہے۔ جو ایک ہی وقت میں انگریزی

عربی اردو۔ فارسی کا عالم ہو۔ جس کی تحریر کا ایک عالم گرویدہ ہو۔ جو صحافت کی دنیا میں بلند مقام رکھتا ہو۔ جس کی طنز نگاری بے مثال ہو۔ جو قرآنیات کا در بدر عالم ہو۔ جس کی تفسیر لاکھوں کے لئے مشعل راہ بنی ہو۔ جس کا دل امت کی بھلائی اور بہبودی کے لئے برابر دھڑکتا رہتا ہو۔ اور سب سے بڑھ کر جو سچا عاشق رسول ہو۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے کسی کو اس کا احساس ہو یا نہ ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مولانا دریابادی کی موت ایک المیہ ہے۔

(۷۰) چودھری مبارک علی خاں (نلگنڈہ) دکن

مولانا نہ ہلال بن کر آئے اور نہ بلاغ بن کر پہنچے۔ وہ تو سپیدۂ سحر کی طرح اندھیروں سے نکل آئے اور ہر طرف اجالے بکھیر دئے۔ کیا ادب۔ کیا نثر۔ کیا تحریر کیا تنقید۔ کیا سیرت۔ کیا تفسیر۔ کیا فلسفہ۔ کیا کلام۔ کیا تذکرہ۔ کیا صحافت۔ کیا ڈائری نویسی۔ کیا سوانح نگاری۔ ہر گوشہ کو چمکا اور مثالی بنا دیا۔ اردو ادب کے سینہ پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔ مولانا کا ہر لفظ ارات کی تاریکیوں۔ (الحاد و دہریت، اور خدا بیزاری کی ظلمتوں) میں جگ مگ جگ مگ کرتا ہوا تارہ ہے۔ جو ہر بھولے بھٹکے کا راہنما ہوتا ہے۔ اور تارے کبھی بے نور نہیں ہوا کرتے۔ مولانا کا دل ہر چیز کی حقیقت جاننے کے لئے بے چین رہتا تھا۔ مکالمات برکلے اور فلسفۂ اجتماع یا جذبات اس کے گواہ ہیں۔ پھر جب نظر صحیح اور نفس مطمئنہ نے حقیقت کو پالیا ہر چیز کی سچائی کو پالیا اور ہر بات کی صداقت کو جان لیا۔ تو وہ اپنے رب حقیقی کی طرف خوشی خوشی چلے آئے۔ اور پھر راضیۃ مرضیۃ اپنے رب سے جا ملے۔ سچ اور صدق اس کے شاہد ہیں۔ وہ آخری دم تک تشکیک والحاد کے کرب و بے چینی اور یقین و ایمان کی خنکی اور دلبری سے انجانوں اور بے خبروں کو آگاہ کرتے رہے۔ اور جو کچھ ان پر گزری۔ وہ سب قارئین

صدق کو سناتے رہے سچی بات یہی ہے کہ .....

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مولانا ماجد اپنے والوں یعنی قریبی رشتہ داروں کی نظر میں

مولانا موصوف کے انتقال کے بعد ان کے چند قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں نے ان کی شخصیت و خدمات کے تعلق سے اپنے تاثرات تحریر کئے ہیں۔ ان کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔ ان تحریروں سے مولانا ماجد کی زندگی، سیرت اور شخصی اوصاف پر بڑا احسن روشنی پڑتی ہے۔

ابّا

از ـــــــــــ عبدالرب محمد سلیم قدوائی دریابادی

[یہ مضمون مولانا کے نواسے عبدالرب قدوائی ایم۔اے۔پی۔ایچ ڈی کا ہے جس میں ایک حد تک مولانا مرحوم کے ماتمی مضامین کے اسلوب کی اچھی خاصی جھلک پائی جاتی ہے۔]

موت ناگزیر ہے لیکن بعض مرنے والوں کے ساتھ ایک پورا عہد ختم ہو جاتا ہے۔ پوری تاریخ دفن ہو جاتی ہے۔ ابّا مرحوم ان معنوں میں ان ہستیوں میں تھے جو اس فانی دنیا میں اور زیادہ آتا رہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ماضی کو حال سے جوڑنے

والی زنجیر ٹوٹ گئی۔ ابّا کی موت ایک فرد واحد کی موت نہیں۔ بلکہ ایک انجمن ایک ادارہ کا اجڑ جانا ہے۔ شخصی نہیں بلکہ ایک قومی و ملی سانحہ ہے۔ ایک ایسا خلا ہے جس کا پُر ہونا ناممکن ہے۔ ایک ایسی نعمت سے محرومی ہے جس کا نعم البدل محال ہے۔

ابّا کی شخصیت اتنی ہمہ گیر نافع ہوئی تھی کہ ان کی عظیم المرتبت کے ہر ہر پہلو پر ایک کتاب تصنیف کی جاسکتی ہے۔ ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا جاسکتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک صاحب طرز ادیب وانشا پرداز۔ بلند پایہ صحافی۔ مفسر قرآن و محقق و نقاد اور عالم باعمل تھے۔ جس میدان میں بھی انھوں نے قدم رکھا۔ اس میں اپنے مخصوص طرز اسلوب کا سکہ جمایا۔ علم وادب۔ دین و مذہب کی ہر بزم میں وہ میر محفل اور صدر نشین رہے۔

ابّا ایک رنگا رنگ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ذات مختلف بلکہ متضاد خصوصیات کا دلکش امتزاج تھی۔ وہ گرم بھی تھے اور نرم بھی۔ وہ سنجیدہ فلسفی بھی تھے۔ اور لطیف مزاج کے مالک بھی۔ وہ کٹر زاہد ہونے کے باوجود دنیا سے بیزار نہیں تھے۔ اگر ایک طرف ان کے مزاج میں جاہ وجلال تھا۔ تو دوسری طرف سراپا شفقت و محبت تھے۔ انتہائی سادہ زندگی گزارنے کے باوجود ان میں شاہانہ انداز بھی پائے جاتے تھے۔

ابّا ایک کامل العیار انسان تھے۔ ان کی شخصیت بڑی متوازن اور دل آویز تھی۔ وہ ان اعلیٰ اقدار کے اور روایات کے حامل تھے۔ جس پر انسانیت کو ناز ہے۔ وہ اس تہذیب کا دلکش نمونہ تھے۔ جس کے نقوش بڑی تیزی سے دھندلے پڑتے جارہے ہیں۔ وہ قدیم و جدید کا حسین سنگم تھے۔ اور اس گھنے اور سایہ دار درخت کے مانند تھے۔ جس کے تلے پہنچ کر سکون و طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اس بہتے ہوئے چشمے کے مانند تھے جس کے شفاف و شیریں پانی سے ہر تشنہ لب بلا تفریق ملت سیراب ہوسکتا تھا۔ وہ ایسا روشنی کا مینار

تھے، جو تاریکی میں بھٹکے ہوئے انسانوں کو صحیح سمت پہنچانے میں مدد دیتا تھا وہ ایک بہترین گائڈ تھے۔ جس کی رہنمائی میں بلا کھٹکے نہایت اعتماد کے ساتھ منزل تک پہنچا جا سکتا تھا۔ ابا کی پوری زندگی نظم و ضبط میں ڈھلی ہوئی تھی اس قدر منضبط اور نظام اوقات کی پابند زندگی شاید ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ آخر عمر میں اعضاء کے جواب دینے کے باوجود وہ اپنے معمولات پورے کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ وہ کام کو عبادت سمجھتے تھے۔ اور خدا بھی نہ تھا ان کی صحیح مذہبیت میں نفرت و تعصب کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان کی دینی پختگی کر ختگی سے ناآشنا تھی۔ وہ دکھاوے کے مخالف اور صلح و مسالمت کے پابند تھے وہ نازک سے نازک حالات میں بھی سچی باتیں کہنے کا حوصلہ اور سلیقہ رکھتے تھے وہ ایک نڈر بے باک و جری صاحب قلم تھے۔ وہ ہر اچھی اور معقول بات کی تعریف کرتے اور اس کو سراہتے تھے، خواہ وہ ان کے مخالف کی ہی کیوں نہ ہو اس طرح وہ غلط بات کی مخالفت کرتے خواہ وہ ان کے عزیز دوست اور قریبی رشتہ دار کی ہی کیوں نہ ہو۔ اس سلسلہ میں انھوں نے نفع نقصان کی کبھی قطعی پرواہ نہیں کی۔ صدق گوئی دردمندی۔ دلسوزی۔ اخلاص و صداقت وضعداری۔ انصاف پسندی۔ کشادہ دلی۔ علم دوستی۔ خوش مزاجی۔ جرأت و بے باکی۔ مقصد کی لگن اور اس سے وفاداری اور رفتار و گفتار کی ہم آہنگی ان کی شخصیت کی وہ خصوصیات تھیں جو ان کو بقائے دوام کے دربار میں جگہ دینے کے لئے کافی ہیں۔ مخالفتوں میں اپنے توازن کو قائم رکھنا اس کو آلودگی سے محفوظ رکھنا۔ اردو زبان کو بلندی اور نحو کی دلنوازی کو برقرار رکھنا اس وقت ممکن ہے۔ جب سیدھی راہ پر چلا جائے۔ اس دور قحط الرجال میں ایسی جامع اور ہمہ گیر ہستیاں کہاں ملتی ہیں۔ اب نہ وہ مروت ہے نہ وہ علم۔ نہ وہ دیانت۔ فکر و ذہن بے دار جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو۔ وہ شبنم اب کہاں۔ ان کی عظمت میں شبہ نہیں۔ لیکن جو چیز رہ رہ کر یاد آتی ہے۔

وہ ان کی شخصیت کا حسن تناسب اور اس کی دلکش ہمواری ہے۔
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔

چچا جان

کچھ یادیں اور آخری سفر کا حال

از۔ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ریڈر شعبۂ
سیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

جب سے ہوش سنبھالا ہے چچا جان کی عظیم جلیل القدر اور بلند قامت شخصیت کی حکیمانہ اور شفقت آمیز تربیت ملی۔ زندگی کے ہر موڑ پر اور ہر دور میں ان کی رہنمائی سے فیضیاب ہوا۔ اور بد اپنی حرماں نصیبی اور کوربختی کے اس فیض کے چشمہ سے کما حقہٗ فیضیاب نہ ہو سکا۔ اگر ان کی سرپرستی اور رہنمائی نصیب نہ ہوئی ہوتی تو نہ معلوم کیا حشر ہوتا۔ چچا جان میرے لئے کیا تھے اس کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ وہ میرے استاد تھے۔ میرے ہادی تھے۔ رہبر تھے۔ مربی تھے۔ اور مرشد تھے۔ زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا مشغلہ ہو جس کے بارے میں انھوں نے رہنمائی نہ کی ہو۔ چچا جان کی شخصیت ایک عہد آفریں اور عہد ساز بلند قامت ہمہ جہتی شخصیت تھی۔ تحو اردو ادب و انشاء۔ تنقید۔ فلسفہ۔ مذہبیات۔ نفسیات۔ راست گفتاری زبان کامل۔ اور صدق و صفا کا پیکر تھی جو اعتدال و توازن کا مجموعہ تھی

جو قدیم و جدید کا سنگم تھی۔ اور مجمع البحرین تھی۔ ان کی زندگی ایک سچے
اور سچے مرد مومن کی زندگی تھی۔ جس نے اس کا نمونہ پیش کر دیا کہ اس
مادہ پرست دہریت بیزار اور مذہب مخالف زمانے میں ایمان پر کس
طرح کوئی استقامت سے قائم رہا جاسکتا ہے۔ اور سچائی اور صداقت پر
کس طرح پوری مضبوطی سے ڈٹے رہا جاسکتا ہے۔ اور کس طرح سب سے
بڑے سچے پیغام کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہی باتیں کہنے اور لکھنے والا اٹھ
گیا۔ اس کے ساتھ نہ صرف ایک پوری نسل بلکہ ایک پورے عہد کا خاتمہ
ہو گیا۔ ان کی تربیت کا طریقہ دل کو موہ لینے والا تھا کہ ان کی تربیت میں
رہنے والا ان سے پوری بے تکلفی سے اپنے دل کی بات کہہ ڈالتا۔ وہ
ایسے دل نشیں انداز میں باتیں کرتے کہ ان کی باتیں اس کے دل میں اتر
جائیں۔ گفتگو میں نہ تو خشونت تھی اور نہ کرختگی بلکہ شگفتگی اور نرمی
ہوتی تھی۔ اخلاقی برائی پر اس طرح گفتگو کرتے کہ مخاطب کے دل میں
یہ بات بیٹھ جاتی کہ یہ چیز ذاتی خراب ہے۔ وہ اس بات کے بالکل
قائل نہ تھے کہ جبراً اپنی رائے کسی دوسرے سے منوائی جائے۔ کہا کرتے
تھے کہ ہر مسئلہ کے بارے میں اچھے اور برے پہلو پیش کر دیئے ہیں۔ اب
تم خود دیکھو اس پر غور کرو۔ اور اپنی رائے قائم کرو اس کے بعد بھی اگر وہ
اس رائے کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ تو اپنے حکیمانہ انداز میں اس کی خرابی کو
واضح کرتے تھے۔ وہ کام کو عبادت سمجھ کر کرتے تھے۔ اور معمولات کے
سختی سے پابند تھے۔ وہ وقت کے بڑے پابند تھے۔ اور اس کی بڑی
قدر کرتے تھے۔ اور اپنے زیر تربیت تمام عزیزوں پر اس کی تاکید رہتی
تھی کہ وقت کی پوری پابندی کریں۔ اچھی طرح یاد ہے کہ جب گرمیوں
کی چھٹی میں ہم لوگ دریاباد جاتے تھے تو ہمیں اپنا ٹائم ٹیبل بنانے کی
ہدایت ہوتی تھی۔ ان چھٹیوں میں نہ صرف ہم کہاں ہیں دریاباد میں

ہوتے تھے۔ بلکہ اپنے متعدد قریبی رشتہ کے بھائی بھی ہوتے۔ اس تمام
کھیل میں سب کچھ ہوتا تھا۔ نماز تلاوت عام مطالعہ کے ساتھ کھیل
کود اور جائز تفریح سب کچھ۔ تمام سب لوگوں سے بعد مغرب تقریر کی مشق
کرائی جاتی تھی اور ورزش کے مقابلے بھی ہوتے تھے۔ ان سب چیزوں
میں مرحوم پوری طرح دلچسپی لیتے تھے۔ ہائے اب آنکھیں
ترسیں گی۔ اس پیکر صدق و صفا۔ اور راست گفتار مومن کے دیدار
کو۔ اور کان ترسیں گے سچی باتوں کو۔ حکمت اور موعظت کی باتوں کو۔
باطل کا مقابلہ اب اس پامردی سے کون کرے گا۔ وہ حمیت دینی
اور غیرت دینی کے پتلے تھے۔ اسلام کی مدافعت میں سینہ سپر رہتے تھے۔
اور اس کے کسی پہلو پر بھی حملہ ہو فوراً دفاع میں آجاتے تھے۔ وہ عملی
ہمت کی ایک چٹان تھے۔ جس نے کبھی جھکنا نہ جانا۔ وہ عزم اور بلند
حوصلگی کا ایک کوہ گراں تھے۔ جس کو حوادث روزگار اور انقلابات
زمانہ ہٹا نہ سکتے تھے۔ وہ اسلام کے لئے ہمیشہ سینہ سپر رہتے تھے۔ وہ سچائی
کے لئے جئے۔ اور سچائی ہی کے لئے مرے۔ ان کی موت پوری ایک نسل کی
موت ہے۔ اور ایک مستقل دور کی خاتم ہے۔

وہ بات کو نکن کی گئی کوہ کن کے ساتھ۔ گئی

پھوپا جان ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی

از سلمہ کمال الدین حسن صاحب حیدرآباد

[یہ مضمون نواب یاور جنگ کی بہو کا ہے مولانا مرحوم
ان کے پھوپھا تھے ۔ اس مضمون میں مولانا کے خانگی
حالات اور ان کی اولادوں کے تعلق سے مفید و موزوں
معلومات حاصل ہوتی ہیں]

تصور کے پردوں پر ایک بزرگ کی تصویر ابھرتی ہے ۔ گورا رنگ نورانی
چہرہ ۔ سفید داڑھی ۔ لباس کرتہ پائجامہ ۔ عبا ۔ سر پر خلافت کیپ اور کاندھے
پر رومال ۔ مگر ہمیشہ نہایت صاف ستھرا وضع قطع بات چیت ۔ ہر چیز میں
نفاست ۔ سادگی اور باقاعدگی یہ خاکہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کی
شخصیت کو پیش نظر کردیتا ہے ۔ جس کو جانچنے اور پرکھنے والے ایک دو نہیں ہزاروں
کی تعداد میں موجود ہیں ۔ کوئی انھیں خادم اسلام اور مصلح قوم کی حیثیت
سے یاد کرے گا ۔ کوئی ان کے ادب و فلسفہ پر سر دھنے گا کسی کو نفسیات
اخلاقیات میں ان کے خیالات کا پرتو نظر آئے گا ۔ کوئی تنقید اور تبصرے کے
میدان میں یا سیرت و سوانح نگاری کے خارزاروں میں انھیں تلاش
کرے گا ۔ مگر انھیں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی ہیں ۔ جن کے دل ان کی عنایتوں
اور شفقتوں کو یاد کرکے تڑپ جاتے ہیں ۔ جو گھر کی مانوس فضاؤں میں
ایک پیدا ہونے والا خلا محسوس کرتے ہیں ۔ اور جو ان کی ہدایتوں اور
شفقت بھری باتوں کو ترستے ہیں ۔ مرحوم سے رشتہ داری تو نسبتی تھی ۔

اور خاندانی تعلقات بھی برسوں پرانے تھے۔ مگر ان میں مزید اضافہ اس طرح ہوگیا۔ ان کی بیوی علاوہ رشتہ میں میری خالہ اور پھوپھی ہونے کے میرے شوہر کی حقیقی خالہ تھیں۔ صرف یہی نہیں طبیعتاً اتنی محبت کرنے والی اور ملنسار بیویاں کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان کا خلوص اور یگانگت بھرا برتاؤ ہر رشتہ سے افضل تھا۔

بہر حال ذکر تو خالو جان کا تھا۔ سنتے ہیں کہ ایک زمانے میں مذہب سے بالکل منحرف ہو گئے تھے۔ والدین سخت پریشان کہ کیا کریں۔ ایک تعزیتی جلسہ میں دعا کے لئے ہاتھ نہیں اٹھائے۔ سارے خاندان میں لے دے مچ گئی۔ کوئی کہتا کہ یہ تو کلمہ بھی بھول چکے ہیں۔ کوئی کافر و ملحد قرار دیتا۔ آخر کار ایک روز ان کے والد اس مسئلہ کو حل کرنے مولوی نظام الدین حسن صاحب کے پاس آئے۔ (یہ نواب افسر یار جنگ کے والد تھے۔ ذاتی علم و فضل کی وجہ سے ان کی رائے کو ہر ایک اہمیت دیتا ان کی اصول پرستی اور وقت کی پابندی نے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرلی تھی) مولوی صاحب نے والد صاحب کا درد دل ہمدردی سے سنا۔ پھر کہنے لگے گھبرائیے نہیں، جو شدت الحاد میں ہے وہی شدت انشاء اللہ اسلام پر عمل میں بھی ہوگی ہم آپ تو باپ دادا کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہے ہیں۔ یہ جستجو میں ہیں۔ جب کھوج پائیں گے اور ثابت قدم ہو جائیں گے۔ اللہ رہی ہوا وہ خانۂ کعبہ میں ان کے والد کی آہ و زاری تو جو ج کو گئے اور وہیں پیوند خاک ہو گئے۔ یا اپنی ہی کاوش و جستجو سے ایسا پلٹا کھایا کہ پیکر اسلام بن گئے۔ اٹھنا بیٹھنا۔ کھانا پینا۔ ہر چیز میں وہی سادگی اور انتظام۔ وہی جد و جہد اور وہی ایمانداری اور سچائی جو مذہب نے سکھائی اور جس پر عمل میں عموماً کوتاہی ہو جاتی ہے۔ اصول پرستی اور وقت کی پابندی کا یہ عالم تھا۔ کہ نماز روزہ عبادت ریاضت اور علمی خانگی

کارناموں ہی کے نہیں زلزلے مکان میں آئے۔ لوگوں سے ملنے کھانے پینے غرض ہر بات کے لیے وقت مقرر تھا۔ جس کے خلاف عمل کرتے کسی نے انھیں کم ہی دیکھا ہوگا۔ غذائیں تلی کھاتے تھے۔ باتیں بنی تلی کرتے۔ اور انھیں اوزان و اقدار کو تحریریں بھی مدنظر رکھتے جس کے نمونے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ قیام زیادہ تر دریاباد میں۔ اور وقتاً فوقتاً خاص ضرورتوں کے تحت لکھنؤ میں بھی رہنا۔ اس کا پروگرام بھی پہلے سے تیار رہتا اور اس میں یکایک کوئی تبدیلی ناگوار ہوتی۔ اس لیے ان سے ملنے کی جستجو میں ہم لوگ جب بھی لکھنؤ جاتے۔ انھیں پہلے مطلع کر دیتے۔ اس بات سے بہت خوش ہوتے۔ اور اگر ممکن ہوتا تو خود تشریف لاتے۔ ورنہ بیویوں اور لڑکیوں کو ضرور بھیج دیتے۔ مولانا کی چار صاحبزادیاں ہیں۔ جن کی شادی انھوں نے اپنے بڑے بھائی کے چاروں بیٹوں سے کر دی تھی۔ ان لوگوں کے بھی دریاباد آنے جانے کے پروگرام طے رہتے۔ چنانچہ اکثر ہم لوگ مذاق میں پوچھا کرتے کہیئے۔ آج کل کس کی ڈیوٹی دریاباد میں ہے۔ اور کس کی لکھنؤ میں۔ ہے۔ کبھی موقع ہوتا تو ہم لوگوں کو دریاباد بلا لیتے۔ اور خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔ محلسرا کے نمونے کا آبائی مکان تھا۔ ایک طرف دالان در دالان۔ اس کے پیچھے شہ نشین۔ ادھر ادھر ضرورتوں کے تحت کمروں میں تبدیل کر لیا گیا تھا۔ دروازوں پر خوبصورت رنگین شیشے۔ باقی تین طرف دو منزل اور بیچ میں کشادہ و صاف ستھرا صحن۔ ایک طرف بالاخانے پر مولانا کا کتب خانہ تھا۔ جس کو نوادرات کا خزانہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اپنی کتابیں بڑے شوق سے دکھاتے۔ اور ان کی قدر و قیمت بتاتے جاتے۔ مردانہ حصہ کوٹھی نما تھا۔ جو مہمان خانہ کی طرح استعمال ہوتا تھا۔ ان کی بیگم صاحبہ اور صاحبزادیاں مہمانوں کی دیکھ بھال کا خاص اہتمام رکھتیں۔ اور وقتاً فوقتاً عزیزوں کو تحفے تحائف بھی بڑی فیاضی سے بھیجتی رہتیں۔ گھر میں متعلقین کی ماشاءاللہ کمی نہ تھی۔ ان کے علاوہ پشتینی ملازمین کی بھی خاصی تعداد موجود رہتی۔ مگر حفظ مراتب کا ایسا پاس کم ہی

دیکھنے میں آتا ہے ۔ وہ میل جول ۔ حسن سلوک ۔ رواداری ومحبت جو مشرقی طرز معاشرت کی خصوصیت تھی ۔ اب وہ عنقا ہوتی جاتی ہے ۔ مولانا کو بدرجہ اتم حاصل تھی ۔ غالباً اسی پرسکون ماحول کا نتیجہ تھا کہ انھیں اپنی علمی وادبی صلاحیتوں کو جلا دینے کا پورا موقع ملا ۔ اور وہ انھیں درجہ کمال تک پہنچا سکے ۔ ملاقات کا طریقہ یہ تھا کہ اپنی لڑکیاں ہوں یا قریبی رشتہ دار بیویاں ان کا بغیر کامدار جست یا باریک لباس میں سامنے آنا پسند نہ کرتے ۔ نظریں ہمیشہ نیچی رکھتے ۔ جس پر کوئی تبصرہ یا تنقید کرنا ہوتی اس کا ذکر چاہے وہ حاضر ہی کیوں نہ ہو ضمیر غائب میں کرتے ۔ مثلاً ایک روز خاندان کے کچھ لڑکے ملنے گئے ۔ تو ان میں سے ایک کی بابت فرمانے لگے ۔ " انھوں نے ڈاڑھی بڑھالی ہے ۔" اس پر دوسرے نے کہا جی ہاں ۔ مگر اس کی تو بہت سی وجہیں ہوسکتی ہیں ۔ مولانا نے جو باتیں دریافت کیں ۔ تو بولے کہ کاہلی میں رکھ لی ہوگی ۔ آج کل بلیڈ بھی تو مہنگے ہوگئے ہیں ۔ مولانا کے کرید کی آپ نے تو دو وجوہات کہی تھیں ۔ ابھی تو دو ہی ہوئیں ... لڑکے نے پھر کہا کوئی جلدی بیماری ہوگی ۔ یا ڈاڑھی رکھ کر اپنے کو بہت حسین سمجھتے ہوں گے ۔ مولانا اس پر بھی مطمئن نہ ہوئے تو لڑکے نے دل کی بات کہدی ۔ اگر یہ سب نہیں تو آپ کہئے ۔ ایسے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے رکھ لی ہوگی ۔ اس صاف گوئی پر مولانا مسکرا دیئے ۔ اور کچھ دن تک یہ واقعہ لوگوں کو سناتے رہے ۔ اکثر لوگ ان کے سامنے بہت مقطع معلی بن جاتے ۔ اور ہاں میں ہاں ملاتے ۔ مگر وہ اس تصنع کے برعکس یہ بات پسند کرتے کہ لوگ ان سے کشادہ دلی اور صاف گوئی سے ملیں ۔ اور شرافت وسادگی کی معمولی وضع اختیار کریں ۔ جیسا کہ پورا ذکر ہوا ہے ۔ ہر بات پروگرام کے مطابق کرتے ۔ لڑکیوں کی شادی کا دن ۔ تاریخ بھی اپنے طور پر طے کرلیتے ہوں گے ۔ مگر گھر والوں کو اس کی خبر عین وقت پر ہوتی تاکہ جہیز ۔ لین دین اور رسومات کی پابندی کا سوال ہی پیدا نہ ہو ۔ نہ کسی کو بلاتے نہ اطلاع کرتے ۔ خطبۂ نکاح عموماً خود پڑھتے ۔ (ان کی بڑی لڑکی کا نکاح

غالباً کتاب کی صورت میں موجود ہے) اس طرح یہ تقریب صرف حاضرین کی موجودگی میں بڑی خوش اسلوبی سے انجام پاجاتی ۔ سنت رسول کی پابندی کا اتنا خیال تھا کہ عیادت ۔ تعزیت ۔ شادی غمی میں شرکت ۔ نیک مشورہ اور ہر طرح کی امداد اور استعانت اپنا فرض سمجھتے ۔ تنقید ایسی بے لاگ کرتے کہ اپنے پرائے کا امتیاز نہ رہتا ۔ جب نواب ناظر یار جنگ مرحوم نے جامعہ عثمانیہ سینٹ میں مخلوط التعلیم کی تجویز پیش کی ۔ تو مولانا نے اس پر کڑی تنقید کی جس کا جواب قاضی عبدالغفار مرحوم نے (پیام اخبار کے ذریعہ) دیا ۔ مگر یہ نظریاتی نوک جھونک اصولی اور علمی دنیا کی حد تک تھی ۔ ویسے قاضی عبدالغفار مرحوم سے مولانا کے گہرے مراسم تھے ۔ اور ناظر یار جنگ مرحوم تو خیر ان کے اپنے ہی تھے ۔ علمی حیثیت سے ان کی شخصیت پر روشنی ڈالنا اس لئے یہاں ضروری نہیں ۔ کہ اس حیثیت سے انھیں سبھی جانتے ہیں ۔ اور مذہبی حد تک ان کی خدمات دنیا پر روشن ہیں ۔ مگر یہ واقعہ ممکن ہے کہ سب کو معلوم نہ ہو کہ ایک بار امریکہ کی یونیورسٹی سے ان کے پاس دعوت آئی کہ وہاں آکر اسلامی فلسفہ پر لکچر دیں ۔ مگر وطن کی محبت نے انھیں حیدرآباد کی ملازمت پر چمٹے رہنے دیا اور نہ امریکہ جانے دیا ۔ چنانچہ انھوں نے کچھ ایسے الفاظ میں معذرت کردی جن کا مفہوم یہ تھا کہ

کوئی دامن چھڑا دے تو آگے بڑھوں ؛ لپٹی جاتی ہے قدموں سے خاک وطن

آخر کار وطن ہی ان کی ابدی آرامگاہ بنا ۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں ۔

۱۔ مولانا عبدالماجد کی آپ بیتی
۲۔ خودنوشت سوانح۔ تمہید و دیباچہ
۳۔ مولانا کی متفرق نگارشات

مولانا عبد الماجد کی آپ بیتی

مولانا موصوف نے "یاد ایام" اور "اپنے بیتے ہوئے دن" کے عنوانات کے تحت کچھ ریڈیائی تقریریں کی تھیں۔ نیز اپنے کتب خانے اور ذوق کتب بینی کے تعلق سے مضامین لکھے تھے۔ ان کو سامنے رکھ کر ان کی اچھی خاصی آپ بیتی مرتب کرلی گئی ہے۔ اس آپ بیتی کے آئینہ میں ان کی شخصیت۔ کردار۔ ذوق مطالعہ و شوق تحریر معاصرین و برگزیدہ ہستیاں جن سے وہ متاثر ہوئے۔ ان سب کے نقوش نمایاں طور پر اجاگر ہو جاتے ہیں۔ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۸ اگست ۵۸ء کو نشر ہونے والی تقریر میں اپنے بیتے ہوئے دن کے عنوان کے تحت مولانا

مولانا فرماتے ہیں کہ:۔

"اپنے ہوش کی آنکھیں کھلنا شروع ہوئیں۔ تو انیسویں صدی کی آنکھوں کے بند ہو چکنے کے دن تھے۔ اپنا گھرانہ مذہبی و دین دار تھا اور ساتھ ہی اوسط درجہ کا خوشحال بھی۔ چار پانچ سو ماہوار کی آمدنی تھی اور یہ اس وقت کا چار پانچ ہزار کے برابر تھی۔

پڑھنے لکھنے کی عادت بچپن سے پختہ ہو گئی تھی۔ اور اخبار و رسالہ سے لے کر کوئی چھپی ہوئی چیز نظر سے بچ کر نہیں نکلنے پاتی تھی۔ نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن کا گھر گھر میں تلاوت کا رواج تھا۔ اور مرأۃ العروس (اکبری اصغری کی کہانی) اور توبۃ النصوح کا ہر گھر میں رواج۔ اس رواج کے لحاظ سے بجا ہے کہ اس دور کو نذیر احمد دور قرار دیجئے۔

جب اسکول کے نویں اور دسویں درجہ میں آیا تو مولانا شبلی کی کتابیں معنویت و دلکشی کے ساتھ دیکھنے میں آنے لگیں۔ اور ساتھ ہی مولانا کا ماہنامہ الندوہ بھی اور دوسری طرف انگریزی کتابیں بھی پڑھنا خوب شروع کر دیا۔ علامہ شبلی کا دور گویا زندگی کا دوسرا دور ہے۔ تیسرا دور اس وقت آتا ہے۔ جو کالج کا زمانہ ہے۔ پڑھنا اور کتب بینی کا تو گویا مریض تھا۔ میٹرک کا امتحان دینے کے بعد انگریزی کتابیں انہماک سے پڑھنا شروع کر دیں۔ انھیں میں انگریزی کی ملحد دل کی کتابیں بھی تھی۔ اور ان کی اچھی خاصی کتابیں پڑھیں۔ اور سپنسر جان اسٹورٹ۔ مل اور ہیکلے وغیرہ کی شاگردی اختیار کر لی۔ عقائد میں بجائے اسلامیت کے انکار و لاادریت اور ریب و تشکیک ۔ زوروں پر رہی۔ ایک آدھ سال نہیں پورے دس سال کی مدت ضائع ہوئی۔ یعنی ۱۷ سال کی عمر سے کوئی ۲۷ سال کے سن تک لاادریت کی حکومت دل و دماغ پر رہی۔

اسی مدت کے آخر میں ہندو فلسفہ اور بدھ فلسفہ کا مطالعہ رہا اور فرنگی مادیت کے بجائے ہندو روحانیت دل میں بیٹھ گئی۔ اور اگرچہ پوری طرح اسلام نہیں آنے پایا۔ تاہم ہندو فلسفہ کا بھی اسلامی روحانیت کا سے جوڑ مل گیا۔ اسلامی تصوف و روحانیت کا اثر دل میں تھا ہی۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ موثر مولانا روم کی مثنوی ثابت ہوئی۔ اور سب سے بڑی شخصیت جو اس وقت زیادہ موثر رہی حضرت اکبر الہ آبادی کی تھی۔ ان کی رہنمائی ایک موثر زندہ شخصیت کی میرے لئے ایک بڑے لطیف انداز کی رہی۔ بہرحال اس دور کے سب سے بڑے ہادی ان کو میرے حق میں سمجھئے۔

اپنی عمر چار منزلوں میں تقسیم ہو چکی۔ اس کے بعد خالص

اسلامیت کی تھی۔ ایک مولانا شبلی کی سیرۃ النبی اور دوسری محمد علی
لاہوری کی انگریزی کی تفسیر ان دونوں کے مطالعہ نے ایک منکر کو از
سر نو مسلم بنا دیا۔ اور رفتہ رفتہ تھانہ بھون کے فاضل اجل مولانا اشرف
علی کی خدمت میں پہنچا دیا۔ اور ہر چند ہفتوں کے وہیں حاضری دیتا رہا
عام علمی موضوعات پر برکلے مکالمات کا ترجمہ اردو میں کر دیا اور
کلیکی کی کتاب ہسٹری آف یوروپین مارلس کے ہر دو حصے۔ اس سے
پہلے بکل کی ہسٹری آف سولزیشن کے دو حصوں کا ترجمہ انجمن ترقی اردو
کی فرمائش سے کیا تھا۔ یہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق کے سکریٹری
ہونے کا دور تھا۔ قرآن مجید کی تفسیر انگریزی کئی برس ہوئے مکمل کر دی
تھی۔ اس کے بعد اردو تفسیر میں سالہا سال گزر گئے۔
حکیم الامت۔ نقوش و تاثرات اور مولانا محمد علی جوہر پر محمد علی
ذاتی ڈائری ،، دو جلدوں میں لکھ دی۔ محمد علی کی شخصیت صرف علمی دور میں
نہیں۔ بلکہ سیاسی پہلو سے نمایاں حیثیت سے رہی۔ صحافت میں
اخبار " سچ ،، اور پھر " صدق ،، کے نام سے نکالا۔ اور یہ ۱۹۲۶ء سے اب
تک نشتم پشتم اب تک جس طرح بن رہا ہے۔ نکلتا چلا آ رہا ہے۔ معارف
کا کئی سال تک شریک ادارت رہا۔ اور مولانا محمد علی کے روزنامہ " ھمدرد
کا بہت دنوں تک نگراں رہا۔ صدق کی نگرانی اب تک قائم ہے۔ اور ممکن
کہ زندگی کے آخری لمحہ تک قائم رہے۔
تفسیر کی نظر ثانی بڑی مفصل کی جا چکی ہے۔ چار پانچ کتابیں اور
لکھی ہیں۔ دو ایک کتابیں تمام ہو چکی ہیں۔ ایک کا نام " معاصرین " ہے
اور ایک کا نام " آپ بیتی ،، ہے۔ یہ غیر مطبوعہ ہے۔ اور خیال ہے کہ زندگی کے
آخری لمحہ تک بے تجلی ہی رہے گی۔۔۔
سیاسیات میں عملاً زیادہ دل چسپی کبھی نہیں رہی۔ ہاں تحریک خلافت

میں پوری طرح شرکت رہی ۔ اور خلافت کمیٹی کے اعلیٰ عہدے پر نصیب رہے
محمد علی میرے مستقبل کے ہادی و قائد رہے ۔ خلافت کے لیڈر و ترک موالات
(نان کا پریشن) کے علم بردار رہے ہیں ۔
زمانہ پہلے آہستہ آہستہ پھر تیزی سے بڑھنا اور تبدیل ہونا شروع ہوا
گوشت ۔ گیہوں ۔ گھی ۔ چاول ۔ شکر ۔ چائے ۔ مٹی کا تیل ۔ کپڑے کے آج کے
نرخوں کا کوئی خیال بھی کر سکتا تھا ۔ سرکاری چیزیں بھی انتہائی گراں ہوگئی
ہیں ۔ ایک کارڈ جو آج ۱۵ پیسے کا ہے ۔ وہ ایک زمانے میں ایک پیسے
کا تھا ۔ اور لفافہ جو ۲۵ پیسے کا ہے ۔ دو پیسے کا تھا ۔ ریل کے کرائے اور
تار کی فیس بہت سستی تھی ۔ بلا ٹکٹ مسافری اور امتحانوں میں نقالی
دن دہاڑے نقالی فیشن میں داخل ہوچکی ہے ۔ قناعت کا لفظ اس
وقت بے معنی نہ تھا ۔ اور آج کی طرح طرح کی بددیانتی سے کوئی واقف نہ
تھا ۔ اسمگلنگ کے نام سے کاروبار آج خوب زوروں پر چل رہا ہے ۔
گاندھی جی نے ایک دو سالی نہیں کم سے کم تیس سال تک بے تاج کی
بادشاہی کی ۔ برسوں اپنی زندگی میں اور برسوں اپنی موت کے بعد بھی"
نیز حضرت موصوف نے "یاد ایّام" کے عنوان سے ۱۹ ار
دسمبر ۱۹۷۵ء کو دہلی ریڈیو سے ایک تقریر نشر کی تھی ۔ جو "آپ بیتی"
کی تمام خصوصیت لئے ہوئے ہے ۔ آپ فرماتے ہیں . . . .
" اپنی پیدائش کا وقت وہ تھا ۔ جب برطانیہ کا اقبال سرزمین
ہند میں عروج پر تھا ۔ ہر جگہ انگریزیت اور غلبہ ہر ہر چیز پر فرنگیت کا
تھا ۔ اور انیسویں صدی کا وقت خاتمہ کا ہو رہا تھا — ۸۰ ۔ ۹۰ سال قبل
انگریز کی صناعی اور صنعت گری کے ہمارے اہل وطن قائل تھے ۔ لیکن
اس کے علم و فضل کے ذرا بھی قائل نہ تھے ۔ اور ہمارے ذہین طباع
فرقہ کا کہنا یہ تھا ۔ کہ انگریز مستری اچھے ہیں ۔ اور بڑھئی لوہار اول نمبر کے ہیں ۔

ریل اور تار کا کیسا جال پھیلایا ہے۔ لیکن ان کے کمالات کو علم و فضل سے کیا واسطہ۔ اور ان کے اسکول اور ان کے کالج مدرسے نہیں ایک طلبا کے خاصے ہیں۔

انیسویں صدی کا آخری دہہ تھا۔ جب کہ ملک میں فقہ و حدیث کے اچھے اچھے فاضل مشہور تھے۔ مثلاً مولانا میاں نذیر حسین دہلی کے اور فرنگی محل میں مولانا عبدالحئی کا نام گونج رہا تھا۔ اور دیوبند میں مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم معروف تھے۔ بیسویں صدی میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور لکھنؤ میں دوسرے علماء میں عین القضاۃ اور مولانا عبدالشکور نورانیت پھیلاتے رہے۔ بڑے لیڈروں میں سید احمد خاں علی گڑھی مشہور تھے۔ اور ان کے رفیقوں میں محسن الملک اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی صدر یار جنگ تھے۔ شاعروں میں امیر۔ داغ۔ جلال کے سے شاعران باکمال تھے۔ اور ان کے شاگرد ریاض خیرآبادی تھے۔ اور شاعران باکمال کے سردار حضرت اکبر الہ آبادی فرد فرید تھے۔ جن سے فیض تربیت بھی اس ہیچمداں کو حاصل ہوا۔ اور نثر نگار ادیبوں میں مولانا نذیر احمد دہلوی۔ عبدالحلیم شرر۔ مرزا محمد ہادی رسوا۔ محمد حسین آزاد اور راشد الخیری تھے۔ دہلی کے طبیبوں میں حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم اجمل خاں مسیحائے وقت مشہور تھے۔ اور لکھنؤ میں حکیم عبدالعزیز اور حکیم عبدالمجید اور اس کے بعد حکیم عبداللطیف اس شہر کے ہوئے اور امراض چشم کے ماہر کی حیثیت سے ڈاکٹر عبدالرحیم کا نام دور دور تک پہنچا۔ بزرگوں اور شیوخ وقت میں حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی۔ دیوا کے مشہور مرشد حاجی وارث علی شاہ تھے اور گنج مرادآباد (ضلع اناؤ) کے مشہور بزرگ مولانا فضل الرحمن تھے۔ اور سب سے بڑھ کر مقبولیت اور مرجعیت کے مشترک امام مولانا اشرف علی تھانوی تھے۔ تھانہ بھون میں اپنی مثال آپ ہی تھے۔

تاریخ اور علم و ادب کی شخصیتیں ایسی عدیم المثال کسی نے نہیں دیکھی ہیں۔

جیسے مولانا شبلیؒ اور ان کے شاگرد۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ اور بہترین مقرر و جامع معقول و منقول مولانا مناظر احسن گیلانی۔ بولنے والے صاحبوں کا ذکر آیا ہے۔ تو ان لوگوں کے نام کچھ سنتے جائیے اور مولانا شاہ سلیمان پھلواری اور علی گڑھ بیرسٹر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور اپنی نظیر آپ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری جو بہترین مقرر تھے۔

انگریزی قانون کے بہترین شارحوں اور ماہرین میں جسٹس سید محمود۔ رائٹ آنریبل جسٹس امیر علی۔ جسٹس عبدالرحیم اور فیڈرل کورٹ کے جج سر شاہ سلیمان اور فلسفہ۔ شاعری۔ قانون تینوں کے جامع ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ ایک صاحب علامہ حمید الدین کا نام چھوٹا جاتا ہے۔ قرآن کے مبصر و مفسر کامل۔ انگریزی بولنے والوں میں رابندر ناتھ ٹیگور اور گاندھی جی۔ سریندر ناتھ بنرجی۔ سری نواس شاستری۔ اور مدن موہن مالویہ اور سب سے بڑھ کر اردو اور انگریزی بہترین مقرر مولانا محمد علی (ایڈیٹر کامریڈ)

میرے بچپن میں مسلمان شریف عورتیں پردے میں رہتی تھیں۔ اور عورت کی شرافت و شرافت مسلم تھی۔ اور اب بے پردگی ہی فیشن میں داخل ہے۔ محض بے پردگی ہی نہیں۔ بلکہ ہر طرح کی بے ستری۔ پوری بے حیائی کے ساتھ پہلے بھی ہر بڑے شہر میں گھوڑا گاڑیوں کا رواج تھا۔ اور اب دیکھتے ہی دیکھتے وہ پائدار اور آرام دہ جوڑی عنقا ہو گئی۔ اور اس کے بجائے موٹریں چل گئی ہیں۔ اور اوسط طبقہ میں تانگے اور رکشہ نکل پڑے ہیں۔ مسافروں کے لئے شہروں میں شاندار سرائیں ہوتی تھیں اور ہندو مسافروں کے لئے دھرم شالے۔ اب چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی قدم قدم پر ہوٹل کھل گئے ہیں۔

میرے بچپن میں گنتی کی چند یونیورسٹیاں تھیں۔ اب یونیورسٹی ہر بڑے شہر میں کھل گئی ہے۔ یہ یونیورسٹیاں اس کثرت سے ہو گئی ہیں۔ کہ جیسے کسی زمانے میں ہائی اسکول ہوتے تھے۔ اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ایسی عام ہو گئی ہے

جیسے کسی وقت میں بی۔ اے کی ڈگری تھی۔
غرض یہ کہ جس طرح خالق کائنات کی ہر لحہ اور ہر آن نئی شان رکھتی ہے
اسی طرح خلقت کی رنگا رنگی بھی۔ کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ .. کا جلوہ دکھاتی ہے

اہم ادبی واقعات و شخصیات

مولانا موصوف نے اپنے قلم سے ان واقعات اور ناقابل فراموش شخصیات کا ذکر بڑے صداقت آمیز۔ والہانہ انداز میں کیا ہے۔ جو آپ کی علمی اور ادبی کردار کو ہر شکل میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں ...

ہوش کی آنکھیں جب کھلیں تو مجھے اس بیسویں صدی کے شروع کا زمانہ تھا۔ ادبی فضا پر حکمراں اس وقت دو شخصیتیں تھیں۔ ایک شبلی دوسرے شرر۔ سنجیدہ علمی فکری۔ واقعاتی قسم کے ادبیات کے فرمانروا شبلی نعمانی تھے۔ علی گڑھ کالج کے سابق استاذ عربی۔ الفاروق کے نامور مصنف اور بڑے بڑے اہم اور معرکہ کے مقالوں کے مقالہ نگار۔ ان انگلیوں نے جب سے قلم پکڑنا سیکھا۔ روش اعظم گڈھ اس مرد عظیم کی بھائی۔ اور بہر دی اسی رئیس القلم کی اپنے کو سرمایہ فخر و افتخار نظر آئی۔ سرسید کی زندہ شخصیت کا آفتاب ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ اس چراغ سے اپنا چراغ جلا کر خود اسے چمکتا دمکتا چاند بنا دینے والے علاوہ مولانا شبلی کے کچھ اور بھی تھے۔ جیسے حالی۔ نذیر احمد اور محمد حسین آزاد احترام ان سب کا بیش نظر رہا۔ لیکن حالی کی سادگی۔ خشکی کی ڈانڈے چھوٹی ہوئی نظر آئی۔ اور آزاد کے فلک پیما تخیل بلند کے آگے ہمت نے ہتھیار ڈال دیئے۔ بقول شخصے۔ بھاری پتھر جو م کے چھوڑا۔ غنیمت اور اپنے طرز۔ طرف دلبا دا کے

مطابق ایک نذیر احمد نظر آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شبلی کے بعد اگر کسی کے دربار سے کچھ تھوڑا بہت فیض حاصل ہوا۔ تو وہ نذیر احمد تھے۔ قرآن مجید کے مترجم اور مبتلا و لوح ما ما عظمت اور اصغری و اکبری کے چلتے پھرتے کرداروں کے خالق۔ جب سمن۔ اور آیا اور دماغ کو کالج کی ہوا لگی۔ تو دیکھا کہ فضائے ادب میں ایک نیا مجتہد ابوالکلام آزاد کا بھی لہرانا شروع ہے۔ اس تنومند کی پہلوانی اور شہ زوری دیکھ کر زبان پر واہ واہ تو بے اختیار آئی۔ لیکن دل و دماغ سے مشورہ کیا تو ہمت ان کی راہ پر قدم اٹھانے کی نہ پائی۔ ادھر انگریزی تعلیم نے دماغ میں طرح طرح کی آزادیوں اور آزاد خیالوں کی ہوا بھری۔ "مل" اور "اسپنسر" اور ہکسلے وقت کے بازار عقلیت میں چلے ہوئے سکے تھے۔ انھیں اپنانے اور ان کا جربہ اتارنے میں ہاتھ نے خوب خوب اپنی صفائی دکھائی۔ افلاطون و ارسطو ھیوم و بارکلے۔ ولیم جیمس اور ہنری برگساں کی بھی جیبوں پر ہاتھ ڈالنے کی نوبت کبھی کبھی آگئی۔

دو الگ الگ دھارے ایک دوسرے کے متوازی بہہ رہے تھے۔ ایک دھارا ذرا اونچا علمی قسم کی بحثوں۔ موضوعوں کا۔ اس میں تو دلیل راہ شبلی نعمانی ہی رہے۔ کہنا چاہیے کہ شروع سے آخر تک کیا، الندوہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اور کیا الکلام۔ کے مصنف کی حیثیت سے۔ اور دوسرا دھارا ہلکے پھلکے ادبی افسانہ اور شعر و شاعری کے ادبیات کا۔ اس دوسرے قافلے کے میر کارواں شرر صاحب ایک عرصہ دراز تک رہے۔ مع اپنے رومانی ماہنامہ دلگداز اور اپنے ناولوں فردوس بریں۔ مقدس نازنین، حسن انجلینا اور فلورا فلورنڈا کے لیکن ابھی ملک کی امیری و سرداری تنہا شرر صاحب کے حصے میں زیادہ عرصہ تک نہ رہیں۔ دوسرے بھی ان کی امارت میں حصہ لگانے چلے گئے۔ ان میں تو ایک وہی متین اور مقطع نذیر احمد دہلوی تھے۔ جن کا نام ابھی دو منٹ پہلے آپ سن چکے ہیں۔ دوسرے راشد الخیری نکلے ان کا نمبر بھی کچھ کم نہ رہا۔ در دو رقت انگیزی کے تو گویا بادشاہ تھے مصور غم جس کسی نے بھی انھیں کہا

وہ واقعی مردم شناس تھا۔ تیسری ایک اور البیلی شخصیت خواجہ حسن نظامی کی نمودار ہوئی۔ باغ و بہار تام کی ایک چھپی چھپائی کتاب سے تو آپ بھی واقف ہوں گے۔ یہ خواجہ صاحب اپنے ظاہری چونچلوں کے لحاظ سے خود ایک مجسم باغ و بہار بلکہ سدا بہار نکلے۔ یہ سارے نام دہلی والوں کے ہوئے۔ لیکن اپنے ذہن نے نقشہ ان سے بھی گہرا لکھنؤ اور خوار لکھنؤ والوں ہی کا قبول کیا۔

فسانۂ آزاد والے رتن ناتھ سرشار، اودھ پنچ والے سجاد حسین کاکوروی ریاض الاخبار والے ریاض خیرآبادی۔ اور اکبر الٰہ آبادی یہ سب زبان کے استاد تھے۔ اور ان ناموروں کے علاوہ ایک صاحب اور بھی تھے۔ مولوی سید علی اصغر کیننگ کالج لکھنؤ میں اورینٹل ڈیپارٹمنٹ کے استاد۔ یہ تھے تو عربی کے معلم۔ لیکن درجہ میں تذکرے اکثر شعر و ادب کے چھڑ جاتے اور یہ لکھنؤ زبان کے خوب خوب نکتے بیان کر جاتے۔ لیکن غالب کا نام مولانا کے لیے ایک جڑی کی حقیقت رکھتا تھا۔ شاگردوں کو یہ لٹکا اچھا ہاتھ آ گیا تھا۔ جس دن بھی سبق کا ناغہ کرنا منظور ہوا، نام غالب کا لے دیا۔ اب مولوی صاحب ہیں کہ پڑھائی لکھائی چھوڑ بس غالب کے پیچھے پڑ گئے۔ بیچارے کی بات بات پر زبان بگڑنا شروع کر دی اور چلئے۔ گھنٹہ اتنی میں تمام ہو گیا۔

محسنوں کی فہرست لمبی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور سر فہرست کا نام لینے کی نوبت ابھی نہیں آئی ہے۔ یہ تھے مرزا محمد ہادی لکھنوی۔ جن کے تخلص "مرزا" سے لوگ کم واقف اور نثری لقب "رسوا" سے زیادہ واقف ہیں۔ "امراؤ جان ادا" اور "ذات شریف" اور "اختری بیگم" والے ان کی زبان کی سلاست۔ نفاست۔ نزاکت کا نقش دل پر ایسا بیٹھا اور بیٹھا کیا معنی، آج تک ایسا بیٹھا ہوا ہے کہ اپنی اردو دانی کبھی انگڑائیاں۔ جمائیاں لینے لگتی ہے۔ تو انھیں کتابوں کی ہوا ان کو تازہ دم کر دیتی ہے۔

ادبی معرکوں کے قصّے تو کتابوں میں بہت پڑھے۔ ناسخ و آتش کی لپٹ جھپٹ۔ انیس و دبیر کی چشمک۔ مصحفی و انشاؔ کی ہاتھا پائی وغیرہ لیکن بچپن میں دو معرکے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لئے۔ ایک تو بہت بچپن میں جب امیرؔ و داغؔ کے شاگردان رشید اپنے اپنے استادوں کے ناموں کا رجز پڑھتے۔ لنگر لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں کود پڑتے۔ اور دوسرا قصہ بہت بعد کا ہے۔ غالباً سن ۱۹۰۴ء و ۱۹۰۵ء میں مثنوی گلزار نسیم پر لے دے شروع ہوئی۔ ایک فریق کے لیڈر جناب شررؔ اور پیام یار والے منشی نظیر حسین تھے۔ اور دوسری فوج کی کمان چکبستؔ اور اودھ پنچ والے سجاد حسین کے ہاتھ میں تھی۔ صاحب ایک طوفان تھا۔ طوفان لعن طعن کی وہ بھرمار۔ ایک دوسرے کی عزت و حرمت پر وہ یلغار۔ زبان و قلم پر وہ توںکار کہ اگر یہ کہنا خود بدتمیزی میں داخل نہ ہوا۔ تو ایک پورا طوفان بدتمیزی۔ پھر بھی ادبی بھول بات بات پر جھڑتے رہے۔ اور انشاؔ کی پھلجھڑیاں قدم قدم پر چھوٹتی رہیں۔

اپنی ادبی زندگی ہی کیا جو اس کے ناقابل فراموش واقعات و شخصیات بیان میں لاتے۔ اور اس اول جلول آپ بیتی کے ٹکڑے اہل محفل کو سناتے۔ محض تکمیل ارشاد میں سمع خراشی چند منٹ کے لئے کر دی گئی۔ اور ہاں لیجئے جو بات شروع میں عرض کر دینے کی تھی وہ اب جا کر یاد پڑی خیر وقت میں ایک آدھ منٹ کی گنجائش باقی ہے۔ اردو کا الفا سیدھا ذوق یہ جو کچھ بھی نصیب میں آیا اس میں بڑا دخل اس کو ہے کہ بچپن میں مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی اردو ریڈریں پڑھنے کو مل گئی تھیں۔ یہ ریڈریں دو چار سال نہیں کہنا چاہئے کہ تین چار نسلوں کی مدت تک برابر لڑکوں کے کورس میں داخل رہیں۔ ان کے ادبی شعور کو ذوق سلیم کے سانچے میں ڈھالتی ہوئی سنوارتی ہوئی نکھارتی رہیں۔ (از نقوش لاہور)

پرانی باتیں : پرانی یادیں

از :- عبدالماجد ـــــ صدق ۸ستمبر ۷۲ء

شاعروں کا تو لکھنؤ میں شمار ہی نہ پوچھئے۔ نام صرف چند ہی لے سکتا ہوں۔ عزیز صاحب۔ صفی صاحب۔ ثاقب صاحب۔ محشر صاحب۔ اثر صاحب چکبست صاحب۔ اور ہاں فارسی کے نامور شاعر خواجہ عزیز تھے۔ جگت موہن لال شاگرد عزیز نے بعد کو خوب خوب رباعیاں کہیں۔ کالج میں میرے ساتھ کے پڑھے تھے۔ لکھنؤ کے باہر بھی شاعروں کی ایک دنیا آباد تھی۔ سب کے نام گنانے پر آؤں تو گفتگو ساری اس کی نذر ہو جائے۔ امیر و داغ دونوں استاد زمانہ میرے بچپن میں تھے۔ اور حضرت اکبر اور استادِ جلیل تو میری جوانی تک حیات رہے۔ اور اکبر سے مستفیذ بھی اپنی البساط کے لائق یہ حقیر بھی خوب ہوا۔

ریاض خیرآبادی۔ حسرت موہانی۔ وصل بلگرامی۔ سیماب اکبرآبادی۔ اور ناطق کے نام کیسے چھوڑ جاؤں۔ بلکہ اگر محکمہ ریڈیو زندہ شخصیتوں کو بالکل گمنام رکھنا نہیں چاہتا ہے تو یہ تین نام زبان پر آنے کو پھڑپھڑا رہے ہیں۔ فراق گورکھپوری ملا لکھنوی۔ جوش ملیح آبادی۔

نثر لکھنے والوں میں استادی کا مرتبہ تو مولانا شبلی کو حاصل تھا۔ ٹوٹا پھوٹا جو کچھ بھی لکھنا آیا سب انھیں کا فیض ہے۔ اور نوک پلک کا تھوڑا بہت سلیقہ مرزا محمد ہادی رسوا کی ذات سے آگیا۔ شرر صاحب کی بھی زیارتیں رہیں۔ حالی کو بھی زندہ دیکھا۔ مولوی نذیر احمد دہلوی سے تو خاصہ فائدہ اٹھایا ہے۔ اور نام کے لئے تو حضرت سر سید کا زمانہ بھی پایا ہے۔ سر سید کا نام آگیا تو لگے ہاتھوں

ان کے چند رفیقوں، مریدوں کے نام سن لیجئے دیکھئے۔ نواب محسن الملک، وقار الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد۔ علی گڑھ کے سلسلے میں تین نام اور زبان پر آئے جا رہے ہیں۔ جسٹس سر سلیمان، جسٹس سید کرامت حسین اور صدر یار جنگ حبیب الرحمن خاں شیروانی۔

اپنی کالج تعلیم تو لکھنؤ میں پائی۔ بی۔اے۔ یہیں کیا۔ کیننگ کالج کے پہلے پروفیسر اور پھر پرنسپل کیمرن کا نقش دل پر بیٹھا ہوا ہے۔ یونیورسٹی کے قائم ہونے پر اس کے دائس چانسلر بھی ہوگئے تھے۔ کنگ جارج میڈیکل کالج اور کوئن میری زنانہ اسپتال کی بنیادیں میرے سامنے رکھی گئیں۔ اور جب سے ڈاکٹروں کے انبوہ نظر آنے لگے۔ ان سے پہلے شہرت کے پروں سے یہ ڈاکٹر پرواز کر رہے تھے۔ ایک ڈاکٹر ایبنڈرسن (شہر کے سول سرجن) دوسرے ڈاکٹر عبد الرحیم ماہر امراض چشم تیسرے ڈاکٹر رام لال۔ اور یونانی طبیبوں کے بارے میں کچھ نہ پوچھئے کہ دہلی کے اجمل خاں دوسرے شریف خانیوں اور شریف زادوں سے کسی کا مقابلہ ہی کیا ہے۔ لیکن وہ جو جوہر رامپوری کہہ گئے ہیں نا کہ

ع تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اردو لکھنے والے اور اردو کی خدمت کرنے والے بھی لکھنؤ سے باہر بہت ہوئے۔ سب سے یگانگت کا رشتہ تھا۔ سب سے پہلے بابائے اردو ڈاکٹر عبد الحق۔ پھر دہلی کے خواجہ حسن نظامی۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد۔ پھر مولانا سید سلیمان ندوی۔ پھر قاضی عبد الغفار۔ مہدی حسن الافادی۔ اور پھر وحید الدین سلیم۔ رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد۔ جب تک اردو زندہ ہے ان کا نام بھی زندہ ہے۔ یہ بھی میرے بچپن تک زندہ سلامت تھے۔

سیاسی لیڈر میرے لڑکپن بھر یہ تھے۔ سریندر ناتھ بنرجی۔ گوکھلے فیروز شاہ مہتہ۔ اور دادا بھائی نوروجی۔ ایک خاص پارٹی میں سب سے بڑی شخصیت تلک مہاراج کی تھی۔ اور مالوی جی اپنی شیریں زبانی اور اعتدال

پسندی کے لئے معروف تھے۔ پھر شہرت کے بام پر اڑتے ہوئے مسز نائیڈو۔ موتی لال اور جواہر لال نظر آئے۔ اور گاندھی جی نے تو گویا ریکارڈ ہی توڑ دیا۔ انہی کے ہمدوش تحریک خلافت و ترک موالات کے زمانے میں علی برادران رہے۔ اپنا کسی سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق کبھی نہیں رہا۔ بجز ایک خلافت کمیٹی کے۔ اور اس سلسلے میں علی برادران سے پینگ خوب بڑھ گئے۔ لاہور کے ظفر علی خاں اور امرتسر کے عطاء اللہ شاہ بخاری بھی بیگانے سے زیادہ اپنے ہی تھے۔ اور سیاسی لیڈروں میں مولانا ابوالکلام آزاد۔ رفیع احمد قدوائی۔ مولانا حفظ الرحمٰن۔ مولانا سید حسین احمد مدنی ڈاکٹر سید محمود۔ مجید خواجہ اور حسرت موہانی شیر و شکر رہے۔ اور گاندھی جی کی عظمت ہی نہیں عقیدت برسوں تک رہی۔

دینی اور روحانی سلسلے سے واسطہ رہا۔ پہلے ایک ہندو رشی بھگوان داس بناری سے اور پھر متعدد مسلمان بزرگوں سے مولانا ذکریا۔ شاہ وصی اللہ حضرت عبدالقادر رائے پوری۔ اور سب سے بڑھ کر سب کے شیخ و مشائخ حضرت اشرف علی تھانوی سے کہ انھیں کی دستگیری سرمایۂ آخرت ہے۔

ذوق کتب بینی اور خانگی کتب خانہ

(از عبدالماجد) صدق ۱۱؍اکتوبر ۱۹۶۴ء

بچپن سے اگر خودستائی نہ سمجھی جائے تو مطالعہ کا گویا مرض پیدائشی رہا ہے۔ بالکل بچپن میں یاد ہے کہ ساتھیوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے اپنی پسند کی کتابیں پڑھ لینا اور بغیر مطالعہ کئے نہ رہنا۔ دوسروں کو اس پر حیرت ہو جاتی لیکن بہرحال ہر سن و عمر میں یہی عادت رہی۔ اور ایک عارضی وقفہ کے سوا جب ابتداء مطالعۂ تصوف میں کتب بینی کی مذمت کرتا رہتا تھا۔ اور اس قسم کے شعر پڑھتا رہتا تھا۔ کہ . . .

سہ صد کتاب و صد ورق در نار کن جان و دل را جانب دلدار کن

ہر وقت کتابوں کے ذکر و فکر ہی سے تعلق رکھتا تھا۔

علی گڑھ میں جب میں ایم۔ اے میں تھا۔ اور ہر قسم کے اسپورٹس سے سرے سے الگ رہتا۔ ایک قادیانی (احمدی) رفیق ہوسٹل کہا کرتے کہ آپ تو کتابوں سے تعلق تعبدی رکھتے ہیں۔ کتابوں کا پرستار آپ ہی کو دیکھا ہے۔ اور اپنے بزرگ ہم عصروں میں کتب بینی کا جو ذوق رکھتے تھے۔ ان میں دو کو اپنا ہمسر جانا۔ ایک مولانا سید سلیمان ندوی دوسرے بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق۔ مالی حیثیت سے ایسی اطمینان بخش حالت کبھی نہیں رہی کہ بڑی کتابوں کی خریداری کر سکوں۔ پھر بھی آمدنی کی سب سے بڑی مد کتابوں ہی پر صرف ہوئی۔ اور کتابوں کا ذخیرہ جمع ہوتا گیا۔

عمر کے ۸۱ ۔ ۸۲ سال تک ہر عمر میں اور کسی بھی دماغی حیثیت سے یہی

حالت رہی یہاں تک کہ ۵ا مارچ ۱۹۸۲ء کو فالج کا حملہ ہوا۔ علاج سے اللہ نے مرض کے شدائد اور مزید تکلیفوں سے بچالیا۔ لیکن دماغ پر خاص طور سے اثر پڑا۔ آنکھوں کی بصارت پہلے ہی خراب ہو چکی تھی۔ اب پڑھنے ہی میں بہت دقت پیش آنے لگی۔ اور ذوق مطالعہ بہت ہی نہیں تمام تر متاثر ہو گیا۔ یعنی حافظ کی طرح ذوق مطالعہ بھی دغا دے گیا۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ مطالعہ سے چند منٹ بھی بیکار نہ جانے پائیں اور کہاں یہ حالت ہو گئی کہ گھنٹوں بیٹھے خالی اور بیکار پڑا رہتا ہوں۔ دن میں پلنگ پر لیٹ جانا گویا اپنی چڑھ تھی۔ کہاں اب یہ نوبت پہنچ گئی کہ کتابیں الگ رہیں۔ اخبار اور رسالے بھی کسی اور سے سن لیا کرتا ہوں۔ اور کوشش کے باوجود پڑھائی کسی طرح دچل پائی۔ یقین ہی نہیں ہوتا کہ جو عمر بھر کتابوں کا پرستار رہا ہو وہ دفعتاً کتب بیزار ہو گیا ہو۔ استحالہ یا کایا پلٹ کا لفظ کتابوں میں پڑھا تھا۔ اس کی عملی مثال اپنی ذات میں مل گئی۔

سوال یہ ہے کہ اب اس ذخیرۂ کتب کا کیا ہو جو چھ مہینے سے بالکل بیکار پڑا ہوا ہے۔ سوا اس کے کہ اس ذخیرہ کو اپنے سے الگ کر دوں جسے اس ذوق و شوق کے ساتھ سینت سینت کر جمع کیا تھا اور اپنے وارثوں کے لئے بار کیوں چھوڑ جاؤں۔ ظاہر ہے کہ اس مجموعہ میں میرے محبوب میرے معشوق کتنے ہوں گے۔ جس کی جدائی ذرا دیر کے لئے بھی میرے لئے انتہائی شاق گزرتی تھی۔ لیکن اللہ کی قدرت میں دخل کون دے سکتا ہے۔ کوئی دوسرا اور چارہ نہیں۔

میرا مجموعہ اتنا مختصر ہے کہ اس پر کتب خانے کا اطلاق مشکل ہی سے ہو سکتا ہے۔ بس اسے دو حصوں میں تقسیم کر دوں گا۔ مغربی اور شرقی اور پہلے مغربی کو لوں گا۔ یہ تعداد میں پورے دو ہزار بھی نہیں زیادہ سے زیادہ ۱۸۰۰ ہوں گی۔ اور ان میں ماہناموں اور سہ ماہیوں کی تعداد

بھی شامل کر لی جائے۔ تو کتابوں کی تعداد اور بھی کم ہو جائے گی۔
مشرقی حصہ کتب عامہ میں اردو۔ فارسی۔ عربی کی کتابوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔

کثرت مطالعہ کے اثرات

میں ابتداء سے مطالعہ میں منہمک رہنے کا عادی ہوں۔
عقلائے یورپ کے لٹریچر پڑھتے پڑھتے مذہب کے وجود کا منکر ہو گیا۔
مطالعہ کا عاشق تو تھا ہی قدیم ہند لٹریچر پڑھنے لگا۔ اب کچھ کا ٹا بدلا کہ ہاں مذہب کوئی حقیقت ہے۔ مگر ابھی اسلام کا قائل نہیں ہوا تھا۔ پھر اس ذوق مطالعہ کی بدولت مثنوی رومی پڑھنے لگا۔ اس کے سوز و گداز نے مجھے تڑپا دیا۔ کمرہ بند کر کے اشعار پڑھتا تھا۔ اور وجد میں آکر جھومتا تھا۔ اکبر الہ آبادی ہمارے یہاں آتے رہتے تھے۔ اور میرے الحاد سے انھیں سخت کوفت رہتی تھی۔ اس بار آئے تو مجھ سے پوچھا صاحبزادہ کس کتاب کا مطالعہ کر رہے ہو۔ میں نے بتایا۔ مثنوی پڑھ رہا ہوں۔ فرمایا کچھ حظ آتا ہے۔ میں نے کہا اس قدر حظ آتا ہے کہ میں مثنوی کا دیوانہ ہو گیا ہوں۔ فرمانے لگے جس نے مثنوی کا ثانی دماغ مصنف پیدا کیا تو اس کی تصنیف کس پایہ کی ہوگی۔ اسے تو پڑھو۔

توبہ و انابت اور رجعت بہ اسلام

نصیحت کارگر ہوئی اور میں قرآن پاک کا مطالعہ کرنے لگا۔

پھر قرآن پاک کے صوری حسن اور زیبائی اور معنوی جمال و شکوہ سے
ایسا مسحور ہوا کہ دل و دماغ میں قرآن ہی قرآن لبس گیا۔ مطالعۂ کتب کے
علاوہ میرے دوست مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت بھی میرے لئے مشعل
راہ ثابت ہوئی۔ بے تاب ہو کر تڑپ کر جوش و خروش سے للکارتے تھے۔
عبد الماجد اٹھو۔ چل کر ملحد یورپ میں تبلیغ اسلام کریں۔

علمی و قلمی زندگی کا جائزہ۔

ایک دوسری جگہ سچی باتوں کے تحت مولانا نے اپنی علمی و قلمی
زندگی کا نہایت منکرانہ انداز میں جائزہ اس طرح لیا ہے۔ فرماتے ہیں
منقول از سچ لکھنؤ ۱۱ مارچ ۱۹۳۲ء

" آج سے ۲۰۔۲۲ سال قبل جب میری علمی و قلمی زندگی کی ابتداء تھی
دل طرح طرح کے پر غرور جذبات سے لبریز تھا۔ اور اپنے متعلق ایک۔
عجیب حسن ظن قائم تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اپنی کوئی تحریر ضائع نہ ہو۔
کٹے پھٹے مسوّدات جی میں آتا تھا کہ محفوظ رہ جائیں تو اچھا ہے۔ معمولی
اور خانگی خطوط تک کی اہمیت دل میں رچی ہوئی تھی۔ اسپنسر کی لائف"
لکھی گئی۔ مل کے خطوط کا مجموعہ شائع ہوا۔ اور اپنی شخصیت بھی اپنی نظر
میں ان لوگوں سے کم نہ تھی۔ ہم بھی بڑے آدمی ہیں۔ ہم کیا ان سے کچھ کم
ہیں۔ ایک دن ہماری سوانح عمری ایسی ہی مفصل لکھی جائے گی۔
ہمارے بھی خطوط شائع ہوں گے۔ ہماری بھی ایک ایک سطر کی قدر ہوگی۔
عزت ہوگی۔ قیمت بڑھے گی۔ پرستش ہوگی۔ لوگ آنکھوں سے لگائیں
گے۔ سند پکڑیں گے۔ حوالہ میں پیش کریں گے۔ یہ احمقانہ خیالات
دو چار دن نہیں۔ ہفتوں نہیں سالہا سال تک قائم رہے۔

پانی کے بلبلے میں دم کے دم خودی کی ہوا ابھری تو سوچنے لگا کہ میں بھی کچھ ہوں۔ میری ایک مستقل زندگی ہے۔ میں بھی دریا کی طرح ایک مضبوط و قوی ہستی کا مالک ہوں۔ برسات کے پتنگے کو یہ سودا سوار ہوا کہ عمر نوح ؑ۔ حیات خضر ؑ۔ ملک سلیمان ؑ لے کر آیا ہوں۔

رفتہ رفتہ آنکھیں کھلیں۔ پردے ہٹے۔ ہوش آیا۔ اپنی کجروی کے راز خود اپنے اوپر روشن ہو کر رہیں۔ اپنی بے بساطی نااہلی کے جلوے خود اپنی آنکھوں نے دیکھے۔ بے علمی کا علم اور جہل کا احساس ہوا۔ جن کارناموں پر فخر تھا ان حرکتوں پر شرم آئی۔ کل تک جو ہنر تھے وہ آج عیب نظر آئے۔ اور رات کی تاریکیوں میں جن اعمال کے چمکانے کی تمنا تھی۔ دن کی روشنی میں انھیں ڈھانپنے اور چھپانے کی کوشش شروع ہو گئی۔ اللہ اللہ کسی کی شان کرمی اور شیوۂ ربوبیت کے صدقے جائیے کہ ان عیبوں کی کس طرح پردہ پوشی کر دی گئی۔ سیکڑوں ہزاروں غلطیوں۔ غلط کاریوں کو خلقت کی نظر سے مخفی کر دیا گیا۔ حماقت کی دستاویزوں کو سرے سے گم کر دیا گیا۔ نافہمی اور نااہلی کے اشتہارات کے نقوش لوگوں کے حافظے سے مٹا دیئے گئے۔

آج وہ ساری تقریریں۔ وہ ساری تحریریں لوٹا کر سامنے لائی جائیں۔ جو کچھ زبان سے اور جو کچھ قلم سے نکلا ہے۔ سب کو دہرا کر سامنے لایا جائے۔ تو قلب کو کس درجہ ندامت اور روح کو کتنی اذیت ہو گی۔ لیکن اس کا سامان از خود اس نے کر دیا جو ہر سامان پر قادر ہے۔ انسان اپنی والی لاکھ کوشش کر ڈالتا ہے۔ یہ کہیں اس کے بس کی بات تھی؟ بندہ اس آرزو میں تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا جب بھی کہیں اس پر قدرت رکھ سکتا تھا؟ یہ قوت اور یہ قدرت صرف اس میں بھی جو مجازاً اور استعارۃً نہیں لفظاً اور حقیقتاً جو بندہ پرور۔ بندہ نواز اور ادنیٰ سے

ادنیٰ بندوں کا کفیل و کارساز ہے۔ جس نے دنیا میں اتنی برائیوں سے محفوظ رکھا، ایک ایک تفضیح سے بچائے رکھا۔ کیا آخرت میں بس اس کا فضل و کرم ایسی ہی دستگیری فرمائے گا۔ کیا جس نے ربنا لا تخزنا یوم القیامۃ کی دعا کی تلقین کی ہے۔ وہ اس دعا کو قبول نہ فرمائے گا۔ دنیا کی رسوائیاں تھیں ہی کیا، درحقیقت فضیحت و رسوائی یوم آخرت کی ہے۔ محفوظ وہی ہے جو اس روز محفوظ رہا۔ اور خوش نصیب وہی ہے جس پر اس روز کرم ہوا۔ جس خطا کار کی لغزشیں اور خطائیں، حماقتیں اور نادانیاں، جہالتیں اور شرارتیں، آج دس بیس نہیں پچاس ہزار دو ہزار کی نظروں سے مخفی کر دی گئی ہیں۔ شانِ رحمت و مغفرت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ کل جب نامۂ اعمال کروڑوں اور اربوں اور بے گنتی و شمار سے بڑھ کر ہم جنسوں کے سامنے کھلے تو اس وقت بھی ان کے نقش قدم معدوم ہوں۔ اور ہر فردِ جرم کی ہر سیاہی بردائے عفو کی تابش میں تبدیل ہو چکی ہوگی۔

وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ

شوقِ تحریر و تصنیف: "اپنی ایک پرانی کتاب" کے عنوان کے تحت مولانا موصوف صدق ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں رقمطراز ہیں۔

"شروع سے اب تک اتنا لکھا ہے۔ یا یوں کہیے کہ اتنا قلم گھسیٹا ہے کہ مضمون اور مقالے تو خدا معلوم کتنے اب ذہن سے اتر بھی گئے ہیں۔ کتابوں تک میں اشتباہ ہو جاتا ہے۔ ۱۲ء سے لیکر ۲۳ء یا ۲۴ء تک انگریزی چھوٹی بڑی کئی کتابوں کے ترجمے کئے۔ مکالمات برکلے۔ تاریخ اخلاق یورپ۔ (۲ جلد) وغیرہ۔ تاریخ تمدن انگلستان ۱/۲ ۲ جلد) تاریخ یورپ (۱/۲ جلد) وغیرہ۔ ذہن میں یاد پڑتا تھا کہ کسی انگریزی پبلسر کی فرمائش پر دو انگریزی کتابوں کا ترجمہ اور بھی کیا تھا۔ اور ان میں بھی ایک شاعر

سائنس پڑھی۔ باقی پورا نام نہ کتاب ہی کا یاد پڑتا ہے اور نہ صحیح نام پبلشر کا۔
اور مصنف کا نام تو بالکل ہی نہیں۔ اور کچھ ایسا ہی حال دوسرے ترجمہ سے
متعلق بھی ہو چکا ہے کہ دونوں کتابوں کے کوئی نسخہ موجود ہونے کا کوئی سوال
ہی کیوں پیدا ہوتا۔ خیر اب پچھلے ہفتہ یہیں قصبہ میں محض اتفاق سے اور بالکل
خلاف توقع کتاب کا نسخہ مل گیا۔ مصنف کو مسٹر ملنگ تھے کتاب کا نام (
) پبلشر میکیلن کمپنی۔ ترجمہ کا نام۔ اموران سائنس۔ ضخامت ۱۸۴
تقطیع درسی کتابوں کی۔ سال طباعت ۱۹۲۶ء۔ ترجمہ اس سے دو سال قبل کیا
تھا۔ قیمت اس وقت ۱۰ آنہ تھی۔ چھپائی اچھی روشن صاف تھی۔ کاغذ اچھا
البتہ کتابت وطباعت کی غلطیاں خاصی ہیں خاص کر بلا ضرورت جو اعراب لگا
دیئے ہیں وہ اکثر غلط ہیں۔ اس کتاب میں کل ۱۵ نامور سائنس دانوں کا ہے۔
ان میں سے ۱۳ امریکہ اور یورپ کے باقی دو ہندوستان (بنگال) کے میکیلن
کی ایک شاخ کلکتہ میں تھی۔ وہیں چھپی۔ اور اس وقت اس کی ایجنسی جامعہ
ملیہ جامعہ نگر دہلی کے پاس تھی۔ اب اس کا ذکر محض مترجم کی ذاتی تاریخ و
سوانح کے ایک فرد کی حیثیت رکھتا ہے۔

لغت نویسی کی تمنا۔ حضرت مولانا موصوف کی عین تمنا تھی کہ وہ
اردو زبان کی ایک مکمل لغت اور جامع لغت تیار کریں۔ اس تمنا کا اظہار
کئی جگہ فرمایا ہے۔ اگر کثیر ادبی وتصنیفی مشاغل سے انھیں فرصت ملتی۔
اور ان کی کسن سالگی اجازت دیتی۔ تو یقیناً یہ عظیم الشان کارنامہ بھی ان
کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچتا۔ مگر... اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔
اپنی لغت نویسی کی تمنا کے سلسلے میں صدق ۸ ستمبر ۱۹۶۲ء میں ایک کالم
بعنوان "اردو کے لئے ایک کام" تحریر فرمایا۔ اس میں آپ یوں رقمطراز ہیں۔۔
اردو کی خدمت کے لئے تجویزیں طرح طرح کی پیش ہو رہی ہیں۔ سرکاری

طرف سے بھی اور پبلک کی طرف سے بھی۔ ان میں سے اکثر تجویزیں بجائے خود اچھی اور معقول ہیں۔ لیکن ایک ٹھوس اور تعمیری کام جو اردو زبان کے لئے ضروری ہے۔ اس کی طرف سے اب تک بے توجہی قائم ہے۔ میری مراد ایک اچھی تازہ اور جامع لغت سے ہے۔

فرہنگ آصفیہ کا تو اب اس کی کہنگی کی بنا پر نام ہی نہ لیجئے۔ رہا نوراللغات تو اس کی بھی تالیف پر ۵۰-۵۵ برس سے زائد کی مدت ہو چکی ہے۔ زبان اس عرصہ میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ تیسرا مفصل لغت مہذب اللغات۔ اس کا سلسلۂ طباعت ابھی جاری ہے۔ اس کتاب کی خوبیوں سے انکار نہیں۔ اور [illegible] مؤلف کی جانفشانی کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ لیکن اس کی خامیاں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اور پھر اول تو ایک شخص کی ذاتی تلاش و کاوش اور پھر دائرہ اردو لکھنوی زبان تک اور لکھنوی کیوں کہیئے۔ لکھنؤ کے بھی ایک لسانی خاندان تک اردو کی وسعت اس سے کہیں زائد ہے۔ اور پھر لغت کے جو نئے نئے لوازم نکل آئے ہیں۔ جن سے انگریزی کی آکسفورڈ ڈکشنری وغیرہ مزین ہیں۔ ان سے یہ کتاب کوری ہے۔

پاکستان میں بابائے اردو کی لغت کبیر بے شک ایک ایسی چیز ہے لیکن اول تو اس کی طبع و اشاعت ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ دوسرے ہندوستان تک اس کی رسائی کہاں۔ دوسری لغت جو اس سے جامع تر ہے۔ وہاں کی ترقی اردو بورڈ کی جو اہل نظر کی پوری ایک جماعت کی متحدہ کوشش کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی دشواری یہی ہے کہ وہ ہندوستان کی دسترس سے سرے سے باہر۔ غرض اس کی ضرورت پوری طرح موجود ہے۔ کہ ہندوستان کام خود کرے۔ اور اس کے لئے خوش قسمتی سے یو۔ پی میں بھی ایک اردو اکیڈمی وجود میں آ گئی ہے۔ اور ایک مرکز میں اتنا بڑا کام اور سرا درجہ کے ہی پیمانہ پر بھی دونوں

اکیڈمیاں کر سکتی ہیں۔

چیف ایڈیٹر (مرتب املا) کے علاوہ کم سے کم چار مشیر یا نائب ان کے ہوں۔ اور ان کا صدر دفتر یا لکھنؤ میں، ہو یا پھر دہلی میں یا علی گڑھ میں ہو

سوانح ماجدی

فہرست مضامین اور ایک ضروری تمہید

از ــــــ مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم

[خود نوشت سوانح کا دیباچہ صدق جدید کی گذشتہ اشاعت میں نقل ہو چکا۔ اب اس کی فہرست مضامین (خود مرحوم کی ترتیب کردہ) اور ایک ضروری تمہید درج کی جاتی ہے۔ ع۔ ق۔]

فہرست مضامین

دیباچہ
خودنوشت سوانح ماجدی

از ______ عبدالماجد دریابادی
صدق ۲۲ جون ۷۷ء

مدیر صدق حضرت مولانا مرحوم نے اپنی آپ بیتی (خودنوشت سوانح) بڑے دلآویز انداز میں تحریر فرمائی ہے۔ ابھی تو یہ ایک مسودہ کی شکل میں ہے۔ خدا کرے اس کی اشاعت وطباعت کا انتظام جلد اور بہتر طور پر ہو جائے۔ اس وقت خودنوشت سوانح کا دیباچہ جو مرحوم نے ۲ فروری ۶۷ء کو تحریر فرمایا تھا۔ درج ذیل ہے۔

عزیزوں دوستوں اور مخلصوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کا اصرار ہے کہ ۷۴۔۷۵ سال کی عمر کا ایک بڑا نابالغ اپنی آپ بیتی دوسروں کو سنائے۔ اور نادانیوں۔ سفاہتوں کی لمبی سرگزشت دنیا کے سامنے اپنی زبان سے دہرائے۔

اللہ جانے انسان کو انسان کی لغزشوں۔ رسوائیوں۔ فضیحتوں کی داستان سننے میں کیا مزہ آتا ہے۔ اور یہاں تو خیریت سے سادہ دل میں ایک حجم عفیر اس دھوکے میں پڑا ہوا ہے۔ کہ جلوے کسی عالم فاضل اہل کے ان صفحات میں دیکھنے میں آئیں گے۔ اور موعظے کسی حکیم وعارف باللہ کے سننے میں آئیں گے۔ اللہ اللہ اس عالم آب وگل میں کسی کی صفت ستاری سے کیسے کیسے پردے مجرموں۔ خاطیوں کے چہروں پر اور اچھے اچھے دانش وفراست رکھنے والوں کی فہم وفراست پر ڈال رکھے ہیں۔

بہرحال خوش فہمیوں میں مبتلا رہنے والے اور اپنے کو خوش گمانیوں میں ڈالے رکھنے والے اپنے فعل و عمل کے ذمہ دار و مختار ہیں۔ یہاں تو صرف یہ دعا اپنے پیدا کرنے والے سے ہے۔ کہ جو کچھ آپ بیتی ہے اسے بشری حد تک بے کم و کاست سپرد قلم کر ڈالنے کی توفیق اس بدہمت کو ہو جائے (حد بشری کی قید اس لئے ضروری ہے کہ راست گوئی کا جو حق ہے اسے زبان قلم سے اپنے حق میں ادا کرنا بجز نبیٔ معصوم اور کس کے بس کی بات ہے۔) ہم ایسوں کے لئے یہی بہت ہے کہ قلم کا دامن کذب صریح و افترائے مبین سے آلودہ نہ ہونے پائے۔ بہرحال آرزو و کوشش کے ساتھ دعا بھی بندہ کی یہی ہے اور اس کا قبول کرنا اسی کے ہاتھ میں ہے جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔

تسوید و تحریر کی پہلی بنیاد تو جولائی ۵۲ء میں پڑی۔ اس وقت خود گذشت کی ترتیب تاریخی پیش نظر تھی۔ مگر اس طرح تحریر بڑی ہی طویل و ضخیم ہوتی جا رہی تھی۔ چند ہی ورق کے تجربہ کے بعد کام روک دینا پڑا۔ اور جنوری ۵۴ء کے آخیر سے نقشہ بدل کر اور طوالت سے بچ کر قلم برداشتہ از سر نو لکھنا شروع کیا۔ اس کے لئے وقت پابندی کے ساتھ روزانہ نہ نکل سکا۔ وقفے اور ناغے درمیان میں کثرت سے اور لمبے لمبے ہوتے رہے۔ جوں توں مسودہ اول ۴؍اگست ۵۸ء کو ختم ہو گیا۔ لکھنے کی واقعی مدت کل ۵ مہینے کی رہی۔ مسودہ کٹ پٹ بہت گیا تھا۔ میرے بعد کسی سے چلائے نہ چلتا۔ اس لئے یوم جمعہ ۲۶؍جون ۵۹ء کو اسے اپنے ہاتھ سے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ صفائی محض نقل نہ رہی۔ اضافہ۔ ترمیم۔ کاٹ چھانٹ اچھی خاصی ہوتی گئی۔ اور تکمیل ستمبر ۵۹ء میں ہو پائی۔ نظرثانی کا سلسلہ ہر سال دو سال کے بعد وقتاً فوقتاً ۶۴ء اور ۶۵ء کی نظرثانی اچھی طرح یاد ہے۔ اور اب تازہ ترین نظرثانی کی نوبت ۶۶ء میں آرہی ہے۔ جب من کا ۷۵ واں سال ختم ہو کر ۷۶ واں سال شروع ہونے کو ہے۔ اور یہ سطریں اللہ کا نام لے کر آج جمعرات ۱۰؍فروری ۶۶ء (۱۹؍شوال ۸۵ھ) کو ختم ہو رہی ہیں۔

اور آئندہ کا حال کون جانے۔ کتاب اغلب ہو کہ اگر چھپی بھی تو میری زندگی میں نہیں۔ میرے بعد ہی چھپ سکے گی۔ میری تحریریں میری زندگی میں زیادہ تر میری بدخطی کے باعث جب غلط در غلط بلکہ کہیئے کہ کبھی کبھی مسخ ہو کر چھپا کیں تو ظاہر ہے کہ اپنے بعد صحت طبع وکتابت کی امید بعید بھی کیسے کر سکتا ہوں۔

حسب روایت شیخ سعدی رح۔ لوگوں نے لقمان سے پوچھا! یہ تمیز و دانش کس سے سیکھی۔ جواب ملا بے تمیزوں بے ہنروں سے۔ جو خامیاں ان میں دیکھیں۔ بس ان سے احتیاط برتی۔ عجب کیا کہ اللہ کے بعض بندے کچھ اسی نوعیت کے سبب اس خرافات نگاری سے حاصل کرلیں۔ اور اس کوڑے بلکہ گھورے کے ڈھیر کو کرید کر قدرت کے کچھ موتی اس سے چن لیں۔ اور جس نے ساری عمر تباہ کاری کی نذر کردی اس کے لبگاڑ سے اپنے بناؤ کا کچھ سامان فراہم کرلیں۔

بہرحال و بہر صورت لکھنے والا اپنے حق میں دعائے خیر و مغفرت کی درخواست اپنے ہر پڑھنے والے سے بہ منت و لجاجت کر رہا ہے۔ دعا فرمایئے اور اپنا اجر اپنے رب سے پایئے۔

عبدالماجد

۳ فروری ۶۷ء

ایک ضروری تمہید

یہ ورق پڑھنے والے کے ہاتھ میں کب پہنچیں۔ اور زمانہ اس وقت تک کتنا آگے بڑھ چکا ہو۔ اس لئے شروع ہی میں دو چار باتیں بطور تمہید جان لینا ضروری ہیں کہ بغیر ان کے مطلب و مفہوم کسی طرح واضح نہ ہو سکے گا۔ اس مسودہ کی تحریر کا زمانہ ۱۹۶۷ء اور جو حالات اس میں درج ہیں وہ صرف دس ہی بیس سال قبل کے نہیں بلکہ ۷۵۔۸۰ سال قبل تک کے ہیں۔ تو آگے پڑھنے سے قبل کچھ تو سمجھ لیجئے کہ وہ زمانہ کیا اور کیسا تھا۔ اور اس کے نمایاں خط و خال کیا تھے۔

صرف میں آنے والی چیزیں کھانے پینے کی۔ پہننے اوڑھنے کی۔ کیا اور کس قسم کی تھی۔

انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے شروع میں قیمتیں نہایت ارزاں تھیں۔ رفتہ رفتہ قیمتیں بڑھنا اور چڑھنا شروع ہوئیں۔ یہاں تک کہ یورپ کی دوسری جنگ عظیم جب پانچ سال بعد ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی۔ تو چیزوں کے نرخ دوگنے ڈھائی گنے بلکہ تگنے ہو گئے تھے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں انگریزی حکومت ہندوستان سے اٹھی اور ملک کی حکمرانی خود ملک والوں کے قبضہ میں آئی۔ اس کے بعد سے گرانی کی جیسے حد و نہایت ہی نہیں رہ گئی۔ چنانچہ اب ۱۹۶۷ء میں پرانی قیمتیں آٹھ گنی نہیں دس گنی ہو گئی ہیں۔ اور اب بھی ان کے رکنے اور ٹھہرنے کے کوئی آثار نہیں۔ بلکہ آثار مزید گرانی اور گرانی در گرانی ہی کے ہیں۔ اور روپیہ کی قیمت قدرتاً اس تناسب سے [illegible] گئی۔

چنانچہ میرے بچپن میں پچاس روپیہ ماہوار کی آمدنی والا اوسط درجہ کا خوشحال سمجھا جاتا تھا۔ اب اتنی مطمئن زندگی چار ساڑھے چار سو ماہوار آمدنی رکھنے والے کو بھی نصیب نہیں۔ غلہ۔ کپڑا سوتی اور ریشمی گوشت گھی دودھ دہی نمک۔ شکر۔ ترکاری۔ پھل۔ جوتا۔ سونا۔ چاندی۔ کوئلہ لکڑی۔ کوئی چیز بھی شدید ترین گرانی سے محفوظ نہیں۔ اور یہی حال ریل کے کرایہ ڈاک کے محصول اور ہمارے سرکاری ٹیکسوں کا ہے۔ شلہ پر آفت سب سے زیادہ ہے۔ اور غلہ میں بھی گیہوں اور چاول پر سب سے بڑھ کر شلہ تک کم سے کم ہمارے صوبے میں اور اب صوبہ کا نام ہی ریاست پڑ گیا ہے۔

زمین داری کا رواج قائم تھا۔ اور جو زیادہ بڑے زمین دار تھے۔ وہ تعلقدار کہلاتے تھے۔ زمیندار جو معمولی درجہ کے ہوتے تھے۔ وہ بھی خوش حال ہوتے تھے۔ اور بڑے زمینداروں کا کہنا ہی کیا۔ اور جو طبقہ تعلقداروں کا تھا۔ ان میں راجہ مہاراجہ نواب ہوتے تھے۔ اور دولت کی ریل پیل ان کے یہاں رہتی تھی۔ نظام حکومت میں انقلاب کے بعد یہ ادارہ حکم سرکار سے توڑ دیا گیا۔ اور کتنے زمیندار اور خاندان دیکھتے ہی دیکھتے مفلوک الحال ہو گئے۔ جو کچھ معاوضہ انھیں ملا۔ وہ ان کی پچھلی آمدنیوں سے کوئی مطابقت ہی نہیں رکھتا۔ خود ہمارا خاندان بھی ایک حد تک اس زد میں آیا۔

میرے لڑکپن تک سواریاں ریل کے علاوہ بگھی (فٹن۔ پالکی گاڑی۔ لینڈو۔ ٹمٹم) کے بیل گاڑی اور اونٹ گاڑی تھیں۔ سواری کے جانور گھوڑے۔ ہاتھی اور اونٹ تھے۔ اور زنانی سواریاں ڈولی۔ پالکی۔ نینس اور میانہ (جو پہلے ہی کی تھیں: جنھیں (ایک خاص قوم) کہار اٹھا کر لے چلتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ گھٹتی گئیں۔ اور مٹتی گئیں۔ اور پہلے سائیکلیں آئیں۔ اور پھر تانگے۔ اور اس کے بعد رکشے چالو ہوئے۔ موٹر سائیکل اسکوٹر کا دور آیا۔ ٹرام گاڑیاں اور بسیں بھی عام ہو گئیں۔ اور ہوائی جہاز بھی ہر وضع اور ہر سائز کے فضا میں اڑنے لگے۔

اس انقلاب کا اثر تمدن معاشرت کے ہر شعبہ پر پڑا۔

میرے بچپن میں ہندو وقتاً فوقتاً مسلمان ہوتے رہتے۔ کسی مسلمان کا مرتد ہو کر ہندو دھرم قبول کر لینا ناقابل تصور تھا۔ رفتہ رفتہ آریہ سماجیوں نے کسی کسی کو مرتد کرنا شروع کیا۔ اور ایک زمانے میں تو شدھی کی تحریک بڑے پیمانے پر چل نکلی۔ اسی طرح کسی کلمہ گو عورت یا لڑکی کا کسی ہندو یا سکھ کے عقد میں چلا جانا ناقابل تصور تھا۔ رواج کی تبدیلی کے بعد یہ خواب بھی ایک حقیقت بن گیا۔

پردہ کا رواج ہندو گھرانوں میں بھی شرافت و اعزاز کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اور مسلمانوں کے اونچے خاندانوں میں تو پردہ شدت ہی سے نہیں افراط کی حد تک رائج تھا۔ اور تعلیم مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کی برائے نام ہی تھی۔ اور شرم و حیا حدود شریعت و عقل سے بھی تجاوز کیے ہوئے تھی۔ چنانچہ کوئی شریف بیوی اپنے شوہر کا نام کسی حال میں بھی اپنی زبان پر نہیں لا سکتی تھی۔ اور شوہر کے نام سے آگے سسرال کا نام۔ سسرالی عزیزوں کے نام۔ شوہر کے نام سے ملتے جلتے نام تک سب اس کے لیے حرام تھے۔ دیکھتے دیکھتے صورت بالکل بدل کر رہی۔ بڑی بڑی شریف بیویاں یہی نہیں کہ بے تکلف باہر بے پردہ گھومنے پھرنے لگیں۔ بلکہ بے پردگی کے ساتھ بے حجابی بھی شامل ہوتی گئی۔ بلکہ نوبت بے ستری کی بھی پہنچ گئی۔ سنہ ۶۷ء میں مسلمانوں کی زنانی آبادی میں بی۔ اے۔ ایم۔ اے ایل۔ ایل بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی وغیرہ بکثرت آنے لگی ہیں۔ اور ملازمت اور کاروبار کا کوئی شعبہ کوئی پیشہ۔ کوئی عہدہ ان سے خالی نہیں۔ اگست سنہ ۱۹۴۷ء تک سارا ہندوستان انگریزوں کے تابع تھا۔ پاکستان بنا تو پنجاب اور بنگال دو دو ٹکڑے ہو کر پاکستان میں شامل ہو گئے۔ اور سندھ اور بلوچستان اور صوبہ سرحد وغیرہ تو پورے ہی پاکستان کے جزو بن گئے۔ اور ہندوستان

کے مسلمانوں کی آبادی تقریباً دس کروڑ سے گھٹ کر ۱/۲ ۴ کروڑ رہ گئی۔ خاندان کے خاندان مسلمانوں کے خصوصاً یو۔پی کے مسلمانوں کے اجڑ گئے مٹ گئے۔ اور کٹ گئے۔ ایک بھائی یہاں دوسرا بھائی وہاں۔ باپ ادھر تو بیٹا ادھر وہ انتری تفری ہوئی اور اکھاڑ پچھاڑ ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ اور لکھوکھا مسلمانوں کی جو جانیں گئیں۔ عزتیں لٹیں، عظمتیں لٹیں اور کروڑوں کا مالی نقصان ہوا۔ ان کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ ہندوستان کی حکومت سرکاری کاغذوں پر نامذہبی قرار پائی۔ لیکن مثلاً گاندھی جی اور جواہر لال نہرو وغیرہ کی تتو تھمبو کے باوجود بھی گویا ہندو حکومت بن گئی۔ مسلمان ہراس زدہ و حواس باختہ احساس و خودداری کھو بیٹھے اور ہر معرکہ میں اکثریت اور حکام پولس کے ہاتھوں پٹنے اور مار کھانے لگے۔

میرے بچپن تک مسلمانوں کا ایک مخصوص معاشرہ تھا۔ خصوصی آداب و اطوار تھے۔ خاص جن کا لباس خاص قسم کے بال خاص قسم کے کھانے پینے وغیرہ تغیر و انقلاب کی آندھی نے یہ سارا شیرازہ منتشر کر دیا۔ پہلے توانگریزیت کا دور دورہ رہا۔ وضع قطع۔ مکان و لباس۔ کھانا پینا سب مغربی طریق کا ہوتا چلا گیا۔ اور پھر اب ہندو تہذیب و معاشرت کا سیلاب آیا ہے۔ جو نظام تعلیم و نصاب تعلیم کی رو سے ساری ہی انفرادیت اسلامی کو بہائے لئے جا رہا ہے۔ احساس کمتری کے ساتھ ساتھ ہندؤں کی رضاجوئی اور خوشامد کا جذبہ پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ اور معاشرے علمی تیز بہی مرعوبیت سے لے کر اعتقادی اور دینی انسداد تک کی راہ ہموار ہو گئی ہے۔

میری پیدائش کے وقت انگریزی سرکار کا رعب و اقبال دل و دماغوں پر چھایا ہوا تھا۔ اور اچھائی برائی کا بھی پیمانہ ہاتھ میں تھا۔ یہ کیفیت ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۶ء تک باقی رہی۔ اس کا پہلا دھچکا۔

جاپان کے ہاتھوں سے روس کی شکست سے پہنچا۔ کہ ایک مشرق نے مغرب کے غرور کا سر نیچا کیا۔ پھر ملک میں آزادی کی طلب پیدا ہوئی۔ جس کی بنیاد انگریزی تعلیم کے اثر سے چند سال قبل پڑ چکی تھی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں جو نام کے خلیفۃ المسلمین (سلطان ٹرکی) کے خلاف اٹلی نے طرابلس میں اور سنہ ۱۹۱۲ء میں بعض اور دوسرے ملکوں نے بلقان کی جنگ چھیڑی۔ اس نے مسلمانوں میں فرنگیوں کے خلاف عام بددلی اور نفرت پیدا کر دی۔ مولانا محمد علی کے انگریزی ہفتہ وار "کامریڈ" اور اردو روزنامہ "ہمدرد" نے۔ اور مولانا ابوالکلام کے ہفتہ وار "الہلال" نے اور مولوی ظفر علی خاں کے روزنامہ "زمیندار" نے اس تحریک کو ترقی دی۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت و ترک موالات پورے جوش و خروش کے ساتھ حکومت برطانیہ کے خلاف شروع ہو گئی۔ اور گرفتاری و قانون شکنی اور سزایابی گاندھی جی کی تلقین کے اثر سے بجائے توہین و ذلت کے دلیل عزت و علامت سرکاری بن گئیں۔

اپنے ہاتھ سے کام کرنا اس وقت عیب میں داخل تھا۔ اور جو گھرانے ذرا بھی خوش حال تھے۔ ان میں نوکری چاکری رواج عام تھا۔ گھر میں اور زنان خانوں میں مامائیں۔ اصیلیں۔ اور درمیانی گھرانوں میں لونڈیاں۔ باندیاں۔ ہمارا گھر ایک چھوٹے زمیندار کا بھی تھا۔ اور ایک خاصے معزز عہدہ دار کا بھی۔ قدرتاً ہمارے یہاں اندر باہر ملا کر ایک پوری پلٹن نوکروں کی موجود تھی۔ اور ان ہی میں مامائیں یعنی دائیاں کھلائیاں بھی داخل تھیں۔ شریعت کے علاوہ اب قانون وقت کے لحاظ سے بھی۔ لونڈی۔ غلاموں، کا کوئی جواز نہ تھا۔ لیکن عملاً یہ سب عموماً زرخرید ہی کے حکم میں تھے۔ عام انسانی حقوق تک سے محروم گویا گھر کے پلے ہوئے جانور ہیں۔ صرف کوئی کوئی اتنا شفیق اور رحم دل مل جاتے تھے۔

اور انھیں میں میرے والد مرحوم بھی تھے۔ اردو کا زور سنہ ۴۷ء تک رہا۔ آزادی ملتے
ہی ہندی والوں کا تعصب اردو پر ٹوٹ پڑا۔ کچہریوں۔ دفتروں۔ سڑکوں کی
تختیوں۔ سے اردو حروف چھیل چھیل کر کھرچ کھرچ کر مٹائے گئے۔ اب سنہ ۶۷ء
سے اور خیر کچھ کچھ پیر ٹیکنے کی اردو والوں کو ملنے لگی ہے۔ عدم محض سے اتنا بھی
غنیمت ہے۔ سنہ ۲۲ء تک خلیفۃ المسلمین کا بھرم دلوں میں قائم تھا۔ اور۔
ہندوستان کی خلافت کمیٹی نے خلافت اسلامیہ کا جوش و خروش از سر نو دلوں
میں تازہ کر دیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال نے باقاعدہ یہ منصب عظیم ہی مٹا دیا۔
محمد علی یہاں بہت چیخے چلائے۔ تڑپے نتیجہ کچھ نہ نکلا۔
سنہ ۴۸ء تک مملکت آصفیہ ایک ریاست نہیں پوری سلطنت تھی۔
اپنا سکہ اپنا ڈاک خانہ اپنی ریل وغیرہ۔ ۴۸ء میں اس کا قلع قمع ہو کر رہا۔
اور حیدرآباد جو سارے مسلمانان ہند کا ملجا و ماویٰ تھا۔ آندھرا پردیش بن کر
مملکت صدر کا ایک جزو حقیر بن گیا۔

یہ سب معلومات ذہن میں رہیں تو آگے کی بہت سی مشکلات از
خود حل ہوتی چلی جائیں گی۔

دیباچہ معاصرین

صدق ۱۷ دسمبر ۱۹۵۷ء

مولانا مرحوم نے اپنے چند ناموراور دل عزیز معاصرین کے حالات زندگی. کردار و اوصاف کا ذکر بڑے پرخلوص انداز میں کیا ہے۔ یہ خاکے ابھی مسودہ ہی کی شکل میں ہیں۔ اس کے کچھ باب صدق میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس غیر مطبوعہ تصنیف کا دیباچہ بقلم خود یوں تحریر فرمایا ہے۔

"معاصرت کا حق اگر ۸۰ - ۸۲ سال دنیا میں بسر کرکے اگر کسی کو بھی نہیں پہنچتا۔ تو پھر کسی کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اور بات کے لئے منہ کھولنے کا حق اگر ایک پیر فرتوت کو نہیں پہنچتا تو کس کو ملتا۔

معاصرین کے سرسری خاکوں میں ذکر آگیا ہے اپنے قریب ترین عزیزوں کا نیز ان بزرگوں کا جو کسی بھی حیثیت سے اپنا اثر ڈال گئے۔ اپنی شخصیت سے اس ناقص پر۔ اس خود نوشت کے پڑھنے والے ایک بات ضرور یاد رکھیں کہ لکھنے والا دس برس کی مدت تک ۱۷ سے ۲۷ برس کی عمر تک مذہب کی قید سے بالکل ہی آزاد رہا ہے۔ اور باتیں لامذہبیوں اور دہریوں (زیادہ صحیح لاادریوں) کی ہی کر گیا ہے۔

افسوس ہے کہ ایک آدھ صاحب کی وفات کا پتہ بالکل نہ چل سکا۔
کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے۔

چالیس بڑے —
دس چھوٹے —
کچھ برابر والے —

کبھی کسی ایک عنوان کے اندر ڈیڑھ دو صاحب آگئے ہیں۔ اور اسی طرح

کل تعداد سو سے کچھ اندر مذکورین کی ہوگئی ہے۔ بیشتر حصہ مرحومین کا ہے صرف چار پانچ فی صدی ماشاء اللہ زندہ ہیں۔ عموماً اہل تذکرہ کا تذکرہ ان کے ناموں کے تحت رکھا گیا ہے۔ لیکن بعض صاحبان کے تذکرہ کو کوئی گھریلو نام دیا گیا ہے۔ بجائے اصل نام کے اور کسی شخصیت کی زندگی کے کسی خصوصی پہلو کو گھریلو زبان کچھ اور کہہ گئی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبد العلی کو محض ڈاکٹر صاحب یا چودھری خلیق الزماں کے بجائے صرف چودھری صاحب اور مولانا ابو الحسن علی ندوی کی بجائے صرف علی میاں لکھا گیا ہے

عبد الماجد

۱۷ مئی ۱۹۷۴ء

ایک عجیب تحفۂ عید

از — عبدالماجد ۔ صدق ۲۵ ستمبر ۵۱ء

عید میں اب بھی کوئی کوئی مہربان میرے مذاق طبیعت سے ناآشنا۔
عید کارڈ بھیج دیا کرتے ہیں۔ اب کی عید کے موقع پر میرے ذاتی پتہ (دریاباد)
پر نہیں۔ لکھنؤ کے دفتری پتہ پر جنوبی ہند سے۔ میرے غلط نام لیکن صحیح دفتری پتہ
سے ایک رجسٹرڈ پیکٹ موصول ہوا۔ اور دفتر میں کھول لیا گیا۔ اور مجھے ۸ رشوال
کو ملا۔ کیا عرض ہو کہ پیکٹ کس کی طرف سے تھا۔ اور پیکٹ کے اندر کیا کیا نکلا۔
ایک نفیس کارڈ جس کے عین صدر میں ایک نامحرم خاتون کا سینہ تک فوٹو۔
تجدد کی پوری اداؤں اور نسائیت کے پورے مظاہرہ کے ساتھ۔ یہی فوٹو گویا
متن اور شاعرانہ عبارت گویا حاشیہ۔ ایک نفیس ریشمی رومال عطر میں بسا ہوا۔
سبز ریشم سے بھیجنے والی صاحبہ کا نام کڑھا ہوا۔ اور رومال کے طرف انہی صاحبہ
کا دوسرا فوٹو۔ کان اور پیشانی کے دوسرے زیوروں کے مظاہرے کے ساتھ
چسپاں۔ بھیجنے والی خاتون کوئی گمنام ہستی یا کوئی ایکٹرس نہیں۔ ایک معلوم
ومعروف شاعرہ ومضمون نگار خاتون۔ قومی مجلسوں کی زیب و زینت۔
اس کو سرفرازی کے لئے مدیر صدق جیسے خشک مزاج۔ بدمزاج۔
ناقدرے کا انتخاب فرمانا ستم ظریفی میں اپنی مثال آپ ہے۔ نسائی آرٹ اور
سجاوٹ۔ روشن خیالی کے کمالات کی داد دینے والے اور قدر کرنے والے
تو ابھی "نگار" لکھنؤ اور "پیام دکن" کی سلامتی کے صدقے میں چشم
بد دور بہت سے موجود ہیں۔

ایک خارج شدہ تصنیف

از ـــــــــ عبدالماجد ـــ صدق ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۷ء

الہ آباد یونیورسٹی کے ایک ایم۔ اے (اردو) سے ابھی ملاقات ہوئی۔ ایم۔ اے کئے ہوئے انھیں تین ہی چار سال ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ۔ آپ کی کتاب "فلسفۂ اجتماع".. کو جو ہمارے کورس میں تھی۔ اسے خوب پڑھ چکا ہوں۔ انا للہ الخ

یہ کتاب میری بہت ابتدائی تصنیف میں سے ہے۔ اور اب اسے چھپے ہوئے ۳۰ سال ہو چکے ہیں۔ انجمن ترقی اردو نے اسے چھاپا تھا۔ دوسری تصنیفی خامیوں سے قطع نظر کتاب الحاد و ضلالت کے مضامین سے لبریز ہے۔ کوئی ۲۵ سال ہوئے اسے اپنی تصانیف سے خارج اور اس کی اشاعت ممنوع قرار دے چکا ہوں۔ اس علم سے کہ اس کی اشاعت اب بھی جاری ہے۔ بلکہ یونیورسٹی کے اونچے کورس میں داخل ہے۔ جتنا صدمہ مجھے ہو سکتا تھا وہ بالکل ظاہر ہے۔ آٹھ دس سال ہوئے اس قسم کی اطلاع پٹنہ یونیورسٹی سے ملی تھی۔ اور اسی وقت وائس چانسلر کی خدمت میں اس کے متعلق مناسب گزارش حال کی گئی تھی۔ اس کے بعد اسی نوعیت کا یہ دوسرا صدمہ ہے۔

الہ آباد یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو۔ نیز کتاب کے ناشر کو ابھی فوراً لکھ رہا ہوں۔ اس اعلان عام سے دو مقصد ہیں۔ کتاب مذکور سے تبری و بے تعلقی کی تاکید مزید۔ اہل حل و عقد سے کتاب کے خارج کرانے کی استدعا۔ جو گمراہیاں متعدد قسم کی ہوتی ہیں۔ ان سے پیچھا چھوٹنا بھی کیسی قدر دشوار ہوتا ہے اور ان کا وبال کتنے دنوں تک اور کتنے طریقوں سے جھیلنا رہتا ہے۔

مکتوبات ماجد
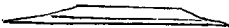
مولانا موصوف نے اردو کے مکاتیبی ادب میں بھی بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ منفرد طرز نگارش کے باعث آپ کے خطوط بڑے ہی دلچسپ اور پُر از معلومات ہوتے ہیں۔ ان میں "مختصر نویسی"، حیرت انگیز حد تک پائی جاتی ہے۔ مولانا کی مختصر نگاری کے نمونے کے طور پر دو خطوط درج ہیں۔

(۱)

مکتوب جناب مولانا عبدالماجد دریا بادی

بنام: جناب مولانا شاہ غلام حسنین صاحب چشتی سلیمانی پھلواروی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۴ر جنوری ۱۹۷۰ء . . . . دریا باد ضلع بارہ بنکی

برادرم وعلیکم السلام

(۱) تحفۂ شمس المعارف پہنچا . . . . سبحان اللہ

(۲) جلوۂ سلیمانی نظروں میں پھر گیا . . . . . . ماشاء اللہ

(۳) صدق میں چند سطریں گنجائش نکلنے پر نکلیں گی . . . . . انشاء اللہ

(۴) والانامہ پہنچا۔ تصویب وتحسین لئے ہوئے۔ بارک اللہ

(۵) ضمناً صحت وخیریت بھی دریافت ہوگئی۔ الحمد للہ

والسلام دعاگو ودعا خواہ:۔ عبدالماجد

بنام ۔ محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء ناگپور

بسم اللہ

صدق

دریاباد ضلع بارہ بنکی ۲۶ مئی سنہ ۱۹۶۰ء

برادرم السلام علیکم ۔

شاعرزادی کے عقد کا رقعہ دعوت زبان شعر میں موصول ہوا۔
اس حقیقت پر ۔ سبحان اللہ
تقریب سعید پر ۔ الحمدللہ وبارک اللہ
حاضری سے معذوری ظاہر ہی ہے ۔
دعائے ماثور اَللّٰھُمَّ اَلِّفْ بَیْنَھُمَا ۔ یہیں سے
پڑھے دیتا ہوں ۔

والسلام

دعاگو
عبدالماجد

۱۔ نذرِ عقیدت ۔ دورانِ حیات ۔

منجانب شعرائے کرام ۔

نذرِ عقیدت (دورانِ حیات)

اے ادیبِ ایشیا!

(حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت
از ______ ضیا بانی

اے مفسرّ اے محقق۔ اے خطیبِ خوش بیاں
اے جلیل القدر ناقد! اے حکیم نکتہ داں
اے مفکر، اے مبصرّ، اے وطن کے پاسباں
اے عظیم المرتبت اے قوم کے روحِ رواں
اے ادیبِ ایشیا، اے نازشِ ہندوستاں
طول و عرضِ ملک میں لاکھوں ہیں تیرے قدرداں
اے کہ تیری ذات ہے سرمایۂ صد افتخار
رشک کے قابل ہے تیرا خامۂ معجز نگار
تیری عظمت سے کوئی انکار کرسکتا نہیں
کوئی سورج کو پسِ دیوار کرسکتا نہیں
تیرا اک اک حرف ہے علم و ادب کا شاہکار
تیرے ہی دم سے ہے قائم آج اردو کا وقار
تو نے سچائی کو بخشی ہے حیاتِ پائدار
ناز فرمائی ہے جس پر رحمتِ پروردگار

علم و فن کی تو نے خدمت کی ہے ستر سال تک
تیرے مداحوں میں تھے آزاد اور اقبال تک

تو نے فن نقد کو بخشی وہ معراجِ کمال
جس کو کہہ سکتے ہیں اربابِ بصیرت لازوال

سانس لیتا ہے اسی دنیائے آب و گل میں تو
باتیں یوں کرتا ہے گویا ہے ہمارے دل میں تو

تیری ہر تحریر ہے مہر و محبت کی کتاب
تیرا ہر اک لفظ ہے گویا صداقت کا رباب

تیری ہر تصنیف حکمت کا چھلکتا جام ہے
"مجتہد" ہے ندرتِ اسلوب تیرا کام ہے

تیرے ہر نقطہ میں پنہاں "صدق" کا پیغام ہے
ذہن تیرا واقعی گہوارۂ الہام ہے

تلخ تر کوئی حقیقت تجھ سے پوشیدہ نہیں
تجھ کو فطرت نے عطا کی ہے نگاہ دوربیں

نظمِ تدبیر سیاست میں ہے گمراہی ہنوز
امن کی منزل سے ہیں نا آشنا راہی ہنوز

دور کرنا چاہتا ہے دہر سے بغض و عناد
تیرا نعرہ "اتحاد" و اتحاد و اتحاد

کس قدر لطفِ بیاں ہے کس قدر سوز و گداز
ہیں تری تحریر میں بکھرے ہوئے دنیا کے راز

تجھ کو دنیا کی خبر ہستی کا ہے عرفان بھی
تیری نظروں میں البشر کی انقلابی شان بھی

دیکھتا ہے عالم ایجاد کی ہر واردات
تو بہر لمحہ کیا کرتا ہے تنقید حیات
کارناموں کو ترے دنیا بھلا سکتی نہیں
نقش جو تو نے بنایا ہے مٹا سکتی نہیں
سبز ہے تیری عرق ریزی سے اردو کا چمن
گل بداماں ہے ترے دم سے ریاض علم و فن

مُرشدِ اُردو

از ——— مغیث الدین فریدی

تیرے قلم نے بزم ادب میں فکر رسا کی شمع جلادی
شعر سے بڑھ کر تیرے فقرے نثر کی عظمت تو نے بڑھادی
حسنِ بیاں سے طرز ادا سے حرف کے آئینہ کو جلادی
تو ہی فروغ شمع سخن ہے مرشدِ اردو نثر کے ہادی

رہبرِ عالی۔ فاضل۔ ناقد
عبد الماجدؒ دریابادی

ذکرِ ماجد

از پروفیسر اختر بستوی

عاشقانِ نثر کی نظروں میں جو محبوب ہے
جس کا اندازِ بیاں ناقد کو بھی مرغوب ہے

جس کی انشا میں زباں کی سحرکاری خوب ہے
جو قلم کا ہے دھنی اور صاحبِ اسلوب ہے

ابتدا میں فلسفہ کی سمت جس نے کی نگاہ
دونوں ہی ادوار میں قائم رہی بے اشتباہ

بعد ازاں جس نے چنی اپنے لئے مذہب کی راہ
جس کے قلبِ بے ریا میں خدمتِ اردو کی چاہ

جس کے تحقیقی مقالے ہیں ادب کے شاہکار
جس نے گلزارِ صحافت کو دیئے ہیں گل ہزار

جس کے تنقیدی مضامیں بن گئے ہیں یادگار
جس نے صد ہا طور سے اردو کو بخشا ہے وقار

جس کی عظمت بے نیازِ گردشِ ایام ہے
آج اس کا ذکر اہلِ علم و فن میں عام ہے

جس کا دریاباد گھر ہے جس کا ماجد نام ہے
میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک ضروری کام ہے

حضرت ماجدؔ دریابادی

اسماء عصمت انصاری

زباں ایسی گماں ہو جس میں دریا کی روانی کا
بیاں ایسا کھنکتے ہوں کہیں جام و سبو جیسے
تفکر اور تخیل کی اداکاری کا ہر منظر
خراماں نور و نکہت ہوں چمن میں چار سو جیسے
ہر اک سادہ سے مضموں میں بھی اس انداز کے تیور
اٹھا ہو لے کے انگڑائی ابھی اک ماہرو جیسے
وہ الفاظ و معانی کی صدا دیتی ہوئی دنیا
کسی کھلتے ہوئے گلزار کا جوشِ نمو جیسے
بیان فلسفہ ہو یا حدیث علم و حکمت ہو
قریب دل کسی سے ہو رہی ہو گفتگو جیسے
اشاروں، استعاروں اور کنایوں کے وہ میخانے
سر دست حنائی ساغر و جام و سبو جیسے
مناظران مسائل کی براگندہ نقابی تھے
کھڑا ہو حسن آئینے میں اپنے روبرو جیسے
ہر اک فکر و نظر کے آئینہ خانہ کا وہ عالم
رواں باہم دگر ہو کاروانِ رنگ و بو جیسے
جنون شوق کی ہر ہر قدم پر شعلہ سامانی
ہو صدیوں سے کسی کو آپ اپنی جستجو جیسے

جہاں میں اب ہے یوں ہی حضرت ماجد کی ہستی بھی
زبان اہل عالم میں زبان لکھنؤ جیسے

پیر دانا

از ابوالانوار ۔ رمزی ۔ اسّادی جودھپورا

جارہا ہے علم وفن کے روپ میں — کارواں اک راہرو کے روپ میں
وادیٔ حکمت میں ہیں جس کے قدم — بڑھ رہا ہے سوئے منزل دم بدم
عالم دیں فلسفہ دان حرم — اک صحافی ! پیر دانائے مجسم
بادہ بنکی کا وہ سرخیل عجیب — وہ مدیر "صدق" ، پاکیزہ ادیب
ذہن جس کا کہکشاں بردوش ہے — جس کی تحریروں میں نور پوش ہے
درس قرآں دو زبانوں میں دیا — ترجمہ انگریزی واردو میں کیا
عطر گل صہبائے شبنم بھر دیا — دونوں پیمانوں میں زمزم بھر دیا
ایسا سمجھایا ہے رب کی بات کو — دان بنا کر رکھ دیا ہے لات کو
یہ قصیدہ گوئی تو ہے نام کی — قدر کرنی چاہیے اس کام کی
کردیا ہے خدمت دین وادب — ہو میسّر ہم کو بھی ایسی طلب
یہ لکھا ہے آگہی کے واسطے — طالبوں کی دل دہی کے واسطے
بن گئے ذرے بھی جب نیّر لقب — کیوں نہ ہم اس کو کہیں شمسی ادب

ہے تہہ دل سے یہ رمزیؔ کی دعا
دے خدا ان کو کارناموں کی جزا

مولانا دریابادی

خراجِ عقیدت

(دورانِ حیات) از منور بستوی

بزم در بزم چھڑا ذکر اہم ماجد کا
اللہ اللہ کھلا آج بھرم ماجد کا

آپ کی ذات سے پایا ہے فروغ اردو نے
گویا اردو پہ بہت کچھ ہے کرم ماجد کا

یوں تو دیکھے گئے عالم میں بہت سے فنکار
کوئی ثانی نہیں اللہ کی قسم ماجد کا

نور سے جس کے منور ہے شبستانِ خیال
اللہ اللہ وہ ہے فیضِ اتم ماجد کا

کائناتِ ادب و دین سے آتی ہے صدا
ختم ہوگا نہ کبھی جاہ و حشم ماجد کا

آنکھ وہ آنکھ ہے ماجد کی ہو جس میں تصویر
قلب وہ قلب ہے جس میں کہ ہو غم ماجد کا

کارواں راہِ محبت میں نہ بھٹکا ۔۔ کوئی
رہنما ایسا بنا نقشِ قدم ماجد کا

کیا تعجب کہ ہے اس میں حیاتِ ابدی
آؤ کچھ دیر کریں تذکرہ ہم ماجد کا

واقفِ منزلِ مقصود بنا ۔۔۔ ہر کوئی
کچھ نہیں ملک پہ احسان یہ کم ماجد کا

جب اٹھا تو اٹھا ظلم و تشدد کے خلاف
ایک تلوار سے بڑھ کر ہے قلم ماجد کا
ہر طرف علم و ادب کی ہیں منوّر کرنیں
"بقعۂ نور" منور ہے حرم ماجد کا

مولانا عبدالماجد دریابادی

از شرر بسوانی

کشور علم کی اک قدر گراں ہیں یارو
اہل فن، اہل قلم، اہل زباں ہیں یارو
ان کے ہی دم سے صحافت کا بھرم قائم ہے
عہد حاضر کے وہ تابندہ نشاں ہیں یارو
ہم نے خوب ان کو بہ عنوان خرد دیکھا ہے
شہر منطق میں سیاست کی دوکاں ہیں یارو
اپنا حکمت کو کیا انجم و ثریا سے بلند
جیسے اب فلسفہ دانوں کے دھواں ہیں یارو
لکھ دیئے دفتر اظہار حقیقت کیا کیا
اب ایسے محسن مذہب بھی کہاں ہیں یارو
طرز نثاری غالب کے میں قرباں لیکن
وہ بھی اک موجد اسلوب بیاں ہیں یارو
ان کا انداز نگارش ہے شگفتہ اب تک
اس ضعیفی میں بھی وہ جیسے جواں ہیں یارو
کوئی منظر ہو نگاہوں میں کھپا جاتا ہے

وہ بہ ہر رنگ محاکات کی جاں ہیں یارو
آج انھیں سارا جہاں صبح یقیں کہتا ہے
پھر بھی وہ اپنی نگاہوں میں گماں ہیں یارو
ان کا دل آئینۂ صدق و صفا لگتا ہے
وہ حقیقت میں حقیقت کی زباں ہیں یارو
ہم انھیں مرد حق آگاہ بجا کہتے ہیں
لاکھ وہ معترف حسن بتاں ہیں یارو
ملک میں سیکڑوں ارباب ادب ہیں لیکن
کتنے پہنچے ہیں وہاں تک وہ جہاں ہیں یارو
جب کبھی ان سے تو پایا ہے کسی نے فن میں
سب قدح خوار ہیں وہ پیر مغاں ہیں یارو

مطلع علم و ادب پر انھیں دیکھو تو سہی
ہو بہو صورت خورشید جہاں ہیں یارو

خراجِ عقیدت۔ بعد ممات

منجانب شعرائے کرام

خراجِ عقیدت (بعد ممات)

بیاد مولانا عبد الماجد دریابادی

پاک دل مرد باصفا نہ رہا — ماجد عالی مرتبہ نہ رہا
جو اٹھا تھا زخاک دریاباد — وہ در روشنی فزا نہ رہا
ہے بجا جس قدر لہو روئیں — عاشق دین مصطفیٰ نہ رہا
کیوں نہ نظروں میں ہو جہاں تاریک — علم کا شمس بازغہ نہ رہا
سالقہ برگزیدہ لوگوں میں — تھا یہی ایک مابقا نہ رہا
اس کی ذکر و تفکر انوکھی تھی — راہ حق کا یہ رہنما نہ رہا
صاحب صدق چل بسا ہیہات — سچی باتوں کا سلسلہ نہ رہا
جس نے کھولے رموز قرآنی — ہائے وہ صاحب ذکا نہ رہا
دین کا فلسفہ کا و دانش کا — اس پہ نکتہ کوئی چھپا نہ رہا
کون سمجھائے گا نکات حیات — نکتہ آموز نکتہ زا نہ رہا
ذات تھی جس کی مخزن اوصاف — ایسا بے مثل نابغہ نہ رہا
اس نے بخشا وقار اردو کو — وہ ادیب حق آشنا نہ رہا
اصل میں تھا جو نازش انشا — وہ قلم کار خوش ادا نہ رہا
جو صحافت کا مرد میداں تھا — وہ صحافی باوفا نہ رہا
جس کو ہندوں کی بہتری تھی عزیز — حیف وہ بندۂ خدا نہ رہا
رخیہ گویے آج فقد سخن — ناقد قدر آشنا نہ رہا

سونی سونی ہے بزمِ علم و ادب — موجدِ طرزِ دل ربا نہ رہا
موت عالم ہی موت عالَم ہے — شک نہیں اس میں اب زمانہ رہا
جب سے دیکھی ہے نثر ماجد کی — نظمِ منشا میں بھی مزا نہ رہا
شوقِ قربِ حبیب کے صدقے — موت سے یہ کبھی خفا نہ رہا

اے غفور الرحیم ربِ علیٰ
اس پہ رکھ اپنے فضل کا سایہ

(دعاگو)

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا

صدر شعبۂ اردو

ناگپور یونیورسٹی ناگپور۔

نذر ماجد

از فداء المصطفیٰ فدوی ناگپور

قافلہ تھا راستے میں اور رہبر کھو گیا ۔ جس کو دنیا کی ضرورت تھی وہ خادر کھو گیا
علم و فن کے موتیوں کو ڈھونڈتا تھا جسکا شغل بحر علم و آگہی کا وہ شناور کھو گیا
رشک شمشاد و صنوبر جس کی قامت کا شکوہ گلشن ہندوستاں کا وہ قد آور کھو گیا
فلسفہ ۔ سائنس ۔ ادب ۔ مذہب کا جامع باکمال خوبیاں پوری نہ ہو پائیں اجاگر کھو گیا

! خدا ماجد ارسطو تھا جو اپنے دور کا
وہ مسیحا و حکیم کیمیا گر کھو گیا

قطعہ تاریخ وفات

تفسیر کلام پاک میں تھے مشہور اس فن میں ہوئے تھے وہ من اللہ مامور
ماجد تھے ادب اور صحافت کے امام تاریخ وفات بشیخ دیں ہے مستور

تاریخ وفات

(۱) مفسر آیات خدا (۲) عاشق صادق مفسر قرآن

۱۳۹۷ھ ۱۳۹۶ھ

(۳) مفسر قرآن فرید عصر بود (۴) سلطان دراست مولانا عبد الماجد دریابادی

از محمد علی صالحنوی اورنگ آباد

تاریخ رحلت بے ہنگام

۱۹۷۷

محب اسلام حضرت عبدالماجد دریا بادی

۱۹۷۷

عالم دین مفسر قرآں
اپنے خالق سے جا ملا آخر
بے کم و بیش ہے یہی تاریخ

۳۷۸

مرد حق محرم رموز حیات
چھوڑ کر یہ جہان مکروہات
پاک دل، پاک ذات، پاک صفات

۱۷۷۵

۳۷۸

۱۳۹۷ھ

۔ از مغیث الدین فریدی ۔

تاریخ وفات

از ارشد مجیدی صاحب (جے پور)

(۱) رحمت داور ۔ مفسر قرآن عبدالماجد دریابادی

۱۹۷۷ء

(۲) فخر الفضلاء عبدالماجد

۱۹۷۷ء

نوحۂ غم

از محمد تقی شیدا دریابادی

آج پروانوں کی غمی دیکھو — شمع محفل کی بجھ گئی دیکھو
آگ دل میں ہے اک لگی دیکھو — اور آنکھوں میں یہ نمی دیکھو
کہکشاں بھی ہے غم میں افسردہ — پھیکی پھیکی سی ہے روشنی دیکھو
شبنم و گل چمن میں ہیں گریاں — رو رہی ہے کلی کلی دیکھو
غم ہی غم میں ہے غرق دریاباد — اک تلاطم گلی گلی دیکھو
سچی باتیں بہت پڑھیں اس کی — ایسے صادق کا صدق بھی دیکھو
ہیں پریشاں صحافت گیسو — زلف اردو کی برہمی دیکھو
دیکھنا ہیں جو علم کے جوہر — اس کی تفسیر ماجدی دیکھو
خلد کی بھینی بھینی خوشبو سے — قبر ماجد بسی بسی دیکھو
اب سے واصل ہوا۔ ہوا داخل — یعنی جنت میں جنتی دیکھو

دامن صبر تھام لو شیدا
جو دکھائے خدا وہی دیکھو

واسئے سانحۂ ارتحال

۱۳۔۔۔۔۔۹۷ھ

مولانا عبدالماجد دریابادی

از مولانا عبدالمعارف شاد اعظمی

گلشن علم و فن ہوا برباد
ہوگیا گل چراغ دریاباد

زندہ دل زندہ دار تھے ماجد
دار عقبا میں ہوگئے آباد

تھے یہ بی۔ اے مگر بجان طلب
عربی و فارسی کے تھے استاد

تھے فہیم و ذکی و متواضع
دل میں ان کے بسا تھا خلد آباد

تھی عجیب و غریب یہ ہستی
تھے یہ نقاد و جامع الضداد

صدق کے وہ مدیر دانشور،
دار فانی سے ہوگئے آزاد،،

سن یہ ستانوے ڈیڑھ سو [۹۷][۱۳]
ہم سبھی کو اب ہوگیا ہے یاد

ازدل شاد عیسوی سن ہے
شغف تاریخ دیکھ لو اے شاد

عبدالماجد جوار رحمت میں
شاد لکھ دو کہ ہوگئے آباد

تاریخ وفات

ان کا مشکل ہے ملنا اب زمانے میں بدل
خامۂ عالم کی ہے تاریخ رحلت برمحل

عبدالماجد آہ! تھے جو پیکر علم و عمل
مَوْتُ العالِم مَوْتُ العالَم ہے یہ ضرب المثل

۱۶۱ + ۱۲۳۶

۱۳۹۶ھ

مبشر صدیقی انبالوی

تاریخ وفات

تاریخ مرگ بندۂ محبوب عبدالماجد دریابادی

سنہ ۱۹۷۷ء

از نتیجۂ فکر دل حزیں صابر سنبھلی: ایم۔ اے۔

سنہ ۱۳۹۷ھ

تاریخ وفات

از صابر سنبھلی ایم۔ اے

چوں شنیدم کہ عبد ماجد مرد
قلب غمگیں مزید شد غم نوش
مرجع تشنگان علم نماند
علم و حکمت شد نہ خانہ بدوش
می کند گریہ خاک دریاباد
وائے افسوس خالی شد آغوش
غمکش و غمزدہ صحافت شد
دست بر سر زند بہ شور و خروش
آں را صدق جدید . . . می جوید
کہ کجا است محسنم روپوش
فکر تاریخ فوت می کردم
یک بیک آمد ایں نوائے سروش
صابرا بہر سال مرگ بگو
شمع علم و یقین شد خاموش

۱۹۷۷

ایک تاریخ وفات

از حاجی نثار احمد فاروقی خیرآبادی

عارف اس صاحب تفسیر کا تم سال وفات
کر رفعنا لک ذکرک سر تربت لکھ دو

سنہ ۱۳۹۷ھ

حرفِ آخر

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمۂ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

کتابیات

تاریخ ادب اردو ۔ انسرام بابو سکسینہ ترجمہ محمد عسکری ۔ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۴۱ء

تاریخ داستان اردو ۔ حامد حسن قادری ۔ آگرہ اخبار پریس سنہ ۱۹۴۱ء

مختصر تاریخ ادب اردو ۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین انڈین پریس الہ آباد سنہ ۱۹۵۶ء

جہان بین ۔ اثر لکھنوی ۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۵۵ء

تنقید اور عملی تنقید ۔ سید احتشام حسین آزاد کتاب گھر دہلی سنہ ۱۹۵۲ء

اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ (حصہ دوم) ۔ عبدالشکور

ادبی نقوش ۔ شاہ معین الدین احمد ندوی ۔

اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں ۔ عبدالماجد دریابادی ۔

ادبی تنقید ۔ ڈاکٹر محمد حسن ۔

ادب کیا ہے ؟ ۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۔

آئینۂ نثر اردو ۔ سعادت علی صدیقی

اردو ادب میں طنز و مزاح ۔ غلام احمد فرقت

تعاون تاریخ اردو ۔ ڈاکٹر شجاعت سندیلوی

تنقید و تحلیل ۔ مسیح الحسن نونہری

ذوق و جستجو ۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

سرمایۂ زبان اردو ۔ جلال لکھنوی

شبلی نعمانی ۔ انوارالحسن صدیقی

انشائیات ۔ سید عابد حسین

تلاش و تاثیر ۔ عبدالقوی دسنوی
تجزیہ و تجزیہ ۔ سلام سندیلوی
اردو کی ادبی تاریخ ۔ پروفیسر عبدالقادر سروری
ادبی تاثرات ۔ شجاعت علی سندیلوی
ادبی اشارے ۔ سلام سندیلوی
اشخاص و افکار ۔ ضیاءالحسن فاروقی
اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء ۔ الطاف فاطمہ
آپ سے ملیے ۔ علی جواد زیدی
اردو میں تنقید نگاری ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی
اردو ادب کی ایک صدی ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ
اردو انشائیہ ۔ صفی مرتضیٰ
تنقید سے تحقیق تک ۔ ڈاکٹر عنوان چشتی
تحریر و تنقید ۔ ڈاکٹر طیب انصاری
تنقیدی نقوش ۔ عبدالقیوم
انتقاد ۔ اکبر حیدری
خطوط مشاہیر ۔ عبدالماجد دریابادی
شخصیات و انتقادات مجموعہ ترجمہ شائع کیا ۔ جنید احمد
صنف انشائیہ و انشائیے ۔ محمد حسنین
فن سوانح نگاری ۔ حمیداللہ شاہین
لکھنو کی لسانی خدمات ۔ حامداللہ ندوی
مضامین لسان الصدق ۔ عبدالقوی دسنوی
اردو نثر نگار ۔ صفی مرتضیٰ

اخبار و رسائل

"نگار" لکھنؤ۔
"آج کل" دہلی (غبار کارواں)
"صدق جدید" لکھنؤ مختلف فائلیں ۱۹۳۰ء
"ہماری زبان" علی گڑھ
"نقوش" لاہور۔ شخصیات نمبر ۱۹۵۵ء
"نقوش" لاہور۔ ادب عالیہ نمبر
"نقوش" لاہور۔ مکاتیب نمبر جلد دوم

"شاعر" بمبئی۔

مقالات ماجد	از عبدالماجد دریابادی	تاج آفس بمبئی
انشائے ماجد	" " "	" " "
سفر حجاز۔	" " "	دارالمصنفین
فیہ ما فیہ۔	" " "	"
فلسفۂ جذبات۔	" " "	انجمن ترقی اردو
فلسفۂ اجتماع۔	" " "	" " "
تاریخ اخلاق یورپ	" " "	" " "
تاریخ تمدن۔	" " "	"
مکالمات برکلے۔	" "	دارالمصنفین
مضامین عبدالماجد	" " "	ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد
اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں	" " "	ادارہ فروغ اردو
مکاتیب اکبر	" " "	" " "
مکتوبات سلیمانی حصہ اول و دوم،	" " "	صدق جدید بک ایجنسی
تفسیر ماجدی (انگریزی)	" " "	تاج کمپنی کراچی و لاہور
تفسیر ماجدی (اردو)	" " "	تاج کمپنی " "
جغرافیہ قرآنی یا ارض القرآن،	" " "	صدق جدید بک ایجنسی
حیوانات قرآنی یا الحیوانات فی القرآن،	" " "	" " "
خطبات ماجدی۔	" " "	" " "
حکیم الامت۔	" " "	دارالمصنفین اعظم گڑھ
محمد علی۔	" " "	ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد
گردش کی سیاحی۔	" " "	" " "
صابر رسول۔	" " "	" " "
یتیم کی جیت۔	" " "	" " "

یتیم کا راج — از عبدالماجد دریابادی — ادارہ اشاعت ام

تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام " " " "

تمدن اسلام کی کہانی۔ — از مولانا عبدالماجد دریابادی " "

تحفۂ خسروی۔ " " " اودھ بک ایجا

فرائض والدین۔ " " " نول کشور بکڈپو لکھ

قصص و مسائل۔ " " " نفیس اکاڈمی حیدر

نورانی جہیز۔ - - - مرتبہ محی الدین منیری